بسم الله الرحمن الرحیم

فَمَنْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ
لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا
كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ ۚ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ
عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٢٥﴾ وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ
مُسْتَقِيْمًا ۚ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ﴿١٢٦﴾

ترجمہ:

پس خدا جسے ہدایت دینا چاہتا ہے اس کے سینے کو اسلام کے لئے کشادہ کر دیتا ہے اور جس کو گمراہی میں چھوڑنا چاہتا ہے اس کے سینے کو ایسا تنگ اور دشوار کر دیتا ہے جیسے آسمان کی طرف بلند ہو رہا ہو، وہ اسی طرح بے ایمانوں پر ان کی کثافت کو مسلط کر دیتا ہے اور یہی تمہارے پروردگار کا سیدھا راستہ ہے۔ ہم نے نصیحت حاصل کرنے والوں کے لئے آیات کو مفصل طور پر بیان کر دیا ہے۔

(سورہ انعام: آیات ۱۲۵، ۱۲۶)

اسلامی علوم و معارف اور علمی و ثقافتی افکار و عقائد کا ترجمان
شمارہ: ۲۳۹-۲۴۰-۲۴۱/ ستمبر ۲۰۱۷ء تا مئی ۲۰۱۸ء

ایران کلچر ہاؤس، ۱۸۔ تلک مارگ، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۱
فون: ۳۴، ۲۳۳۸۳۲۳۲، ۳۳، فیکس: ۲۳۳۸۷۵۴۷
ichdelhi@gmail.com
http://newdelhi.icro.ir

شمارہ: ۲۳۹-۲۴۰-۲۴۱/ستمبر ۲۰۱۷ء تا مئی ۲۰۱۸

مشاورین علمی:

پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین، پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر سید علی محمد نقوی

چیف ایڈیٹر	:	ڈاکٹر علی دہگاہی
ایڈیٹر	:	پروفیسر سید اختر مہدی رضوی
جوائنٹ ایڈیٹر	:	خان محمد صادق جونپوری
صفحہ آرائی	:	قاری محمد یسٰین
تزئین جلد	:	عائشہ فوزیہ
ناظر اشاعت	:	حارث منصور
پریس	:	الفاآرٹ، نویڈا، یو۔پی۔

ISSN: 2349 – 0950

صرف غیر مطبوعہ مقالہ ہی ارسال فرمائیں۔
اگر ممکن ہو تو مقالہ، بذریعہ ای میل ichdelhi@gmail.com ارسال فرمائیں۔
مقالہ، ایران کلچر ہاؤس کے پتہ پر پوسٹ بھی کرسکتے ہیں۔
مقالہ کی اشاعت کے لئے ایڈیٹوریل بورڈ کا فیصلہ حتمی ہوگا۔
مقالہ نگار افراد کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

فہرست

اداریہ		۱
دینی معرفت میں عقل کا کردار	مؤلف: حامد علی اکبر زادہ مترجم: مولانا ڈاکٹر گلزار احمد خان	۳
ایمان اور اخلاقی فضائل	مؤلف: نعمت اللہ بدخشان مترجم: شبیہ عباس خان	۱۸
قرآنی تعلیمات میں دینداری کے مختلف پہلو	مؤلف: محمد باقر آخوندی مترجم: بنت زینب خان	۴۷
دعا کی زبان و انداز بیان کا تجزیہ	مؤلف: ڈاکٹر محمد جواد سلمانپور مترجم: مولانا مقداد حیدر روحانی	۶۵
دعاؤں میں توحید کی تجلی	مؤلف: محمد شریفانی مترجم: مولانا مقداد حیدر روحانی	۸۹
صحیفہ سجادیہ میں معرفت انسان	مؤلف: عبدالحمید فرزانہ مترجم: مولانا شیخ ممتاز علی	۱۳۵
سیرہ نبوی صحیفہ سجادیہ کی روشنی میں	مؤلف: سید علی سجادی زادہ مترجم: شبیہ عباس خان	۱۵۹

قیام امام حسینؑ کے اہداف و محرکات	مؤلف: بابک ہادیان حیدری مترجم: شبیہ عباس خان	۱۸۰
امام رضاؑ کا تذکرہ صوفیا کی کتابوں میں	مؤلف: منصور داداش نژاد مترجم: مولانا ڈاکٹر گلزار احمد خان	۲۰۴
انقلاب اسلامی ایران میں سیاسی اسلام کا مفہوم	مؤلف: محمد صادق جمشید راد مترجم: مولانا شیخ ممتاز علی	۲۱۹
قرآن میں صالح خواتین	مؤلف: ڈاکٹر محمد مہدی مرادی خلج مترجم: مولانا ڈاکٹر گلزار احمد خان	۲۳۸

اداریہ

آج کے ترقی یافتہ دور میں انسان نے متعدد تکنیکی علوم میں ترقی کے ذریعہ اپنی مادی دنیا کو سجانے اور زینت دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ان سب کے باوجود اس کی روح بے قرار اور اس کا باطن متلاطم ہے۔ گویا اس کی زندگی کا کوئی اہم عنصر مفقود ہے جس کے بغیر اس کی زندگی ادھوری ہے۔اس عنصر کا نام، دین ہے۔ دین ہمیشہ سے انسانی زندگی میں اہم کردار ادا کرتا رہا ہے اور دین ہی وہ عنصر ہے جو انسان کو روحانی و جسمانی سکون وآرام فراہم کرتا ہے۔

بعض محققین کا ماننا ہے کہ آج کا دور، دین کی طرف بازگشت کا دور ہے کیونکہ دوسرے مروجہ رجحانات آج کے انسان کی مادی و معنوی ضرورتوں کو پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ دین ہی وہ عنصر ہے جو انسان کو دنیا وآخرت کی فلاح و بہبود کی راہ پر گامزن کر سکتا ہے۔ عقل انسان کی فطری طاقت ہے جو تشخیص، فہم و تمیز کا سب سے اہم معیار ہے۔ دینی معارف کی شناخت میں عقل کا کیا کردار ہے،اس سلسلہ میں مختلف نظریات پائے جاتے ہیں۔اسلامی نقطہ نظر سے دینی معارف کی شناخت میں عقل کی حجیت ثابت ہے اور مختلف دینی مسائل کی شناخت میں عقل؛ میزان، مصباح یا ایک مستقل منبع کے عنوان سے اپنی کارکردگی کو ظاہر کرتی ہے جس پر فصلنامہ کے "دینی معرفت میں عقل کا کردار" نامی مقالہ میں سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔

دینی معارف کی شناخت کے بعد ایمان کا مرحلہ آتا ہے اور اس کے حصول کے لئے بعض سلبی اور ایجابی عوامل کی موجودگی ناگزیر ہے۔ان باتوں کا ہم نے "ایمان اور اخلاقی فضائل" مقالہ میں تجزیہ کیا ہے۔ قرآن مجید، دینی معرفت اور استنباط احکام کا ایک اہم منبع ہے لہٰذا ہم نے دینداری کے مختلف پہلوؤں کے تجزیہ کے لئے اس کتاب آسمانی کا رخ کیا اور "قرآنی تعلیمات میں دینداری کے مختلف پہلو" مقالہ میں پیش کیا ہے۔

انسان ہمیشہ سے ہی اپنے آرام وبقا کے لئے لازوال قدرت کی پناہ لینے کو ضروری سمجھتا رہا ہے اسی وجہ سے تاریخ کبھی بھی مبدا عالم پر توجہ اور بارگاہ عالیہ خداوندی میں دعا سے خالی نہیں رہی ہے۔ دینی معارف میں بھی دعا کو بہت اہمیت دی گئی ہے اور قرآنی آیات و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا ایک فعل حسنہ

ہے اور اللہ تعالی بندہ کے اس فعل کو بہت پسند کرتا ہے۔ معصومین علیہم السلام سے منقول دعاؤں خاص کر امام سجادؑ کی صحیفہ سجادیہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ معصومین علیہم السلام کس انداز میں بارگاہ خالق متعال میں دست تضرع و نیاز بلند کرتے تھے۔ ہم نے "دعا کی زبان و انداز بیان کا تجزیہ" نامی مقالہ میں دعا کی افادیت اور حقیقی و مجازی دعا کے موضوع پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اگلے مقالہ میں صحیفہ سجادیہ کی دعاؤں میں توحید کی تجلی کو موضوع گفتگو قرار دیا گیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ امام سجادؑ کس طرح اپنے خالق کی بارگاہ میں راز و نیاز کرتے تھے اور اس کی وحدانیت کا اقرار کرتے تھے۔

انسان کی خود شناسی ایک اہم موضوع ہے، اگر انسان خود کو پہچان لے گا تو خالق کائنات اور اس دنیا کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ امام سجادؑ نے اپنی دعاؤں میں انسانی معرفت کے بارے میں کس انداز سے گفتگو کی ہے، اس موضوع کو "صحیفہ سجادیہ میں معرفت انسان" نامی مقالہ میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

فصلنامہ راہ اسلام کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ معارف اسلامی اور دینی تعلیمات کو بہتر سے بہتر انداز میں قارئین کے سامنے پیش کرے تاکہ ہم سب مل کر اسلامی تعلیمات کے سایہ میں ایک باوقار زندگی اور اچھے معاشرہ کی تعمیر کر سکیں۔ امید ہے یہ اس راہ میں ایک مثبت اور تعمیری قدم ہوگا۔

ادارہ

دین کی معرفت میں عقل کا کردار

مؤلف: حامد علی اکبر زادہ، محمد محمد رضائی
مترجم: مولانا ڈاکٹر گلزار احمد خان

دینی معارف کی شناخت میں عقل کے کردار پر ہمیشہ سے بحث و گفتگو ہوتی رہی ہے۔ کچھ لوگوں کا ماننا ہے کہ دینی معارف کی شناخت میں عقل کا کوئی کردار نہیں ہے لیکن دوسرے لوگ اس سلسلے میں عقل کی اہمیت کے قائل ہیں۔ اس مقالہ میں شیعی نقطہ نظر سے عقل و دین کے مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے اور معارف دینی کی شناخت میں عقل کی حجیت کو ثابت کیا گیا ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ عقل تین طریقہ سے اس سلسلہ میں مدد کرتی ہے: میزان، وسیلہ اور منبع شناخت۔ اس ضمن میں عقل کچھ باتوں کو سمجھنے سے قاصر ہے جیسے ذات خداوند، بعض اخروی امور جیسے معاد جسمانی وغیرہ۔

دینی مباحث میں ہمیشہ سے دینی معارف کی شناخت میں عقل کے کردار اور اس کی کمیوں کے بارے گفتگو ہوتی رہی ہے ۔ عقل انسان کی فطری طاقت ہے جو تشخیص اور فہم و تمیز کا سب سے اہم وسیلہ ومعیار ہے اور انسان عقل کے ذریعہ ہی چھوٹے چھوٹے مسائل کا ادراک کرتا ہے۔ دوسری طرف معارف دین کی شناخت ہمیشہ سے انسانوں کے لئے اہمیت کی حامل رہی ہے جس کے نتیجہ میں عقل کے کردار پر بھی گفتگو ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں مختلف نقطہ نظر پائے جاتے ہیں جس کے بارے میں ہم یہاں بات کریں گے۔

عیسائیت میں عقل کے سلسلے میں دو نقطہ نظر پایا جاتا ہے۔ پہلا نظریہ عقل گرائی کے نام سے مشہور ہے جس کا ماننا ہے کہ ایمان و عقیدہ عقل سے میل کھاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ اس نظریہ

کے مطابق دینی عقائد کو عقلی لحاظ سے قابل قبول ہونا چاہئے[۱]۔ اس جماعت کا ماننا ہے کہ عقل دینی مفاہیم کو ثابت کر سکتی ہے۔

مغربی دنیا میں رائج دوسرے نظریہ کو ایمان گرائی کے نام سے جانا جاتا ہے جس کا ماننا ہے کہ دینی اعتقادات کو عقل کے معیار پر نہیں پرکھنا چاہئے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر ہم وجود خداوند یا اس کے نامحدود کمال اور حکمت و علم و قدرت پر ایمان رکھتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ ہم نے بغیر کسی قرینہ یا استدلال کے اسے قبول کر لیا ہے۔ یعنی ایمان کو اپنے اثبات کے لئے عقل کی ضرورت نہیں ہے اور دینی معاملات میں مقولات عقلی کا استعمال غلط ہے۔

اسلامی دنیا میں بھی اس موضوع پر کافی گفتگو ہوئی ہے ۔ اہل حدیث کا ماننا ہے کہ مسائل دین میں عقلی استدلال حرام ہے اور دینی معارف کی شناخت میں عقل کا استعمال منع ہے۔ یہ لوگ نہ صرف یہ کہ دینی معارف کی شناخت میں عقل کو ایک مستقل منبع نہیں مانتے بلکہ وہ لوگ آیات قرآنی و احادیث کے سلسلہ میں کسی بھی عقلی گفتگو کے مخالف ہیں[۲]۔ دوسری طرف معتزلہ افراطی طور پر عقل گرا تھے اور اثبات عقائد اور دینی معارف کی شناخت میں صرف و صرف عقل کو معتبر مانتے تھے۔ یہ لوگ عقل کو وحی پر ترجیح دیتے تھے اور بر بنائے مجبوری آیات و روایات کی ظاہری توجیہ کرتے تھے تاکہ اپنے عقلی نقطہ نظر کو ثابت کر سکیں۔ اشاعرہ اہل حدیث اور معتزلہ کے بیچ کا راستہ نکالا لیکن اس گروہ کو بھی کوئی کامیابی نہیں ملی اور انہوں نے بڑی غلطیاں کیں۔ اس ضمن شیعہ کا اپنا نقطہ نظر ہے جس پر گفتگو مقصود ہے۔

مفہوم عقل

لغوی طور پر عقل کے کئی معنی بیان کئے گئے ہیں۔ لفظ عقل عقال سے ماخوذ ہے اور عقال اس رسی کو کہتے تھے جس سے اونٹ کے پیر کو باندھتے ہیں اور اسے چلنے سے روکتے ہیں اور اسی وجہ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ عقل ایک ایسی طاقت ہے جو انسان کو راہ راست سے ہٹنے نہیں دیتی ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ عقل

۱۔ پترسون، مایکل و دیگران، عقل و اعتقادات دینی، ص ۴۷

۲۔ برنجکار، رضا، آشنایی با فرق و مذاہب اسلامی، ص ۱۲۱

روکنے، نہی، خودداری اور حبس کے معنی میں ہے اور نقیض جہل ہے[۱]۔ لسان العرب کے مطابق عقل وہی قلب ہے اور ایسی طاقت ہے جو امور کو تثبیت کرتی ہے اور انسانوں اور دوسرے جانوروں کے درمیان وجہ تمایز ہے[۲]۔

اصطلاحی طور پر بھی عقل کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں۔ علامہ طباطبائی کذالك یبین الله لکم آیاته لعلکم تعقلون[۳] کے ذیل میں فرماتے ہیں: جس چیز سے انسان ادراک کرتا ہے اسے عقل کہتے ہیں اور یہ منجملہ قوائے انسانی ہے جس کے ذریعہ سے خیر و شر اور حق و باطل کے درمیان تمیز کی جاتی ہے[۴]۔

فلسفیوں نے عقل کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، عقل نظری اور عقل عملی اور یہ دونوں کلیات کو درک کرتے ہیں اور ادراک کا سرچشمہ ہیں لیکن یہ دونوں الگ الگ امور کو درک کرتی ہیں۔ عقل نظری کے ذریعہ اعتقادات کو سمجھا جاتا ہے اور اس کا تعلق فرائض سے نہیں ہے۔ معصومین علیہم السلام سے منقول روایات میں کبھی کبھی عقل نظری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں ارشاد ہوتا ہے: باالعقل استخرج غور الحکمة[۵] لیکن عقل عملی جسے قوہ عاملہ بھی کہتے ہیں ملا صدرا کی تعبیر کے مطابق صناعات انسانیہ کا استنباط کرتی ہے اور افعال کے قبح و حسن کو سمجھتی ہے اور اچھے کام کو انجام دینے اور برے کام کو ترک کرنے کا حکم دیتی ہے[۶]۔ بعض حدیثیں جیسے العقل ما عبد به الرحمن و اکتسب به الجنان اسی عقل کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ مکتب تفکیک کا ماننا ہے کہ عقل ایسا نور ہے جسے اللہ تعالی انسان پر افاضہ

۱۔ جوہری، اسماعیل بن حماد، الصحاح تاج اللغة و صحاح العربیہ، ج ۵، ص ۱۷۶۹؛ فیومی، احمد بن محمد، المصباح المنیر ص ۴۴۲؛ ابن فارس، احمد، معجم مقاییس اللغہ، ج ۴، ص ۶۹

۲۔ ابن منظور، لسان العرب، ج ۹، ص ۲۳۲

۳۔ سورہ بقرہ، آیت ۲۴۲

۴۔ طباطبائی، محمد حسین، المیزان، فی تفسیر القرآن، ج ۲، ص ۲۴۷

۵۔ کلینی، محمد بن یعقوب، الکافی، ج ۳۴، ص ۱

۶۔ صدر الدین شیرازی، محمد بن ابراہیم، العرشیہ، ص ۳۰۴

کرتا ہے[۱]۔ کتاب و سنت میں عقل کو باہری نور، مجرد و بسیط، ظاہر بالذات، مظہر للغیر و غیرہ کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے[۲]۔

عقل کی متعدد تعریفیں بیان کی گئی ہیں لیکن یہاں پر عقل سے ہماری مراد نفس انسانی کی قوت ادراک ہے جو مقدمات بدیہی کے ذریعہ مجہولات کو کشف کر سکتا ہے اور مسائل نظری کو استنباط اور تجزیہ و تحلیل کر سکتا ہے[۳]۔

دینی معارف کی شناخت میں عقل کی حجیت

اسلامی تعلیمات میں ہمیشہ عقل کی حجیت محرز رہی ہے اور دین کی شناخت میں اسے حجت الٰہی شمار کیا جاتا رہا ہے۔ اہل حدیث اور اخباری گروہ کے نزدیک بھی اس نقطہ نظر سے کہ انہوں نے عقل کے ذریعہ اپنے نظریات کو دوسرے نظریات پر ترجیح دی ہے، عملی طور عقل کی حجیت ثابت ہے۔ امام صادقؑ سے منقول ہے کہ یا ھشام ان للہ علی الناس حجتین حجة ظاھرہ و حجة باطنه فاما الظاھرہ الرسل و الانبیاء و الائمه و اما الباطنه فاالعقول[۴]۔ ترجمہ: اے ہشام! لوگوں پر اللہ کی دو حجت ہے۔ ایک حجت ظاہری اور دوسری حجت باطنی۔ ظاہری حجت یعنی انبیاء و مرسلین وائمہ۔ اور باطنی حجت یعنی عقل۔

اس طرح کی روایتیں شیعی متون میں کثرت سے دستیاب ہیں۔ حجیت عقل اس لحاظ سے بھی بدیہی اور ثابت ہے کہ اسے شناخت و تحلیل کا پہلا ذریعہ مانا جاتا ہے اور حجیت نقل (قرآن و حدیث) بھی اسی کے ذریعہ سے ثابت ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ اگر شناخت کے سلسلہ میں عقل کا اعتبار ساقط ہو جائے تو پھر انسان کے ذریعہ درک کی گئی کسی بھی چیز پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اصول دین میں برہان عقلی رتبہ کے لحاظ سے نقل سے پہلے ہے کیونکہ یہ عقل ہے جو بتاتی ہے کہ انسان کو دین کی ضرورت ہے اور یہ دین وحی کے ذریعہ انسان پر نازل ہوتا ہے۔ استنباط احکام کے سلسلہ میں عقل ہمیشہ نقل کے ساتھ

۱۔ مروارید، حسنعلی، تنبیہات حول المبداء والمعاد، ص ۲۶

۲۔ اصفہانی، میرزا مہدی، ابواب الہدی، ص ۱۴۱

۳۔ مطہری، مرتضی، مجموعہ آثار، ج ۱۳، ص ۳۵۸

۴۔ الکافی، ج ۱، ص ۱۶

ساتھ رہتی ہے اور احکام فقہی کے استنباط کا ایک منبع و ذریعہ ہے جو تلازم بین احکام کو تشخیص دیتے ہوئے نئے احکام جاری کرتی ہے۔اصول فقہ میں بھی بہت سے عقلی قواعد موجود ہیں۔ بہر حال عقل ہمیشہ حجت ہے بلکہ معارف دین کی شناخت میں سب سے پہلی حجت عقل ہی ہے اور دوسری حجتوں کا اعتبار عقل کے ذریعہ ہی طے ہوتا ہے۔ عقل کی حجیت خود عقل کے ذریعہ طے ہوتی ہے اور شرع بھی اس کی تائید کرتی ہے اور روایات وآیات قرآنی میں اسے ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

امام صادقؑ سے منقول ہے: حجة الله علی العباد النبی و الحجة فیما بین العباد و بین الله العقل، پیغمبر بندوں پر اللہ کی حجت ہیں اور بندہ وخدا کے درمیان عقل حجت ہے[۱]۔

اسی طرح حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ عقل کے ذریعہ خدا کی شناخت محکم و مضبوط ہوتی ہے[۲]۔امام صادقؑ فرماتے ہیں: عقل کے ذریعہ بندہ اچھے اور برے عمل کی تمیز کرتا ہے[۳]۔

قرآن کریم نے عقل کے مختلف مشتقات کا استعمال کیا ہے اور لوگوں کو تعقل وتدبر و تفکر کی دعوت دیتا ہے اور خود بھی بعض دینی معارف کے اثبات کے لئے براہین عقلی سے استفادہ کرتا ہے۔ مثال کے طور پر توحید ذاتی اور خالقیت میں توحید کے اثبات کے لئے یہ آیتیں نازل ہوئیں:

لَو کَانَ فِیهِمَا آلِهةٌ اِلاَّ اللهُ لَفَسَدَتا[۴]،ترجمہ: یاد رکھو اگر زمین وآسمان میں اللہ کے علاوہ اور خدا بھی ہوتے تو زمین وآسمان دونوں برباد ہوجاتے۔

اَم خُلِقُوا مِن غَیرِ شَیءٍ اَم هُمُ الخَالِقُونَ[۵]۔ ترجمہ: کیا یہ بغیر کسی چیز کے از خود پیدا ہوگئے ہیں یا یہ خود ہی پیدا کرنے والے ہیں۔

حضرت علیؑ سے منقول روایات میں بھی اللہ تعالی کے سلسلہ میں بہت سارے عقلی استدلال نظر آتے ہیں۔مثال کے طور:

۱۔ الکافی، ج ۱، ص ۲۹
۲۔ صدوق، محمد بن علی، التوحید، ص ۳۵
۳۔ الکافی، ج ۱، ص ۳۳
۴۔ سورہ انبیاء، آیت ۲۲
۵۔ سورہ طور، آیت ۳۵

من وصفه فقد حده و من حده فقد عده و من عده فقد ابطل ازله[۱]۔

لا یشمل بحد و لا یحسب بعد و انما تحد الادوات انفسها و تشیر الالات الی نظائرها[۲]۔

دینی معرفت میں عقل کا کردار

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ دینی معرفت میں عقل کا کیا کردار ہے۔ کیا دینی معارف کی شناخت میں عقل ایک مستقل منبع ہے یا صرف شناخت کے لئے ایک وسیلہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ کیا عقل حکم الٰہی کو جاری کرتی ہے یا ایک منبع اور وسیلہ کی حیثیت سے احکام و معارف الٰہی سے پردہ کشائی کرتی ہے۔اس نکتہ کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے کہ قرآن و سنت کی طرح عقل بھی احکام الٰہی کو بیان کرتی ہے اور عقل بہ تنہائی احکام الٰہی کو صادر نہیں کرتی۔اصل تشریع کرنے والا اللہ تعالی ہے اور عقل و قرآن وسنت صرف احکام کو بیان کرنے والے ہیں اور وہ خود دینی احکام کی تشریع نہیں کرتے ہیں۔

دینی معارف کی شناخت میں عقل کیا کردار نبھاتی ہے، اس سلسلہ میں علما میں ہمیشہ اختلاف نظر رہا ہے۔ اہل حدیث اور اخباری گروہ شناخت دین میں عقل کے کردار کے منکر ہیں۔اس کے برخلاف کچھ لوگ عقل کو ایک منبع اور وسیلہ کے طور پر مانتے ہیں جیسے شیعہ اصولی، معتزلہ اور فلاسفہ۔

کچھ شیعہ معاصرین کا ماننا ہے کہ فلاسفہ نے جس عقل کا ذکر کیا ہے، دین کی شناخت میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ برہانی اور منطقی قیاس جو کہ عقلی استدلال کے طریقے ہیں، ان کا اصول دین اور احکام خدا کی شناخت میں کوئی جگہ نہیں ہے اور انسان کی عقل حجت ظاہری یعنی رسول الٰہی کے بغیر مکمل نہیں ہوتی ہے[۳]۔ یہ گروہ نظریہ تفکیک کے ماننے والے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ عقل اگر شرع کے ساتھ ہے اور شرع اس کی تائید کرتی ہے تبھی شناخت دین میں عقل کے کردار کو مانا جاسکتا ہے۔ اس مکتب کے کسی بزرگ نے ایک جگہ تحریر کیا ہے کہ اصول وفروع میں قیاس، فعل قبیح اور رجس من عمل الشیطان ہے کیونکہ انسان اس قیاس کی خطا سے محفوظ نہیں ہے اور قیاس کو برہان کہنا در حقیقت ضلالت، جہالت، مکر و شیطنت ہے[۴]۔

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۵۲

۲۔ ایضاً، خطبہ ۲۲۸

۳۔ ابواب الہدی، ص ۷۰

۴۔ ایضاً، ص ۶۵

جیسا کہ پہلے بھی بتایا گیا، عقل تین طریقوں سے دینی معارف کی شناخت میں مدد کرتی ہے:

۱. عقل میزان ہے

۲. عقل مصباح ہے

۳. عقل ایک مستقل منبع یا مفتاح ہے

ہماری نظر عقل کا میزان ہونا ہر جگہ قابل قبول نہیں ہے اور اسے ایک قاعدہ کلیہ نہیں بنایا جاسکتا ہے۔ عقل کا مصباح ہونا وہی عقل کا ابزار یا وسیلہ ہونا ہے جو ہماری نظر میں قابل قبول ہے۔ اور عقل کا ایک مستقل منبع ہونا بھی قابل قبول ہے۔ مقالہ کے اگلے حصہ ہم ان تینوں موضوعات پر گفتگو کریں گے:

۱. عقل دین کی شناخت میں میزان ہے:

اس نوع نگاہ کو معتزلہ سے منسوب کیا جاسکتا ہے کیونکہ معتزلہ افراطی طور پر اس بات کے قائل تھے کہ شناخت دین کے لئے عقل ایک میزان ہے اور جو موضوع عقلی طور پر قابل توجیہ ہے وہ معارف دین میں شامل ہے اور جو موضوع عقلی طور قابل وضاحت نہیں ہے وہ دین کے دایرہ سے خارج ہے۔

بے شک یہ نگاہ افراطی اور نقد کے قابل ہے۔ اس نقطہ نظر کے مطابق وہ موضوعات جو عقل کے موافق ہیں اور ان کی درستی کو عقل کے ذریعہ ثابت کیا جاسکتا ہے وہ دین میں شامل ہیں لیکن اگر کوئی موضوع عقل سے سازگار نہیں ہے یا عقل اس کو استدلالی طور پر تائید نہ کرسکے تو وہ دین سے خارج ہے۔ اس نظریہ کی بنیاد پر خاتمیت پیامبر اسلامؐ کے مسئلہ کی غلط طریقہ سے توجیہ کی جاتی ہے۔ بہت سے دینی حقائق براہین عقلی کے ذریعہ ثابت نہیں ہوتے ہیں اور یہ موضوعات عقل سے بالاتر ہیں اور عقل ان تک نہیں پہنچ سکتی ہے البتہ ایسے مواقع پر عقل سلیم انسان کو قول مخبر صادق کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ لہٰذا عقل کو ہمیشہ شناخت دین میں معیار و میزان نہیں بنایا جاسکتا ہے۔ دوسری طرف اس نکتہ کی طرف توجہ بھی ضروری ہے کہ معارف دین کو بدیہیات عقلی کے خلاف نہیں ہونا چاہئے اور اس معنی میں عقل معیار ہے لیکن عقل سے بالاتر موضوعات کو عقل کے پیمانہ پر نہیں ناپا جاسکتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس نکتہ کو سمجھنا کہ کوئی مسئلہ عقل سے بالاتر ہے، یہ بھی عقل ہی کا کام ہے۔ عقل یہ سمجھ سکتی ہے کہ کسی مسئلہ کو وہ تجزیہ و تحلیل کرسکتی ہے یا نہیں۔ اگر مسئلہ عقل سے بالاتر ہوگا تو عقل انسان کو نقل یا یقین و علم کے دوسرے راستہ کی طرف ہدایت کرے گی۔

بہ طور خلاصہ یہ کہا جائے کہ عقل کے میزان ہونے کو ایک کلیہ کے طور پر قبول نہیں کیا جاسکتا ہے بلکہ بعض مسائل میں عقل میزان ہو سکتی ہے لیکن دوسرے مسائل میں ممکن ہے اس میں یہ صلاحیت نہ پائی جاتی ہو۔ علم عرفان میں ہم دیکھتے ہیں کہ بعض موارد میں عقل میزان بن جاتی ہے یعنی کشف و شہود عرفانی (خاص کر مکتب ابن عربی میں) کو ایک عقلانی لباس میں اور قابل توجیہ ہونا چاہئے۔ عبدالرزاق کاشانی اپنی کتاب تاویلات کے مقدمہ میں تصریح کرتے ہیں کہ جو کچھ ہم نے بعض آیتوں کی تاویل میں بیان کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اس آیت کے معنی کو معین کرنا چاہتے ہیں کہ اس آیت کا بس یہی مطلب ہے ، نہیں بلکہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ آیت کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں۔ حقیقت میں اس طرح کی تاویل خاص عرفانی حالات کے نتیجہ میں سامنے آتی ہے۔ مثال کے طور پر اِذهَب الیٰ فِرعَونَ انَّهٗ طَغیٰ[1] میں اذہب کا خطاب عقل سے ہے کہ جاؤ اور اپنی نفس امارہ کو جو اندرونی فرعون ہے ، اصلاح کرو۔[2] واضح ہے کہ اس آیت کو عرفانی حالات پر تطبیق دینے کو عقل سمجھ سکتی ہے اور عقل کو اس سلسلہ میں میزان بنایا جاسکتا ہے۔

۲. عقل دین کی شناخت میں مصباح ہے:

دین کی شناخت میں عقل ایک چراغ کی طرح سے ہے۔ اشاعرہ اور بعض اخباریوں کا یہ ماننا ہے کہ معارف دین کی شناخت میں عقل صرف ایک چراغ یا مصباح ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کے نظریات کی وجہ سے دین کی متجرانہ تفسیر کی جاتی ہے۔ اس بات کو بآسانی ثابت کیا جاسکتا ہے کہ دین کی شناخت میں عقل کا کردار اس سے کہیں زیادہ ہے۔ عقل کے ذریعہ ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ اللہ نے کس چیز کا ارادہ کیا ہے اور کن باتوں کو جزو دین قرار دیا ہے۔ عقل کے پاس اثبات اصول دین جیسے وجود مبداء، وحدت مبداء، اسمائے حسنائے مبداء، ذات مبداء سے عینیت اسما و صفات ، انبیاء کو بھیجنے کی ضرورت ، نزول کتاب و غیرہ کے سلسلہ میں بیّن دلیلیں موجود ہیں۔ عقل اپنے مختلف مراحل میں (عقل تجربی سے لیکر عقل نیمہ تجریدی اور تجریدی محض) اگر یقینی معرفت کا باعث بنتی ہے تو احکام دینی کی شناخت میں نقل کے ساتھ استعمال

۱۔ سورہ طہ، آیت ۲۴

۲۔ العرشیہ، ص ۴

ہو سکتی ہے[۱]۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ عقل ایک چراغ کی طرح احکام و معارف الٰہی کی کلیات سے پردہ اٹھاتی ہے اور انسان کو مصدر تشریع اور منبع احکام الٰہی یعنی نقل تک پہنچاتی ہے۔ اس نکتہ کو ذہن میں رہنا چاہئے کہ عقل اکیلے معارف الٰہی کی جزئیات تک نہیں پہنچ سکتی اور یہاں پر نقل یعنی معارف وحیانی کی اہمیت آشکار ہوتی ہے۔ یعنی عقل ہمیں نقل کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

علم کلام کے کچھ مسائل جیسے معاد جسمانی کی شناخت میں عقل ایک وسیلہ کا کردار نبھاتی ہے۔ اس مسئلہ میں عقل ایک مستقل منبع نہیں ہے بلکہ ایک وسیلہ کی طرح نقل کے ساتھ مل کر اس مسئلہ کی توجیہ کرتی ہے یعنی عقل یہاں پر مصباح ہے۔ عقل اس مسئلہ کو اس طرح اثبات کرتی ہے: معاد جسمانی صرف وحی اور شریعت کے ذریعہ قابل اثبات ہے اور چونکہ اصل شریعت دلایل عقلی کے ذریعہ ثابت شدہ ہے، لہٰذا وحی و شریعت کی بنیاد پر معاد جسمانی کا اثبات کرنا صحیح ہے اور عقل سے اس کا کوئی تضاد نہیں ہے[۲]۔

علم فقہ میں بھی عقل ایک وسیلہ کی طرح شناخت احکام کے لئے، روایات و آیات کے مفاہیم کو جانچتی ہے اور ادلہ کو تخصیص، تقیید اور تعمیم دیتی ہے۔ اس کے علاوہ ادلہ میں تعارض ہونے کی صورت میں کسی ایک کی ارجحیت عقل کے سہارے ہی ممکن ہے۔ حجیت خبر واحد کا اثبات یا رد اور عملی اصول کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت کے سلسلہ میں بھی عقل ایک مصباح کی طرح ہمیں صحیح راستہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ حجیت خبر واحد کے مسئلہ میں آیات و روایت، اجماع اور عقلا کے نظریہ سے استدلال، تحلیل و بررسی اور آخر میں کسی نتیجہ تک پہنچنے میں عقل ہی ہماری مدد کرتی ہے۔

تفسیر میں بھی بعض اوقات عقل دلائل و شواہد و قرائن داخلی و خارجی سے استدلال کرتے ہوئے ہمیں آیت کے اصل معنی کی طرف لے جاتی ہے۔ بعض اوقات ممکن ہے کہ تفسیری روایات عقل کی مخالفت کی وجہ سے رد کر دی جائیں۔ یا مثلًا اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الاَنفُسَ حِینَ مَوتِھَا[۳] اور قُل یَتَوفّاکُم مَلَکُ المَوتِ الذی وَکِّلَ بِکُم ثُمَّ اِلیٰ رَبِّکُم تُرجَعُون[۴] جیسی آیتوں کی تفسیر میں آیات کے استلزامات

۱۔ جوادی آملی، عبداللہ، منزلت عقل در ہندسہ معرفت دینی، ص ۵۳

۲۔ ابن سینا، حسین بن عبداللہ، شفا، ص ۲۸۵

۳۔ سورہ زمر، آیت ۴۲

۴۔ سورہ سجدہ، آیت ۱۱

کو کشف کرکے عقل یہ سمجھ جاتی ہے کہ انسان اصل میں روح ہے اور روح مجرد ہے اور انسان موت کے بعد ختم نہیں ہوتا ہے۔ یہاں پر بھی عقل ایک وسیلہ ہے۔

علم اخلاق میں بھی عقل ایک وسیلہ یا مصباح ہے اور وہ اس طرح کہ مختلف ادلہ کے ذریعہ عقل کسی عمل کے اخلاقی ہونے یا غیر اخلاقی ہونے کا حکم دیتی ہے۔ مثال کے طور پر سوء ظن کی قبح کو عقل اس طرح ثابت کرتی ہے: آیات قرآنی اور روایات میں سوء ظن سے منع کیا گیا ہے، دوسری طرف قرآن و سنت حجت الٰہی ہیں اور عقل ان کی تبعیت کا حکم دیتی ہے لہٰذا یہاں عقل سوء ظن کی قبح کو ثابت کرنے کے لئے ایک وسیلہ ہے۔ ایک خاص نکتہ یہ ہے کہ عقل سے بالاتر امور میں عقل میزان کی طرح ہو سکتی ہے تاکہ ضد عقل باتیں دین میں داخل نہ ہو سکیں لیکن دوسری طرف اس طرح کے امور میں عقل ایک مصباح یا وسیلہ ہے جو انسان کو نقل کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

۳. **عقل ایک مستقل منبع یا مفتاح**: اس نکتہ کی طرف توجہ ضروری ہے کہ بیشتر اصولی شیعی علماء اور معتزلہ جیسے گروہ قرآن و سنت کے ساتھ ساتھ عقل کو بھی استنباط و شناخت احکام و معارف الٰہی کا منبع مانتے ہیں کیونکہ عقل چاہے وہ عقل نظری ہو یا عملی، اپنے ادراکات کے ذریعہ احکام و معارف دینی کی شناخت پیدا کرتی ہے اور اسے کسی دوسری چیز کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ بعض روایتوں میں عقل کو رسول باطنی کا نام دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عقل بھی نقل کی طرح شناخت احکام میں ایک بالاستقلال منبع ہے۔ اس مسئلہ کو ہم چند مثال کے ذریعہ واضح کرتے ہیں۔

علم کلام کے بہت سے موضوعات جیسے اللہ تعالیٰ اور اس کے صفات و افعال کی شناخت، منعم کی شکر گذاری کی ضرورت، تکلیف کی ضرورت اور بہت سے دوسرے امور صرف عقل کے ذریعہ ثابت ہوتے ہیں اور عقل ایک مستقل منبع شمار ہوتا ہے۔ عقل کی مفتاحیت در حقیقت وہی اس کا منبع ہونا ہے۔

علم فقہ میں بھی جہاں پر قیاس کا صغریٰ کبریٰ عقلی ہے وہاں پر عقل ایک منبع مستقل شمار ہوتی ہے۔ مثلاً اس قیاس میں: "عدل حسن ہے اور اس کی رعایت لازم ہے اور جس چیز کی عقلاً رعایت لازم ہے، شرع بھی اسے واجب گردانتی ہے در نتیجہ عدل ایک واجب شرعی ہے"، عقل اکیلے ہی حکم الٰہی کو استنباط کرتی ہے۔ یہ وہی مستقلات عقلیہ ہے جو اصول فقہ کی ایک اصطلاح ہے۔ یا جب ہم کہتے ہیں کہ نماز بہ حکم شرع

واجب ہے اور ہر واجب عمل کا مقدمہ بھی واجب ہوتا ہے لہٰذا نماز کے مقدمات بھی واجب ہیں، اس میں بھی عقل ایک منبع مستقل ہے۔

علم تفسیر میں بھی عقل ایک منبع مستقل کی حیثیت سے کام آتی ہے۔مثلاً جہاں پر ہم عقل برہانی کے ذریعہ بعض مبادی تصویری اور تصدیقی کو بروئے کار لاتے ہوئے تفسیری نکات کا استنباط کرتے ہیں، وہاں پر عقل ایک منبع مستقل ہوتی ہے۔ در حقیقت ایسے موارد میں مبادی تصوری عقل کے ذریعہ استنباط ہوتے ہیں اور آیت پر حمل کئے جاتے ہیں تا کہ آیت کا مطلب سمجھ میں آسکے۔مثلاً آیہ کریمہ یَدُاللهِ فَوقَ اَیدِیهِم (سورہ فتح، ۱۰) میں چونکہ عقل نے پہلے ہی یہ ثابت کر دیا ہے کہ اللہ تعالی کی ذات جسم و مادہ سے مبرا ہے لہٰذا یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہاں پر جسمانی ید مراد نہیں ہے بلکہ اس کا اصل مطلب اللہ تعالی کی طاقت ہے۔

معارف دین کی شناخت میں عقل کی محدودیت

معارف دین کی شناخت میں عقل کے کردار کو ہم نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ۔ ہمیں یہ پتہ چلا کہ عقل مختلف طریقوں سے اس امر میں ہماری مدد کرتی ہے لیکن یہ بات ذہن نشین رہے کہ اپنی تمام تر افادیتوں کے باوجود، بعض دینی موضوعات کے سلسلہ میں عقل کسی بھی طرح سے ہماری مدد نہیں کر سکتی ہے کیونکہ بعض موضوعات ایسے ہیں جن کا احاطہ نہیں کر سکتی ہے اور جس چیز پر عقل محیط نہ ہوسکے اسے ہر گز عقل کے ذریعہ نہیں سمجھا جاسکتا ہے۔مثال کے طور پر اللہ تعالی کی ذات عقل کے ذریعہ قابل شناخت نہیں ہے کیونکہ عقل خود ایک مخلوق ہے تو وہ کیسے اپنے خالق کو پہچان سکتی ہے۔ حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ اللہ تعالی کی ذات عقل بشری میں متصور اور محدود ہونے سے مبرا ہے[۱]۔

عقل بعض مسائل کے کنہ میں ورود نہیں کر سکتی ہے اور ہم بہت تلاش کے بعد بھی بعض مسائل کے لئے کوئی عقلی استدلال پیش نہیں کر سکتے ہیں۔ مثلاً نفس انسانی، یا فقہی احکام اور اعتقادات کی بعض باریکیوں کو عقل سمجھنے سے قاصر ہے اور یہ مسائل ہمیشہ اختلاف نظر کا شکار رہے ہیں لہٰذا یہ کہنا کہ دین کا ہر مسئلہ عقلی طور قابل استدلال ہے درست نہیں ہے بلکہ یہ کہنا چاہئے تمام دینی مسائل کو عقلی طور پر توجیہ کیا

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱۵۵

جاسکتا ہے یعنی جہاں پر عقل کسی مسئلہ کے اثبات میں عاجز ہوتی ہے تو وہ انسان کو نقل اور شناخت کے دوسرے راستوں کی طرف ارجاع دیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ فقہی، کلامی اور اخلاقی مسائل کی کلیت عقل کے ذریعہ قابل استنباط و اثبات ہے لیکن ان مسائل کے فروع و جزئیات تک عقل کی رسائی نہیں ہے۔ یہاں پر ہم معارف دین کی شناخت میں عقل کی محدودیت کی کچھ مثالیں پیش کریں گے۔

۱. **ذات حق تعالی کی شناخت**: بعض دانشوروں کے قول کے مطابق عقل کو یہ پتہ ہے کہ ذات حق تعالی تک کسی مُدرک کی رسائی ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح صفات حق تعالی جو اس کی عین ذات ہے، اس تک بھی عقل کی رسائی ممکن نہیں ہے[۱]۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ انسان اپنی عقل یا حتی کشف و شہود کے ذریعہ ذات حق تعالی کی معرفت و شناخت نہیں پیدا کر سکتا ہے کیونکہ وجود نامحدود کا کوئی حد و اندازہ نہیں ہے کہ وہ ایک محدود موجود کے ذریعہ درک ہوسکے۔ یہاں پر یہ نکتہ ذہن میں رہے کہ اللہ تعالی کا مفہومی طور پر ادراک کرنا اس کی ذات و صفات کی کنہ کی معرفت سے الگ ہے اور یہ دونوں ایک نہیں ہیں یعنی عقل جس چیز کا درک کرتی ہے وہ فیوضات و جلوات الہی کا ادراک ہے۔ دوسرے لفظوں میں مقام فعل میں اللہ تعالی کی ادراک ممکن ہے کیونکہ وہ اپنے افعال میں ظہور و تجلی کرتا ہے[۲]۔

۲. **جزئیات دین کا ادراک**: عقل معارف دینی کی جزئیات میں بھی ورود نہیں کرتی ہے۔ مثال کے طور پر فلسفہ میں عقل برہانی کے ذریعہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ الواحد لا یصدر عنه الا الواحد، یعنی اللہ تعالی سے صدور صادر اول ثابت ہے لیکن صادر اول کون ہے یا کیا ہے، اس کے بارے میں عقل خاموش ہے اور صرف معتبر نقل کے ذریعہ اسے ثابت کیا جاسکتا ہے۔ مختلف روایتوں میں حقیقت محمدیہ کا صادر اول کے طور پر تعارف کرایا گیا ہے۔

پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہے کہ اول ما خلق الله نوری[۳]۔ دوسری روایتوں میں بھی منقول ہے کہ

۱۔ منزلت عقل در ہندسہ معرفت دینی، ص ۵۶

۲۔ ایضاً، ص ۵۸

۳۔ مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار الجامعۃ لدرر اخبار الائمۃ الاطہار، ج ۱، ص ۹۷

قلت لرسول الله اول شی ء خلق الله تعالی ماهو؟ فقال نور نبیك[۱]۔ اس طرح کی دوسری روایتیں روایتیں بھی وارد ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ اخلاقی و فقہی مسائل کی باریکیوں کو بھی عقل درک نہیں کر سکتی ہے۔ مثال کے طور پر نماز، روزہ، مناسک حج، وضو، غسل و تیمّم کا طریقہ اور کیفیت، لوگوں کے اسرار کو فاش کرنا، لوگوں کی غیبت جیسے موضوعات میں عقل خاموش ہے۔ اس طرح کے مسائل میں عقل انسان کو وحی اور مخبر صادق کے ارشادات تک رہنمائی کرتی ہے۔

۳. **نفس کی شناخت**: بعض دانشوروں کا ماننا ہے کہ نفس کی شناخت خداشناسی کی ایک اہم دلیل ہے لیکن عقل نفس کی شناخت پر قادر نہیں ہے اور فلسفی و عقلی دلائل سے یہ معرفت حاصل نہیں ہو سکتی ہے۔ صدر المتالہین نے صراحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے کہ نفس شناسی ایک پیچیدہ علم ہے اور فلاسفہ اپنی تمام تر بحث و گفتگو اور قوت تعقل کے استعمال کے باوجود اصل موضوع سے دور ہیں کیونکہ یہ علم نبوت اور اہل بیتؑ کے در کے علاوہ کہیں اور سے حاصل نہیں ہو سکتا ہے[۲]۔ دوسرے لفظوں میں یہ شناخت قرآن و سنت اور عقلی منابع سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔

۴. **آخرت کے مسائل اور معاد جسمانی** : شیعہ دانشوروں خاص کر صدر المتالہین نے تصریح کی ہے کہ اخروی امور اور معاد جسمانی جیسے موضوعات کو عقل درک نہیں کر سکتی ہے۔ ملا صدرا نے اپنی کتاب شواہد الربوبیہ میں سات مقدموں کے ساتھ معاد جسمانی کو ثابت کرنے کے لئے عقلی دلائل پیش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن معاد جسمانی کی جزئیات کے سلسلہ میں تحریر کرتے ہیں کہ معاد جسمانی کی تصدیق کے لئے کتاب و سنت کی طرف رجوع کرنا ہوگا تا حق آشکار ہو سکے[۳]۔

ملا صدرا اس بات پر بھی تاکید کرتے ہیں کہ آخرت سے متعلق دوسرے مسائل جیسے روز قیامت یا حشر و نشر ارواح بھی عقل کے ذریعہ قابل ادراک نہیں ہے۔ آپ فرماتے ہیں جس طرح حواس ظاہری مدرکات نظری کا ادراک نہیں کر سکتے بالکل اسی طرح عقل نظری مسائل اخروی جیسے رور قیامت، حشر و نشر اور

۱۔ بحار الانوار الجامعۃ لدرر اخبار الائمۃ الاطہار، ج ۵۴، ص ۱۷۰

۲۔ العرشیہ، ص ۲۲۵

۳۔ صدر الدین شیرازی، محمد بن ابراہیم، المبدا والمعاد، ص ۴۷۲

پروردگار عالم کی طرف خلائق کے رجوع کرنے کا راز، ارواح و اجساد کا حشر اور شفاعت کے درک و فہم سے عاجز ہے۔ یہ مسائل وحی اور اہلبیتؑ کی متابعت کے ذریعہ ہی قابل درک ہیں اور اہل حکمت و کلام ان مسائل کے حل کرنے سے قاصر ہیں[۱]۔

۵. **انشائے حکم**: بعض دانشوروں کا ماننا ہے کہ عقل صرف شارع کے بعض احکام کو کشف اور درک کرتی ہے۔ انشائے حکم وہی کر سکتا ہے جو سارے مفاسد و مصالح سے واقف ہو اور سزا و جزا پر بھی قادر ہو اور بے شک یہ سارے امور عقل کے دایرہ اختیار سے خارج ہیں۔ تشریع اور فقہی احکام کے استنباط میں عقل کے اپنے پاس کچھ نہیں ہے بلکہ وہ تو صرف ایک منبع ہے اور اگر عرف میں یہ کہا جاتا ہے کہ عقل یہ حکم دیتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ عقل حکم خدا کو سمجھ رہی ہے۔ اسی طرح عقل کے ذریعہ حسن و قبح افعال کی تشخیص کے سلسلہ میں یہ کہنا پڑے گا کہ عقل انسان کے اختیاری افعال میں حسن و قبح کی تشخیص میں ارشادی کردار ادا کرتی ہے نہ کہ مولویت۔ اسی طرح جیسے ظاہر الفاظ قرآن اور سنت، احکام الٰہی کو ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں اور اس میں مولویت نہیں پائی جاتی ہے۔ مولویت اور حکم دینے والا صرف اور صرف اللہ تعالی کی ذات ہے اور عقل و قرآن و سنت صرف ان احکام کو بیان کرتے ہیں[۲]۔

۶. **عقل کا معیار دین ہونا**: کسی امر کے دینی ہونے یا نہ ہونے کے سلسلہ میں عقل کو معیار نہیں بنایا جاسکتا ہے یعنی ایسا نہیں ہے کہ اگر عقل کسی مسئلہ کے صحت پر برہان عقلی اقامہ کردے تو وہ دینی ہے کیونکہ دین کے بہت سارے حقائق اقامہ برہان سے ثابت نہیں ہوتے ہیں اور یہ حقائق عقل سے بالاتر ہیں نہ عقل کے خلاف۔ البتہ اس طرح کے مسائل میں عقل سلیم جو وہم و گمان سے دور ہے وہ ہمیں قول مخبر صادق کی طرف ہدایت کرتی ہے۔ اگر کسی موضوع کو عقل کے ذریعہ تجزیہ و تحلیل نہیں کر پا رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ موضوع دین سے خارج ہے۔ البتہ یہ بات ذہن نشین رہے کہ دینی مسائل ممکن ہے عقل سے بالاتر ہوں لیکن کبھی بھی عقل کے خلاف نہیں ہو سکتے ہیں۔

۱۔ المبدا والمعاد، ص ۸۳

۲۔ منزلت عقل در ہندسہ معرفت دینی، ص ۴۱

منابع و مآخذ

- قرآن کریم
- نہج البلاغہ، ترجمہ سید جعفر شہیدی، انتشارات علمی و فرہنگی، تہران، ۱۳۸۳
- ابن سینا، حسین بن عبداللہ، شفا، انتشارات کتابخانہ آیت اللہ مرعشی، قم، ۱۴۰۵
- ابن فارس، احمد، معجم مقاییس اللغہ، دفتر تبلیغات اسلامی حوزہ علمیہ، قم، ۱۴۰۴
- ابن منظور، لسان العرب، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۰۸
- اصفہانی، میرزا مہدی، ابواب الہدی، تحقیق و تعلیق حسین مفید، مرکز فرہنگی انتشارات منیر، ۱۳۸۷
- اصفہانی، میرزا مہدی، ابواب الہدی، مصباح الہدی بہ ضمیمہ اعجاز قرآن، تحقیق حسن جمشیدی، بوستان کتاب، ۱۳۸۶
- برنجکار، رضا، آشنایی با فرق و مذاہب اسلامی، نشر طہ، قم، ۱۳۷۸
- پترسون، مایکل، عقل و اعتقادات دینی، ترجمہ احمد نراقی و ابراہیم سلطانی، طرح نو، تہران، ۱۳۸۷
- جوادی آملی، عبداللہ، تسنیم، ج ۱، اسرا، قم، ۱۳۸۸
- جوادی آملی، عبداللہ، منزلت عقل در ہندسہ معرفت دینی، اسرا، قم، ۱۳۸۷
- جوہری، اسماعیل بن حماد، الصحاح تاج اللغہ و صحاح العربیہ، دار العلم للملایین، ۱۴۰۷
- صدر الدین شیرازی، محمد بن ابراہیم، العرشیہ، ترجمہ غلامحسین آہنی، نشر مولی، تہران، ۱۳۶۱
- صدر الدین شیرازی، محمد بن ابراہیم، المبدا و المعاد، ترجمہ احمد بن الحسین اردکانی، مرکز نشر دانشگاہی، تہران، ۱۳۶۲
- صدر الدین شیرازی، محمد بن ابراہیم، تفسیر القرآن، تصحیح محمد خواجوی، بیدار، قم، ۱۳۸۷
- صدر الدین شیرازی، محمد بن ابراہیم، رسالہ سہ اصل، تحقیق حسین نصر جہانگیری، بنیاد حکمت اسلامی صدرا، تہران، ۱۳۸۱
- صدر الدین شیرازی، محمد بن ابراہیم، مفاتیح الغیب، مصحح محمد خواجوی، مؤسسہ مطالعات و تحقیقات فرہنگی، تہران، ۱۳۶۳
- صدوق، محمد بن علی، التوحید، تحقیق سید ہاشم حسینی، مؤسسہ النشر الاسلامی،
- طباطبائی، سید محمد حسین، المیزان فی تفسیر القرآن، مؤسسہ الاعلمی للمطبوعات، بیروت، ۱۳۸۳
- فیومی، احمد بن محمد، المصباح المنیر، دار الہجرہ، قم، ۱۴۱۴
- کلینی، محمد بن یعقوب، الکافی، دار الاضواء، بیروت، ۱۴۱۳
- مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار الجامعہ لدرر اخبار الائمہ الاطہار، انتشارات اسلامیہ، تہران، ۱۳۸۶
- مروارید، حسن علی، تنبیہات حول المبداء، بنیاد پژوہش ہای اسلامی، مشہد، ۱۴۱۸
- مطہری، مرتضی، مجموعہ آثار، ج ۱۳، صدرا، تہران، ۱۳۷۴

ایمان اور اخلاقی فضائل

مؤلف: نعمت اللہ بدخشان
مترجم: شبیہ عباس خان

دینی باور اور ایمان کے وجود میں آنے کی کیفیت، اس کی نشو و نما اور تقویت کے اسباب و علل کو جاننا بہت اہم ہے۔اس مسئلہ کا تحقیقی جائزہ لینا، ایمان کے صحیح معنی و مفہوم کو سمجھنے میں معاون و مددگار ثابت ہوگا، نیز ایمان کی شناخت انسان کے اندر تحول و انقلاب کا پیش خیمہ بن سکتی ہے اور عملی طور پر معاشرے میں ایمان و معنویت کی ترویج کا بہترین ذریعہ بھی ہے۔

انسان میں ایمان کی کمی و بیشی انسانی نفس کے تحولات پر منحصر ہے، لہٰذا اس مقالے میں ایمان اور معنویت کی تقویت اور افزائش کے اسباب و علل پر روشنی ڈالی گی ہے۔سب سے پہلے ایمان کے معنی و مفہوم سے متعلق نظریات کو معرفت عقلی، معرفت قلبی اور تسلیم نفسانی میں تقسیم کیا گیا ہے اور ان کی نقد و بررسی کے بعد آخر میں بارگاہ خداوندی میں روحی اور نفسانی طور پر تسلیم ہو جانے کو ہی دینی باور کا اہم ترین مقوّم بتایا گیا ہے۔ اس کے بعد اخلاقی فضائل کے حصول کے لئے اعمال صالحہ کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کو دینی باور کے لئے لازمہ ذاتی بتایا گیا ہے اور اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ یہ فضائل کس طرح سے دینی باور کو باقی رکھنے اور اس کی تقویت پر اثرانداز ہوتے ہیں۔

گوہر ایمان کی حقیقت اور اس کے لوازمات ہمیشہ سے مسلم دانشوروں کی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ قرآنی مفاہیم کے درمیان، مفہوم ایمان و کفر کو مرکزی حیثیت حاصل ہونے کی وجہ سے اس مسئلے کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اسلام کے ابتدائی فرقوں کا اس بحث میں قدم رکھنا کلامی مقصد کے تحت نہیں تھا بلکہ عملی مشکلات کی بنیاد پر تھا[۱]۔ ایمان اور عمل سے متعلق ابتدائی بحثوں کی بنیاد بھی یہی تھی۔ عصر حاضر کے متکلموں

۱۔ ایزو تسو، توشی ہی کو، مفہوم ایمان در کلام اسلامی، ترجمہ زہرا پورسینا، ص ۴۳

کے لئے بھی یہ سوال چیلنج بنا ہوا ہے کہ ایمان کے معنی و مفہوم میں عمل کا دخل ہے یا نہیں۔اس سلسلے میں کلی طور پر انہوں نے دو نظریوں کو پیش کیا ہے:

۱.پہلا نظریہ: عمل، ایمان کے معنی و مفہوم کا جز ہے۔خوارج، معتزلہ اور اہل حدیث کا یہی نظریہ ہے۔

۲.دوسرا نظریہ: عمل ایمان کے معنیٰ و مفہوم سے خارج ہے لیکن عمل ایمان کے ذاتی لوازم میں سے ہے۔

دوسرے نظریہ کے ماننے والے خود دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں:

الف: کچھ لوگ ایمان اور عمل کے حدود کو ایک دوسرے سے پوری طرح الگ مانتے ہیں۔جیسے مرجئہ

ب: کچھ لوگ عمل کو ایمان کے ذاتی لوازمات میں مانتے ہیں اور اکثر شیعہ متکلموں کا یہی نظریہ ہے۔

اس نظریہ کے قائل افراد کی نظر میں ایمان قلبی تصدیق کا نام ہے اور عمل اس کے لوازمات میں سے ہے اور زبانی اقرار سے اس کا اظہار ہوتا ہے[۱]۔اس نظریہ کے قائل افراد کی دلیل قرآن مجید کی وہ آیتیں ہیں جن میں قلب کو ایمان کی جگہ بتایا گیا ہے اور اس پر مہر لگانے کو کفر اور بے ایمانی بتایا گیا ہے:

أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَـٰهَهُ هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ اللَّـهُ عَلَىٰ عِلْمٍ وَخَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَاوَةً فَمَن يَهْدِيهِ مِن بَعْدِ اللَّـهِ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ۔[۲]: ترجمہ: کیا آپ نے اس شخص کو بھی دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش ہی کو خدا بنالیا ہے اور خدا نے اسی حالت کو دیکھ کر اسے گمراہی میں چھوڑ دیا ہے اور اس کے کان اور دل پر مہر لگادی ہے اور اس کی آنکھ پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور خدا کے بعد کون ہدایت کر سکتا ہے کیا تم اتنا بھی غور نہیں کرتے ہو۔

❖

أُولَـٰئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّـهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ وَأُولَـٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ۔ ترجمہ: یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر اور آنکھ کان پر کفر کی چھاپ لگا دی گئی ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جو حقیقتاً حقائق سے غافل ہیں۔[۳]

۱۔بدخشان، نعمت اللہ، حقیقت ایمان و لوازم آن از منظر علم کلام، قرآن و علی، فصلنامہ اندیشہ دینی دانشگاہ شیراز، ص ۵-۳۴

۲۔سورہ جاثیہ، آیت ۲۳

۳۔سورہ نحل، آیت ۱۰۸

أُولَئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ۔ ترجمہ: اللہ نے صاحبان ایمان کے دلوں میں ایمان لکھ دیا ہے۔[۱]

❖

قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُل لَّمْ تُؤْمِنُوا وَلَٰكِن قُولُوا أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ۔ ترجمہ: یہ بدّو عرب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں تو آپ کہہ دیجئے کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ یہ کہو کہ اسلام لائے ہیں کہ ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔[۲]

یہ گروہ ان آیات سے بھی تمسک کرتا ہے جن میں عمل کو ایمان پر عطف کیا گیا ہے اور عطف کا تقاضا یہ ہے کہ معطوف اور معطوف الیہ میں مغایرت پائی جائے۔ مثال کے طور:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ ترجمہ: جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے نیک عمل کئے نماز قائم کی اور زکات ادا کی، ان کے لئے پروردگار کے یہاں اجر ہے اور ان کے لئے کسی طرح کا خوف یا حزن نہیں ہے۔[۳]

❖

وَمَن يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ نَقِيرًا۔ ترجمہ: اور جو بھی نیک کام کرے گا چاہے وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ صاحب ایمان بھی ہو۔ ان سب کو جنّت میں داخل کیا جائے گا اور ان پر ذرّہ برابر ظلم نہیں کیا جائے گا۔[۴]

❖

۱۔ سورہ مجادلہ، آیت ۲۲
۲۔ سورہ حجرات، آیت ۱۴
۳۔ سورہ بقرہ، آیت ۲۷۷
۴۔ سورہ نساء، آیت ۱۲۴

إِلَّا الَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔

ترجمہ: علاوہ ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کئے اور ایک دوسرے کو حق اور صبر کی وصیت و نصیحت کی۔[۱]

البتہ عمل کا ایمان سے خارج ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عمل بے اہمیت یا کم اہمیت ہے، بلکہ عمل صالح بھی ایمان کے لازمے کے طور پر دنیا اور آخرت میں انسان کو سعادت مند کرنے میں موثر ہے۔

دوسرا مسئلہ جو مسلم دانشوروں کی توجہ کا مرکز بنا وہ ایمان اور معرفت کے تعلق سے ہے۔ انہوں نے ایمان کے ذاتی عناصر میں معرفت کی شمولیت، نیز اس معرفت کی کیفیت کے حوالے سے مختلف نظریات پیش کئے ہیں۔ ان نظریات کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱. ان لوگوں کا نظریہ جو معرفت کو حقیقت ایمان کا ذاتی عنصر خیال کرتے ہیں۔

۲. ان لوگوں کا نظریہ جو معرفت کو ایمان کی حقیقت اور ذات سے خارج بتاتے ہیں۔ یہ لوگ زبانی اقرار کو ہی ایمان کے تحقق کے لئے کافی جانتے ہیں جیسے کرامیہ[۲]۔

پہلے نظریہ کے قائل افراد خود دو مختلف نظریوں کے حامل ہیں:

الف) وہ لوگ جو حقیقت ایمان کو معرفت عقلی پر منحصر سمجھتے ہیں[۳]۔

ب) وہ لوگ جو معرفت کے ساتھ ساتھ دوسرے مفاہیم جیسے خضوع قلبی و محبّت خدا کو بھی ایمان کا جز سمجھتے ہیں۔

البتہ ان لوگوں میں ان عناصر کی تعداد کے بارے میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ کچھ لوگ مذکورہ عناصر کے ساتھ ساتھ اللہ کی کبریائی کے اقرار کو بھی ایمان کے ذاتی عناصر میں شمار کرتے ہیں۔[۴] ان میں

۱۔ سورہ عصر، آیت ۳

۲۔ کرامیہ فرقہ مرجئہ کا ایک گروہ ہے جن کا ماننا ہے کہ زبانی اقرار سے ایمان تحقق پاتا ہے اور ایمان کے لئے معرفت کو ضروری نہیں سمجھتے ہیں۔ البتہ وہ لوگ اس طرح کے ایمان کو کامیابی کا باعث نہیں سمجھتے ہیں۔ (ابن حزم، علی بن احمد اندلسی، الفصل فی الملل والاہواء والنحل، ج ۵، ص ۴۷)

۳۔ جہم بن صفوان جس کا تعلق مرجئہ گروہ سے ہے، اس کا ماننا ہے کہ ایمان معرفت نظری اور عقلی کے برابر ہے۔ (اشعری، ابوالحسن علی بن اسماعیل،، مقالات الاسلامیین واختلاف المصلین، ص ۱۳۲)

۴۔ جعفریان، رسول، مرجئہ، تاریخ واندیشہ، ص ۷۵

سے بیشتر کا ماننا ہے کے ذات ایمان کے لحاظ سے عنصر معرفت ایک قلبی معرفت ہے۔

بلا شبہ صرف ایمان سے نسبت پا لینے اور خود کو مؤمن کہہ لینے سے کوئی شخص حقیقی ایمان کے دائرے میں داخل نہیں ہو سکتا ہے اور نہ ہی لذّت ایمان کی شیرینی سے آشنا ہو سکتا ہے۔ آثار ایمان اور اس کے عملی تقاضوں کو پورا کئے بغیر مدعی ایمان ہونا، دینی معاشرے کی سب سے سنگین بیماریوں میں سے ایک ہے۔ معاشرے میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو صرف ریا اور دکھاوے کی خاطر مومن ہونے کا ڈھونگ رچاتے ہیں، لہٰذا اب سوال یہ ہے کہ دینی باور کس روحی اور نفسیاتی ماحول میں پروان چڑھتا ہے اور کس طرح عمل صالح کو اس کے ذاتی لوازم کے طور پر متعارف کیا جاسکتا ہے؟ کس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ کس نے ایمان کے حقیقی دائرے میں قدم رکھا ہے؟

بلا شبہ ایمان کا درخت ہر زمین میں نہیں اگتا۔ درخت ایمان کی کاشت اور اس کی نشو و نما کے لئے ظاہری اور باطنی اسباب کا فراہم ہونا ضروری ہے۔ ظاہری اسباب سے مراد سماجی اور معاشرتی ماحول ہے جس کی مدد سے ایمان وجود میں آتا ہے اور باطنی اسباب سے مراد وجود انسان کی اندرونی لیاقت اور صلاحیت ہے جسے نفس کے فعل ارادی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان تمام اسباب کے بارے میں گفتگو کرنا ایک مفصّل بحث کا متقاضی ہے اور بہتر ہے ایک تفصیلی رسالہ کا موضوع قرار پائے لیکن اس مقالہ میں جس چیز کو مورد بحث قرار دیا گیا ہے وہ ایمان اور اخلاقی فضائل کے درمیان موجود تعلق ہے جس کی صحیح تبیین اور تشریح اوپر کئے گئے سوالات کے جوابات سے حاصل ہوگی۔ میرے خیال سے اس تعلق کی تفسیر کے لئے ضروری ہے کہ ہم دینی باور کے مفہوم کی تحلیل کریں اور اس کے اجزا و عناصر کی شناخت حاصل کریں، کیونکہ اس تحلیل و شناخت سے ہی اس تعلق و نسبت کی تفسیر ممکن ہے۔ حقیقت ایمان اور اس کے اندرونی اور بیرونی آثار و علامات کو سمجھنے کے لئے نظری لحاظ سے یہ تحقیق معاون ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہ تحقیق عملی لحاظ سے ہمارے لئے ایمان کی ترویج و تبلیغ کی راہوں کو ہموار کرتی ہے۔ ایمان دینداری کی روح ہے اور ایک مومن کی زندگی جینے کے لئے بنیادی اصولوں کو انسان کے لئے فراہم کرنے میں اہم کردار نبھاتا ہے۔ اس موضوع کی تحقیق کی مدد سے ہم انسانی وجود کے عمیق تر مراتب سے آشنا ہو سکتے ہیں جس سے وجود انسان کے باطنی تحول و انقلاب کی بنیادیں ہمارے لئے نمایاں ہو جاتی ہیں۔ ایمان ان مسائل میں سے ہے جن سے آشنائی خود بخود انسان میں درونی تحول کا سبب بنتا ہے۔

قرآنی تعلیمات اور مسلم دانشور اس بات پر متفق ہیں کہ اس حقیقت کی بنیادیں انسان کی فطرت میں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وجود ایمان کی ضرورت کا احساس انسان کی سرشت میں ہے اور مبدا ہستی سے تعلق اور کمال مطلق کی طرف میلان اس کی حقیقت اور فطرت میں پوشیدہ ہے اور یہی احساس انسان کے اندر حقیقی کمالات کے وجود میں آنے کا باعث بنتا ہے اور ایمان اور اخلاق دونوں کا ایک ہی سرچشمہ ہے۔ انبیا کا ہدف بھی یہی تھا کہ انسان اپنے اس فطری میثاق کا پابند رہے اور خدا کی ان فراموش شدہ نعمتوں کو یاد کرے جو انسانی وجود میں اللہ کی جانب سے ودیعت کی گئی ہیں تاکہ ان کی مدد سے معنوی اور انسانی کمالات کو حاصل کر سکے[۱]۔

اخلاق خُلق یا خُلُق کی جمع ہے۔ اردو میں جس کے معنی خو اور عادت کے ہیں اور علمائے اخلاق کی اصطلاح میں ان روحی اور نفسانی صفات و ملکات سے عبارت ہے جو بنا غور و فکر کے افعال مناسب کے صدور کا باعث بنتے ہیں اور اخلاقی فضائل سے مراد وہ مثبت صفات و ملکات ہیں جو عموماً نیک عمل کی تکرار سے حاصل ہوتے ہیں اور انسان کی روحی اور معنوی صلاحیت پر استوار ہوتے ہیں۔

ایمان کی تعریف

ایمان کا لغوی معنی ہے تصدیق مطلق یا اطمینان خاطر کے ساتھ کسی کی تصدیق کرنا اور اس پر اعتماد کرنا۔[۲] اس لفظ کی اصل امِنَ ہے جو لفظ سُلِمَ کا ہم وزن اور ہم معنی ہے۔ ان دونوں کا مشترکہ معنی ہے: امن، سکون، یعنی عدم خوف اور عدم اضطراب۔ پس مومن وہ ہے جو اپنے ایمان کے متعلق سے دل لگاتا ہے اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کرکے اپنے آپ کو ناامنی اور اضطراب سے محفوظ رکھتا ہے:

الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُم بِظُلْمٍ أُولَئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ وَهُم مُّهْتَدُونَ۔ ترجمہ: جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم سے آلودہ نہیں کیا ان ہی کے لئے امن وسکون ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں۔[۳]

دینی نقطہ نظر سے اور شرعی اصطلاح میں خدا اور رسول کی تصدیق اور وحی کے ذریعہ رسول پر نازل ہونے والے حقائق کو دل سے قبول کرنا ایمان ہے۔ اس لفظ کے مقابل میں لفظ کفر ہے جس کا معنی انکار کرنا

۱۔ شریعت، محمد جواد، ترجمہ نہج البلاغہ، ص ۴۳
۲۔ طبرسی، ابی علی الفضل بن الحسن، مجمع البیان فی تفسیر القرآن، ص ۱۲۰
۳۔ سورہ انعام، آیت ۸۲

اور اعتماد نہ کرنا ہے۔ قرآنی نقطہ نظر سے ایمان کو سمجھنے کے لئے بعض مثبت کلمات جیسے اسلام، تصدیق، توکل وغیرہ نیز چند منفی کلمات جیسے کفر، تکذیب، عصیان اور نافرمانی کا سمجھنا ضروری ہے۔ لفظ کفر (ایمان کے مقابل) کا معنی جھل و نادانی نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب تکذیب، انکار اور دشمنی ہے لہٰذا ایمان تصدیق، قبول اور تسلیم کے معنی میں ہے۔

اسلامی اور مغربی دانشور ایمان میں مختلف مفاہیم کی محوریت کے قائل ہیں اور اسی اعتبار سے ایمان کی تعریف بھی کرتے ہیں۔ بعض مغربی دانشوروں نے ایمان کو آخری یا انتہائی دلبستگی کا نام دیا ہے جس کا متعلق حقیقی ایک موجود غائی ہے[۱]۔ اور بعض اسلامی دانشوروں نے ایمان کو خدا کی جانب مجذوبانہ اہتمام اور اقبال بتایا ہے جو انسان کے لئے آخری مقصد کی حیثیت رکھتا ہے[۲]۔ کچھ لوگ ایمان کی تعریف میں کہتے ہیں کہ کسی پر یقین رکھنا اور اسے دل دینے کے ساتھ ساتھ اس پر اعتماد کرنا اور اسے نیک سمجھنا اور اس سے محبّت کرنا ہی ایمان ہے۔[۳]

ایمان کا تعلّق ہمیشہ کسی شخص یا چیز سے ہوتا ہے لہٰذا ایمان کے متعلق کی خصوصیت خود ایمان کی کیفیت کو سمجھنے میں موثر ہے۔ سارے ادیان توحیدی اور آسمانی کتابوں میں ایمان کا اصل تعلق خدائے وحدہ لاشریک کی ذات ہے اور ان ادیان کے تمام اصول در حقیقت اسی اصل کی فروع شمار کی جاتی ہیں۔ ان ادیان میں اللہ تعالی کے وجود کا تعارف ایک مجہول اور نامعلوم شئے کے طور پر نہیں کرایا گیا ہے تاکہ اس کو معلوم کرنے کے لئے انسان مقدمات عقلی اور استدلالی کا محتاج ہو۔ اسلامی نقطہ نگاہ سے توحید ایک فطری موضوع ہے جس کی شناخت اور اس کی جانب میلان کم و بیش تمام انسانوں کی فطرت میں پوشیدہ ہے۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں انسان ایک خدا آشنا فطرت کا مالک ہے اور اس کی روح، روح الٰہی کی ایک پھونک ہے:

۱۔ تیلیخ، پل، پویایی ایمان، ترجمہ حسین نوروزی، ص ۱۶
۲۔ مجتہد شبستری، محمد، پرواز در ابرہای ندانستن، مجلّہ کیان، ص ۱۱
۳۔ سروش، عبدالکریم، اخلاق خدایان، ص ۱۱۳

فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ۔ ترجمہ: پھر جب مکمل کرلوں اور اس میں اپنی روح حیات پھونک دوں تو سب کے سب سجدہ میں گر پڑنا[۱]۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ خدا کی فطری اور حضوری معرفت استدلالی معرفت پر مقدم ہے اور یہی معرفت انسانی ایمان اور تصدیق کے لئے زمین ہموار کرتی ہے۔ ایمان کے تحقق یا اس کی تقویت میں عقلی معرفت کے کردار کے بارے میں آئندہ بحث کریں گے لیکن ہر چیز سے پہلے ضروری ہے کہ ایمان کے مفہومی ڈھانچے کی تحلیل کی جائے اور اس کی جزئیات کا بخوبی جائزہ لیا جائے۔ اس سلسلہ میں ہماری تحقیقات کے منابع کتاب و سنّت ہیں۔ یاد رہے کہ ایمان کے متعلق جو تعریف اور تعبیر ان دونوں منابع میں موجود ہے، وہ منطقی تعریف نہیں ہے جس کا ہدف نظری بحث ہو بلکہ یہ تعریف وہ ہے جس میں ایمان کے لوازم اور اس کے آثار کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دین کے مخاطبین عوام الناس ہیں، اور ان مفاہیم کو ان کے اندر ایک تحول اور انقلاب برپا کرنے کے لئے بیان کیا گیا ہے۔ اسی لئے قرآن مجید اور احادیث میں ایمان کے کلی مفہوم کو بیان کرنے کے بجائے زیادہ تر مومنین کے اوصاف کو بیان کیا گیا ہے، البتہ تمام آیات اور روایت جو اس سلسلے میں موجود ہیں اگر بغور ان کا مطالعہ کیا جائے تو مفہوم اور معنائے ایمان تک پہنچا جاسکتا ہے۔

ایمان کی کیفیت کو سمجھنے کے حوالے سے متعلق ایمان کی خصوصیات کے علاوہ، فاعل ایمان یعنی نفس انسانی یا اس کا ایک خاص حصہ جسے قلب کہا جاتا ہے، کی خصوصیات اور خود ایمان کی خصوصیات جو کہ نفس کا عمل ہے، کو سمجھنا اہم ہیں۔ نفس یا قلب ذاتی طور ایک ایسی حقیقت ہے جو تحول پذیر ہے اور یہ تحول پذیری اس کے تمام افعال کو دگرگوں کر دیتی ہے جس کے نتیجہ میں نفس مومن کا قوی ہونا یا ضعیف ہونا اس کے ایمان کے قوی یا ضعیف ہونے کا باعث ہوتا ہے اور ایمان کے قوی یا ضعیف ہونے سے انسان کا عمل قوی یا ضعیف ہوتا ہے۔ البتہ یاد رہے کہ ایمان کی حقیقت بھی اس کے فاعل (مومن) کی طرح ایک واحد اور بسیط حقیقت ہے اور نفس کی شدّت و ضعف کے اعتبار سے اس میں تشکیکی مراتب پائے جاتے ہیں[۲]۔ لہٰذا ممکن ہے کہ ایمان کے ہر مرتبہ سے ایک الگ مفہوم کو اخذ کیا جائے اور اس کی تحلیل کی جائے، لہٰذا

۱۔ سورہ حجر، آیت ۲۹

۲۔ امین، مجتہدہ، اربعین الہاشمیہ، ص ۱۵۵

معنائے ایمان کے ڈھانچے میں متعدد مفاہیم کا پایا جانا اس کی حقیقت واحدہ اور بسیطہ کے منافی نہیں ہے، یعنی مفاہیم کا اختلاف، ایمان کے مراتب کے اعتبار سے ہے ایمان کی حقیقت کے اعتبار سے نہیں۔

کتاب اور سنّت کی روشنی میں ایمان کو تقویت پہنچانے والے اہم عناصر یہ ہیں، خوف، رجا، صبر، معرفت، اطمینان، اعتماد، توکل، رضا، محبّت اور تسلیم۔ یہ وہ عناصر ہیں کہ جن کے ذریعے ایک ایسا مفہوم وجود میں آتا ہے، جس کی طرف ایمان کی تحلیل کے وقت توجہ ضروری ہے۔ مذکورہ مفاہیم کی شدّت و ضعف قوت نفس کی شدّت و ضعف کے تابع ہے۔ بطور مثال اگر حقیقت ایمان میں کمی اور بیشی کا امکان نہ ہوتا تو قرآن مجید میں قلب انسان پر انزال سکینہ کے ذریعہ ازدیاد ایمان کا تذکرہ نہ ہوتا۔

دوسری جانب ہر انسان میں ایمان کو قبول کرنے کی صلاحیت و لیاقت کے مختلف مراتب ہیں۔ ہر شخص ہر حال میں ایمان کے ہر مرتبہ کا حامل نہیں ہو سکتا ہے۔ ہر شخص کا ایمان اس کے نفس کے مرتبہ کے ہم پلّہ ہوتا ہے۔ معاشرتی تعلقات اور روابط میں مومنین کے اندر پایا جانے والا صبر اور قوّت برداشت ان کے ایمانی درجہ کی حکایات کرتا ہے، کیونکہ طاقت سے زیادہ کام لینا معنوی شخصیت کے بحران اور تھکن کے احساس اور حیرانی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے[۱]۔

مراتب ایمان اور اس سے تناسب رکھنے والے مفاہیم کے پیش نظر ایمان کو مختلف ناموں سے یاد کیا جاسکتا ہے جیسے کہ ایمان خائفانہ، ایمان امیدوارانہ، ایمان صابرانہ وغیرہ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے حقیقت ایمان میں استکمالی مراتب و درجات پائے جاتے ہیں۔

ایمان کے مفہومی مقومات پر گفتگو کا آغاز تصدیق قلبی سے کیا جانا بہتر ہے کیونکہ سوائے کرامیہ جماعت کے جو تصدیق ایمان کو تصدیق زبانی میں ہی منحصر جانتے ہیں دوسرے لوگ حقیقت ایمان میں تصدیق قلبی کی دخالت پر متفق ہیں۔ ماہیت ایمان میں تصدیق قلبی کی دخالت چونکہ اس کے لغوی معنی کے متناسب ہے لہٰذا اس کا قبول کرنا آسان ہو جاتا ہے لیکن اس تصدیق قلبی کی نوعیت کا تعین مسلم دانشوروں کے درمیان بحث انگیز مسائل میں سے ہے جس کے سلسلے میں تین مختلف نظریات پائے جاتے ہیں:

الف: تصدیق یعنی معرفت عقلی (تصدیق منطقی)

ب: تصدیق یعنی معرفت قلبی

۱۔ کلینی، محمد بن یعقوب، اصول کافی، ج ۳، ص ۵۔ ۴۷

ج: تصدیق یعنی تسلیم نفسانی (قلبی)

تصدیق کا پہلا معنی وہی ہے جسے علم منطق کی اصطلاح میں تصدیق کہتے ہیں۔ اس نظریے کے طرفدار دانشوروں کی نظر میں ایمان ایک عقلی معرفت ہے اور ایمان کے متعلقات نظری امور ہیں جو منطقی قضایا کی شکل میں عقل کے ذریعہ تصدیق کئے جاتے ہیں۔ اس نظریے کے قائل افراد تصدیق ایمانی کو کبھی کبھی اس چیز کی تصدیق جانتے ہیں جس کا قطعی علم ہو لہٰذا منطقی یقین کو ایمان کی ماہیت میں داخل جانتے ہیں[۱]۔ اس دعوی کی استدلالی شکل یہ ہے کہ ہم فرض کریں کہ الف ب ہے اور الف کا ب نہ ہونا ممکن نہ ہو۔ اس نظریے کی بنیاد پر ایمان منطقی یقین کے مترادف ہے اور اس میں کمی بیشی کی گنجائش نہیں ہے۔

اس نظریے کے قائلین ماہیت ایمان میں اگر منطقی یقین کے علاوہ کسی اور مفہوم کے معتقد نہ ہوں تو انھیں حقیقت ایمان میں موجود شدّت و ضعف کا انکار کرنا پڑے گا، جیسا کہ انہوں نے خود اس کا اعتراف بھی کیا ہے، جب کہ کتاب و سنّت کی روشنی میں حقیقت ایمان میں شدّت و ضعف کا پایا جانا بہت واضح اور روشن ہے۔ دوسرے یہ کہ متعلقات ایمان کو صرف عقلی دلائل سے ثابت کر پانا اس طرح کہ تمام متفکران عالم قانع ہو جائیں بہت مشکل ہے، اور مقام ثبوت اور تاریخی لحاظ سے بھی آج تک کوئی بھی اعتقادی نظام اثبات کے اس مرحلے تک نہیں پہنچ سکا ہے[۲]۔

اس کے علاوہ مسیحی متکلموں کے درمیان قدیس تھامس اکونیث کا ماننا ہے کہ بے یقینی ہی ایمان کا سرچشمہ ہے اور جس جگہ قرائن و شواہد کسی چیز پر پوری طرح دلالت کرتے ہوں، ایسی جگہ یقین خود بخود حاصل ہو جاتا ہے لہٰذا ایمان (فعل ایمان) کے لئے کوئی جگہ باقی نہیں رہتی[۳]۔ ممکن ہے کہا جائے کہ کسی چیز پر یقین منطقی رکھنے اور ایمان میں اس کو داخل جاننے کے باوجود ممکن ہے اس کے پابند ہوں یا نہ ہوں، لیکن یہ استدلال اس وقت قابل قبول ہو سکتا ہے جب ہم یقین منطقی کے علاوہ اختیاری پابندی کے عنصر کو بھی ایمان کے معنی میں داخل جانیں، جب کہ ہماری بحث بطور خاص اس نظریے کے بارے میں ہے جو حقیقت ایمان کو یقین منطقی میں منحصر جانتا ہے ورنہ اس نظریے میں حقیقت ایمان میں شدّت و ضعف کی

۱۔ طوسی، خواجہ نصیر الدین، اوصاف الاشراف، ص ۸

۲۔ نراقی، احمد و سلطانی، ابراہیم، عقل و اعتقاد دینی، ص ۷۵

۳۔ سروش، عبدالکریم، اخلاق خدایان، ص ۱۱۶

نفی پر کوئی دلیل نہ ہوتی۔ لہٰذا اگر ایمان کو صرف ایک تصدیق عقلی مانا جائے (یقین منطقی) تو ایمان ایک فعل ارادی اور فضیلت اختیاری کے اعلیٰ مرتبے سے گر کر محض ایک انفعال رہ جائے گا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی ہمارے لئے یہ ثابت کردے کہ مثلث کے تمام زاویہ دو قائمہ کے مساوی ہیں تو غیر اختیاری شکل میں ہم کو اس کا علم ہو جائے گا اور ہمیں اس سلسلے میں علم حاصل کرنے یا نہ کرنے کا کوئی اختیار نہ ہوگا جب کہ ایمان نفس کا ایک ارادی اور اختیاری عمل ہے۔ اس کے علاوہ التزام کا مفہوم بھی مبہم ہے اور جب تک اس التزام کی حقیقت واضح نہ ہو یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ اسی طرح منطقی یقین کے ساتھ ساتھ مفہوم ایمان میں درج شدہ التزام کو التزام عقلی فرض کر لیں تو یہ سوال پیش آتا ہے کہ کیا معرفت (اگر چہ معرفت یقینی معرفت ہو) اور التزام عقلی اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اعمال صالحہ کو اپنا لازمہ ذاتی بنا سکیں۔

بہت سے لوگوں کو کسی چیز کی حقانیت کے بارے میں عقلی اور یقینی معرفت حاصل ہے اور عقلی اعتبار سے خود کو اسے انجام دینے کا پابند بھی سمجھتے ہیں، لیکن عملی پابندی کا مظاہرہ نہیں کر پاتے۔ شاید یہ لوگ اس آیہ شریفہ کے مصداق ہیں:

وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا۔ ترجمہ: ان لوگوں نے ظلم اور غرور کے جذبہ کی بنا پر انکار کر دیا تھا ورنہ ان کے دل کو بالکل یقین تھا۔[۱]

یہ نظریہ ایمان کے دائرے کو بہت تنگ اور محدود کر دیتا ہے کیونکہ منطقی یقین کا حاصل کرنا بہت دشوار کام (اگر ناممکن نہ کہیں) ہے اور منطقی یقین کو ایمان کا مترادف جاننے سے یہ ہوگا کہ بہت سے لوگ جوہر ایمان سے محروم رہ جائیں گے کیونکہ ان کے لئے اس کا یقین حاصل کرنا ممکن نہیں ہے، مگر یہ کہ اس دعوے سے صرف نظر کرتے ہوئے ایمان کے بعض مراتب کی حصول یابی کے لئے تنہا معرفت ظنی کو ہی کافی جانیں۔ اور ایسا لگتا بھی نہیں کہ خدائے حکیم نے اپنے بندوں کے ایمان کو ایسی دشوار گزار راہوں میں قرار دیا ہو۔ نیز اگر یقین کو مفوم ایمان میں داخل جانیں تو مناسب ہوگا کہ وہ تمام مفہومی عناصر جو مفہوم ایمان میں مندرج ہیں ان کے تناسب سے یقین کو ایک نفسیاتی یقین شمار کریں۔ نفسیاتی یقین میں مورد اعتقاد قضایا کے صادق ہونے کا اعتقاد ہی اس پر ایمان لانے کے لئے کافی ہے، اگر چہ یہ قضایا بالفعل سو فیصد ثابت نہیں ہوئے ہیں۔ پس لوگوں کا ایمان لانا یا نہ لانا ان کے روحی اور نفسیاتی خصوصیات کی بنیاد پر ہوگا نہ

۲۔ سورہ نمل، آیت ۱۴

کہ عقلی اور فلسفی دلائل پر۔ البتہ ایمانی دعوت کے سامنے سارے افراد کا موقف ایک جیسا نہیں ہوتا کیونکہ ہر شخص کی روحی اور نفسیاتی آمادگی کے مراتب مختلف ہیں، ممکن ہے بعض لوگ کسی حد تک جوہر ایمان کے انتخاب اور اس کے قبول کرنے کی صلاحیت کو کھو چکے ہوں، مثبت روحی اور نفسیاتی پس منظر، تحقق ایمان کے لئے شرائط فراہم کرتا ہےاور روحی و نفسیاتی پس منظر کا منفی ہونا اور غلط ذہنیت تحقق ایمان کے موانع ہیں، لہٰذا منفی ذہنیت کے حامل افرادکے لئے ضروری ہے کہ وہ ان موانع کو پہچانیں اور ان کا ازالہ کرتے ہوئے تحقق ایمان کی راہیں ہموار کریں۔ کبھی کبھی عقلی دلائل کے ذریعہ شکوک و شبہات کے غبار کو صاف کیا جاسکتا ہے اور مثبت روحی و نفسیاتی تیاری کے ذریعہ تحقق ایمان کے شرائط کو فراہم کر سکتے ہیں، لیکن وجود خدا کے عقلی دلائل کا صرف جان لینا اور اسے عقلی طور پر قبول کر لینا، ایمان لانے کے لئے کافی نہیں ہے۔ ان حالات میں بھی ضروری ہے کہ یہ معرفت آہستہ آہستہ مناسب اعمال کے ذریعہ قلب میں اپنی جگہ بنائےاور انسان اسے قلباً تسلیم کرے تاکہ اسے تحقق ایمان کا نام دیا جاسکے۔ عقلی دلائل ایمان لانے کے لئے کافی نہیں ہیں اور نہ ہی ہر روحی و نفسیاتی شرائط میں موثر واقع ہوتے ہیں۔

ہمارے خیال میں قلب جو کہ وجود انسان کی حقیقت ہے اس کا مرتبہ عقل سے بلند تر ہے، لہٰذا متعلقات ایمان کو عقلی طور پر قبول کر لینے کے بعد بھی ممکن ہے کہ انسان قلبی طور پر اسے قبول نہ کرے اور تحقق ایمان حاصل نہ ہو، لیکن اگر انسان قلبی اور روحی طور پر کسی چیز کو قبول کرلے تو گویا اس نے پورے وجود سے اس چیز کو تسلیم کر لیا ہےاور اس کے قوائے باطنی میں ایک قسم کی ہم آہنگی حاصل ہو جاتی ہے۔ تحقق ایمان کا بہترین عامل معرفت خدا کی جانب توجہ اور اس کی طرف فطری رجحان ہےاور دینی باور کا قیام اسی التفات اور فطری رجحان کی بنیاد پر ہے۔ اگر عقلی معرفت بھی انسان کے اندر اس حالت کو ایجاد کرسکے تو ممکن ہے تحقق ایمان کے لئے کارساز محرک قرار پائے ورنہ وہ ایمان کو جنم دینے سے قاصر ہے۔

اب ہم دوسرے گروہ کے نظریہ کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس نظریہ کے مطابق تصدیق ایمانی معرفت قلبی ہے۔ معرفت قلبی کی دو تفسیر ہوتی ہیں۔ یا تو اس سے مراد متعلقات ایمان کے سلسلے میں نفس کی فطری اور اجمالی معرفت ہے، یا اس سے مراد وہ معرفت شہودی ہے جو معنوی سلوک سے حاصل ہوتی ہے۔[1] ہماری نظر میں کوئی بھی معرفت ہو خواہ وہ عقلی ہو یا فطری ہو یا شہودی، بہ تنہائی اس قابل نہیں

۱۔ خمینی، روح اللہ، شرح حدیث جنود عقل و جہل، ص ۸۹

ہے کہ حقیقت ایمان کو نفس کے فعل ارادی کے طور پر بیان کرسکے۔ فطری معرفت ہم انسانوں کے حق میں خدا کا ایک خاص لطف اور عنایت ہے، جس کے حصول میں انسانوں کو ذرّہ برابر اختیار نہیں ہے، جب کہ ایمان ہمارے نفس کا ایک ارادی عمل ہے۔ معرفت شہودی بھی ایک ایسی معرفت ہے جو تذکیہ نفس اور معنوی سیر و سلوک کے مراحل کو طے کرنے سے حاصل ہوتی ہےاور وہ ایک ایسا بلند و بالا مرتبہ ہے جو حصول ایمان کے بعد ایمان کے تقاضوں کو عملی طور پر پورا کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے یعنی نہ تحقق ایمان سے قبل اور نہ ہی تحقق ایمان کے ساتھ۔ حتیٰ اگر اس معرفت کا ادنی مرتبہ سب میں پایا جاتا ہو تب بھی یہ معرفت اس قابل نہیں ہے کہ نفس کے فعل ارادی کے طور پر ایمان کی تبیین و تفسیر کرسکے۔

ایک معاصر دانشور کا کہنا ہے کہ قرآن کی تعبیر میں شہودی معرفت و شناخت نفس کے لئے ایک مرآتی شناخت ہے۔ سورہ اعراف کی آیت نمبر ۱۷۲-۱۷۳ کا معنی یہ ہے کہ جب اپنے اوپر نظر ڈالو تو اپنے آپ کو نہ دیکھو بلکہ اس کے ذریعے خداوند کے وجود پر دلیل قائم کرو اور خود کو دیکھنے کے بجائے صرف خداوند کو دیکھو۔[1] اس حالت کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کے خداوند اپنے کو خود انسان کی ذات میں انسان کو دکھلاتا ہے۔ اپنے آپ کو انسان کو دکھلانا خدا کا کام ہے لیکن خدا کے دکھلانے کے بعد خدا کے سامنے بندے کا تسلیم ہو جانا بندے کا فعل ہےاور یہی اس کا خدا پر ایمان ہے۔ یہ دکھلانا لازمی طور پر ایمان کے تحقق کا سبب نہیں بنتا کیونکہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کے کچھ لوگ اس رؤیت اور مشاہدے کے باوجود اپنے منفی شرائط کے باعث ایمان لانے کی توفیق سے محروم رہ جاتے ہیں۔

امام محمد غزالی تصدیق کے لئے ایک تیسرے معنی کے قائل ہوئے ہیں۔[2] ان کی نظر میں دینی باور کے معنی میں اہم ترین عنصر تسلیم نفسانی (تسلیم قلبی) ہے کہ جس کے وجود میں آتے ہی ایمان بھی تحقق پاجاتا ہے۔ حقیقت ایمان کے سلسلہ میں معرفت عقلی کے قائل افراد بھی کبھی یہ کہتے ہیں کہ یہ معرفت اس وقت مقوم ذاتی ہے جب قلب تک پہنچ جائے اور اس کے لئے ایک طرح کا تعلق فراہم کر دے۔ اسی لئے

۱۔ جوادی آملی، عبداللہ، شناخت شناسی در قرآن، ص ۲۸۶

۲۔ غزالی، ابو محمد، احیاء علوم الدین، ص ۱۱۶-۱۱۷

کہتے ہیں کہ عقیدہ (ایمان) در حقیقت انسان اور ایک ادراکی مضمون کے در میان ایک طرح کا قلبی پیوند اور عقد ہے جس کے نتیجہ میں عمل ظاہر ہوتا ہے۔[۱]

شہید مطہری کی نظر میں اسلام میں ایمان کی حقیقت صرف شناخت پر منحصر نہیں ہے۔ وہ معرفت کو ایمان کے ذاتی اجزا میں شمار کرتے ہیں اور معرفت کے علاوہ دیگر عناصر جیسے تسلیم، رجحان، خضوع، الفت و محبت کو بھی اس میں داخل سمجھتے ہیں۔ ان کی نظر میں بعض فلاسفہ اور متکلمین کی رائے کے برخلاف، اسلام میں ایمان صرف شناخت کا نام نہیں ہے جس کی دلیل شیطان کا وجود ہے۔ شیطان نے خدا کی معرفت رکھنے کے باوجود خدا کے حکم کی نافرمانی کی اور سجدہ کرنے سے انکار کیا، یہاں تک کہ قرآن اس بارے میں کہتا ہے: وَ كَانَ مِنَ الكافِرِينَ۔[۲] یعنی اس کو معرفت تھی پھر بھی وہ کافر تھا۔ خدا کی شناخت ہونے کے باوجود اس کی نافرمانی کا سبب یہ تھا کہ اس کی معرفت تسلیم اور رجحان سے خالی تھی اور اسی انکار اور دشمنی کے باعث اسے کافر کہا گیا۔[۳]

اس نظریہ کی تشریح یوں کی جاسکتی ہے کہ ایمان انسان کے لئے وجودی حقیقت ہے اور جب یہ دل میں پیدا ہو جائے، تو دھیرے دھیرے پورا وجود متاثر ہوتا ہے اور چونکہ عقل اور عقلی معرفت انسان کے پورے وجود پر احاطہ نہیں رکھتی لہٰذا ایمان کو معرفت عقلی میں محدود نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ہماری نظر میں انسان کی تمامتر فکری اور عقلی کوششیں جب تک فطری معرفت اور میل ربوبی کے چراغ کو روشن کرنے میں کامیاب نہ ہوں اور گوہر ایمان کے وجود میں آنے کے تمام عوامل و اسباب موجود نہ ہوں اور اس کے موانع برطرف نہ ہوں، اس وقت تک دینی باور کا تحقق ممکن نہیں ہے۔ ایمان نفس کا ایک ارادی اور اختیاری عمل ہے جو خدا کی حضوری اور ذاتی معرفت کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے اور اس کے مختلف مراتب و درجات ہیں اور یہ معرفت، عقلی معرفت سے بالکل جدا ہے جو ان تنزاعی مفاہیم سے حاصل ہوتی ہے۔ اللہ کی فطری معرفت سے خود خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے نہ کہ اس کی مفہومی اور کلی معرفت اور یہ خدا کی معرفت ہے جس سے دل لگانا چاہئے۔ اس بیان کی روشنی میں یادآوری، خودشناسی اور غفلت سے دوری ایک طرح کی

۱۔ امید، مسعود، نظری بہ زندگی و برخی آرای علامہ طباطبائی، ص ۱۸۴-۱۸۵

۲۔ سورہ بقرہ، آیت ۳۴

۳۔ مرتضی، مطہری، انسان کامل، ص ۹۲-۹۴

بصیرت و بیداری کا سبب بنتی ہے جس کی برکت سے ایک عالمانہ اور آزادانہ انتخاب ممکن ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ قلبی اور نفسیاتی تسلیم کا عنصر در حقیقت دینی باور کے تحقق میں سب سے زیادہ اہم کردار ادا کرتا ہے، کیونکہ ایمان جس مرتبے کا بھی ہو بغیر قلبی تسلیم کے حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔ اسلام کا صحیح اور حقیقی مفہوم بھی یہی ہے۔ البتہ کبھی کبھی ظاہری تسلیم اور امّت مسلمہ میں شامل ہونے کو بھی اسلام کہتے ہیں لیکن ظاہری طور پر اسلام قبول کرنے اور صمیم قلب اور صدق دل سے اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنے میں بہت فرق ہے۔ جناب ابراہیم کا وہ واقعہ جس میں فرزند کی قربانی کے ذریعہ خداوند نے ان کے ایمان کا امتحان لیا، اللہ کی مشیت اور اس کے ارادے کے سامنے حد درجہ تسلیم قلبی کا مظہر ہے۔

تسلیم کے تین مرتبے ہیں: اعضاء و جوارح کا تسلیم ہونا، عقل کا تسلیم ہونا اور دل کا تسلیم ہونا۔ جب کوئی سپاہی دشمن سے مغلوب ہو جاتا ہے اور اسلحہ کو زمین پر رکھ کر اپنے ہاتھوں کو اوپر اٹھا کر جنگ بندی کا اعلان کرتا ہے تو اس تسلیم کو اعضاء و جوارح کا تسلیم ہو جانا کہتے ہیں، کیونکہ ممکن ہے اس کی عقل و فکر تسلیم نہ ہو بلکہ مسلسل فرار کی فکر میں ہو۔ قدرت و طاقت کے دم سے کسی ذات کو اسی حد تک تسلیم کرایا جا سکتا ہے۔ تسلیم عقلی یہ ہے کی عقل و فکر، استدلالی میدان میں قوی اور منطقی استدلال کے مقابل میں تسلیم ہو جائے لیکن پھر بھی ممکن ہے کہ قلبی طور پر ان حقایق کو وہ قبول نہ کرے جسے مد مقابل نے استدلال سے ثابت کیا ہے۔ تیسرا اور سب سے اعلی ترین تسلیمی مرحلہ قلب اور دل کا تسلیم ہونا ہے۔

اور حقیقت ایمان یہی ہے کہ قلب تسلیم ہو جائے۔ جسم، زبان اور عقل کا تسلیم ہونا اگر تسلیم قلبی کے ہمراہ نہ ہو تو ایمان نہیں ہے۔ قلب کا تسلیم ہونا پورے وجود کے تسلیم ہونے کے مساوی ہے اور پھر اس میں کسی طرح کا انکار یا عناد نہیں پایا جاتا ہے اور وہ ایمان جس کا لازمہ عمل ہے وہ اسی مرحلے میں وجود میں آتا ہے نہ کہ اس کے پہلے کے مراحل میں۔ لہٰذا اگر ہم اعمال صالحہ کو ایمان کا لازمہ ذاتی جانتے ہیں تو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ ایمان کو تسلیم قلبی مانیں نہ کہ کچھ اور۔ وجود خدا اور توحید کے مسئلہ میں اگر فرض کریں کہ یہ بات انسان کے لئے مجہول اور نامعلوم ہے اور پھر انسان عقلی مقدمات کے ذریعہ اسے معلوم کر لے تو اس سے وہ صاحب ایمان نہیں بن جاتا بلکہ قلب کے اندر نور ایمان کے روشن ہونے یا نہ ہونے کا دارومدار خود انسان میں کچھ عوامل سلبی اور ایجابی کے اوپر ہے۔ عوامل سلبی ان عوامل کو کہتے ہیں جن کا

وجود تحقق ایمان کی راہ میں رکاوٹ ہے اور ان عوامل سے پاک ہوئے بغیر نفس ایمان کا حامل نہیں ہو سکتا۔ بعض سلبی عوامل یہ ہیں:

کبر، خود خواہی اور غرور:

لَا جَرَمَ أَنَّ اللَّـهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِينَ۔[۱]

ترجمہ: یقینا اللہ ان تمام باتوں کو جانتا ہے جنہیں یہ چھپاتے ہیں یا جن کا اظہار کرتے ہیں وہ متکبرین کو ہرگز پسند نہیں کرتا ہے۔

قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا بِالَّذِي آمَنتُم بِهِ كَافِرُونَ۔ ترجمہ: تو بڑے لوگوں نے جواب دیا کہ ہم تو ان باتوں کے منکر ہیں جن پر تم ایمان لانے والے ہو۔[۲]

فسق:

وَلَقَدْ أَنزَلْنَا إِلَيْكَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ وَمَا يَكْفُرُ بِهَا إِلَّا الْفَاسِقُونَ۔ ترجمہ: ہم نے آپ کی طرف روشن نشانیاں نازل کی ہیں اور ان کا انکار فاسقوں کے سوا کوئی نہ کرے گا۔[۳]

وَلَا تُصَلِّ عَلَىٰ أَحَدٍ مِّنْهُم مَّاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَىٰ قَبْرِهِ إِنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّـهِ وَرَسُولِهِ وَمَاتُوا وَهُمْ فَاسِقُونَ۔ ترجمہ: اور خبردار ان میں سے کوئی مر بھی جائے تو اس کی نماز جنازہ نہ پڑھئے گا اور اس کی قبر پر کھڑے بھی نہ ہوئیے گا کہ ان لوگوں نے خدا اور رسول کا انکار کیا ہے اور حالت فسق میں دنیا سے گزر گئے ہیں۔[۴]

قلب کا حجاب میں ہونا

وَقَالُوا قُلُوبُنَا فِي أَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ وَفِي آذَانِنَا وَقْرٌ وَمِن بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ إِنَّنَا عَامِلُونَ۔ ترجمہ: اور کہتے ہیں کہ ہمارے دل جن باتوں کی تم دعوت

۱۔ سورہ نحل، آیت ۲۳
۲۔ سورہ اعراف، آیت ۷۶
۳۔ سورہ بقرہ، آیت ۹۹
۴۔ سورہ توبہ، آیت ۸۴

دے رہے ہو ان کی طرف سے پردہ میں ہیں اور ہمارے کانوں میں بہرا پن ہے اور ہمارے تمہارے درمیان پردہ حائل ہے لہٰذا تم اپنا کام کرو اور ہم اپنا کام کر رہے ہیں۔[1]

قلب پر مہر لگنا

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٦﴾ خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ ۖ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ۔ ترجمہ: اے رسول! جن لوگوں نے کفر اختیار کر لیا ہے ان کے لئے سب برابر ہے۔ آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ خدا نے ان کے دلوں اور کانوں پر گویا مہر لگا دی ہے کہ نہ کچھ سنتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں اور آنکھوں پر بھی پردے پڑ گئے ہیں۔ ان کے واسطے آخرت میں عذاب عظیم ہے۔[2]

إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ وَهُمْ أَغْنِيَاءُ رَضُوا بِأَن يَكُونُوا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ۔ ترجمہ: الزام ان لوگوں پر ہے جو غنی اور مالدار ہو کر بھی اجازت طلب کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ پسماندہ لوگوں میں شامل ہو جائیں اور خدا نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے اور اب کچھ جاننے والے نہیں ہیں۔[3]

قساوت قلب

أَفَمَن شَرَحَ اللَّهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلَىٰ نُورٍ مِّن رَّبِّهِ فَوَيْلٌ لِّلْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُم مِّن ذِكْرِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ۔ ترجمہ: کیا وہ شخص جس کے دل کو خدا نے اسلام کے لئے کشادہ کر دیا ہے تو وہ اپنے پروردگار کی طرف سے نورانیت کا حامل ہے گمراہوں جیسا

۱۔ سورہ فصلت، آیت ۵
۲۔ سورہ بقرہ، آیت ۶-۷
۳۔ سورہ توبہ، آیت ۹۳

ہو سکتا ہے۔ افسوس ان لوگوں کے حال پر جن کے دل ذکر خدا کے لئے سخت ہو گئے ہیں تو وہ کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہیں۔[1]

غفلت

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ۔ ترجمہ: اور یقینا ہم نے انسان و جنات کی ایک کثیر تعداد کو گویا جہنّم کے لئے پیدا کیا ہے کہ ان کے پاس دل ہیں مگر سمجھتے نہیں ہیں اور آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں ہیں اور کان ہیں مگر سنتے نہیں ہیں۔ یہ چوپایوں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں اور یہی لوگ اصل میں غافل ہیں۔[2]

وَأَنذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ إِذْ قُضِيَ الْأَمْرُ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ وَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ۔ ترجمہ: اور ان لوگوں کو اس حسرت کے دن سے ڈرایئے جب قطعی فیصلہ ہو جائے گا اگرچہ یہ لوگ غفلت کے عالم میں پڑے ہوئے ہیں اور ایمان نہیں لا رہے ہیں۔[3]

خود فراموشی

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ أُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ۔ ترجمہ: اور خبردار ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے خدا کو بھلا دیا تو خدا نے خود ان کے نفس کو بھی بھلا دیا اور وہ سب واقعی فاسق اور بدکار ہیں۔[4]

بے جا تعصب: اس کے بارے پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے کہ:

۱۔ سورہ زمر، آیت ۲۲
۲۔ سورہ اعراف، آیت ۱۷۹
۳۔ سورہ مریم، آیت ۳۰
۴۔ سورہ حشر، آیت ۱۹

مَنْ تَعَصَّبَ أَوْ تُعُصِّبَ لَهُ فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْإِيمَانِ مِنْ عُنُقِهِ۔ترجمہ : جو تعصب کرے یا جس سے تعصب کیا جائے گویا اس نے اپنی گردن سے ایمان کی رسی کھول دی ہے۔[1]

ایجابی عوامل وہ عوامل ہیں جن کا وجود ایمان ساز ہے۔ بعض ایجابی عوامل یہ ہیں:

خودشناسی اور تذکر:

فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ۔ترجمہ: لہٰذا تم نصیحت کرتے رہو کہ تم صرف نصیحت کرنے والے ہو۔[2]

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَن كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ۔ترجمہ: اور ان سے پہلے ہم نے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر دیا ہے جو ان سے کہیں زیادہ طاقتور تھیں تو انہوں نے تمام شہروں کو چھان مارا تھا لیکن موت سے چھٹکارا کہاں ہے۔[3]

بصیرت:

قَدْ جَاءَكُم بَصَائِرُ مِن رَّبِّكُمْ ۖ فَمَنْ أَبْصَرَ فَلِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ۗ وَمَا أَنَا عَلَيْكُم بِحَفِيظٍ۔ترجمہ: تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے دلائل آچکے ہیں اب جو بصیرت سے کام لے گا وہ اپنے لئے اور جو اندھا بن جائے گا وہ بھی اپنا ہی نقصان کرے گا اور میں تم لوگوں کا نگہبان نہیں ہوں۔[4]

تکبر اور گناہ سے دوری کے نتیجہ میں قلب کی سلامتی

يَوْمَ لَا يَنفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ ﴿٨٨﴾ إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ۔ترجمہ: جس دن مال اور اولاد کوئی کام نہ آئے گا۔ مگر وہ جو قلب سلیم کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہو۔[5]

۱۔ اصول کافی، ج ۳، ص ۴۱۹

۲۔ سورہ غاشیہ، آیت ۲۱

۳۔ سورہ ق، آیت ۳۷

۴۔ سورہ انعام، آیت ۱۰۴

۵۔ سورہ شعراء، آیت ۸۸-۸۹

ایمان اور کفر خدا کی جانب قلبی اقبال یا ادبار کا نتیجہ ہے۔ یہ اقبال و ادبار انسان کے اندر پائے جانے والے مثبت یا منفی عوامل پر استوار ہیں۔ مرحوم حاج مرزا جواد ملکی تبریزی (الطهور نصف الایمان) طہارت و پاکیزگی نصف ایمان ہے کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ ایمان قلبی دل کی طہارت سے حاصل ہوتا ہے جس کے دو مرحلے ہیں۔ پہلے اخلاقی رذایل سے پاکیزگی اور دوسرے اخلاق حسنہ سے آراستگی لہٰذا یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ انسان کا نفس جس درجہ رذایل اور خبایث سے پاک ہوگا اسی درجہ ایمان کو قبول کر سکتا ہے۔ منفی صفات سے قلب کے پاک ہونے سے تحقق ایمان کی سلبی شرائط فراہم ہوتی ہیں اور اس کا مثبت صفات سے آراستہ ہونا تحقق ایمان کی ایجابی شرایط کو مہیا کرتا ہے۔البتہ بلا شک گوہر ایمان قلب میں جگہ پاجانے کے بعد خود بہ خود مثبت صفات و ملکات کی تقویت کرتا ہے اور اس کی اس تاثیر گزاری کے بارے میں آیندہ مباحث میں گفتگو کرینگے۔

ایمان اور اخلاقی فضائل

ایمان کے مفہوم و معنی کے تجزیہ و تحلیل کرنے سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ ایمان بغیر معرفت کے حاصل نہیں ہو سکتا اور معرفت سے مراد فطری اور حضوری معرفت ہے کیونکہ تصدیق قلبی (تسلیم نفسانی) کہ ذریعہ ایمان کی تعریف کا مطلب یہ ہے کہ ایمان سے پہلے ایک حقیقت ہو جو مورد تصدیق قرار پائے اور اس سے پہلے ایک معرفت ہو جو اس تصدیق کو ممکن بنائے۔ مذکورہ تصدیق انسان کے ارادے و میلان اور مورد تصدیق واقعیت کی معرفت پر استوار ہے، یعنی تحقق ایمان جو کہ نفس کا فعل ارادی ہے اس کے تین عنصر ہیں: میلان، ارادہ اور معرفت۔ ایمان کی شروعات فطری معرفت کے آغاز سے ہوتی ہے۔

میلان سے مراد انسان میں وہ اندرونی جاذبیت اور کشش ہے جو اپنے ارادے سے کسی عمل کو انجام دینے کے لئے میدان ہموار کرتی ہے اور یہ وہ قوّت ارادی ہے جس کا تحقق انسان کے اندر ہوتا ہے۔ ایمان اپنے تینوں مبادی (معرفتی، میلی اور ارادی) تقاضوں کے وجود میں آنے کے بعد متناسب اعمال کو انجام دیتا ہے۔ مومن افراد میں کسی عمل کو انجام دینے کی رغبت پیدا کرنے کے لئے قوت دافعہ اور جاذبہ ذمہ دار ہے جو انسان کو کسی نیک اور شائستہ عمل کے انجام کے لئے ابھارتے ہیں اور بُرے عمل کو انجام دینے

سے روکتے ہیں۔ اس قوت دافعہ اور جاذبہ کی کمی اور بیشی ہر فرد کے ایمان کے مرتبے کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ یہ قوت کبھی بہت شدید، کبھی میانہ اور کبھی بہت کم ہوتی ہے۔

عمل صالح ایمان کا حتمی اور ضروری لازمہ ہے اور اس کے مراتب ہر شخص کے ایمان کے مرتبہ کے مطابق ہوتے ہیں اور مومن انسان اپنے اندر کسی نیک عمل کو انجام دینے کے لئے جس کشش اور جاذبہ کا احساس کرتا ہے اور اس کے اندر ان اعمال کو انجام دینے کا جو شوق پیدا ہوتا ہے، اس کے بھی مراتب ہیں اور حسب مراتب کسی عمل کو انجام دینے کی امید[۱]، رضا[۲]، شوق[۳] اور شدید محبّت[۴] کی صورت میں ظاہر ہوتے

۱۔إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ۔ ترجمہ: بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور راہ خدا میں جہاد کیا وہ رحمت الٰہی کی امید رکھتے ہیں اور خدا بہت بخشنے والا اور مہربان ہے۔ (سورہ بقرہ، آیت ۲۱۸)

أَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ آنَاءَ اللَّيْلِ سَاجِدًا وَقَائِمًا يَحْذَرُ الْآخِرَةَ وَيَرْجُو رَحْمَةَ رَبِّهِ۔ ترجمہ: کیا وہ شخص جو رات کی گھڑیوں میں سجدہ اور قیام کی حالت میں خدا کی عبادت کرتا ہے اور آخرت کا خوف رکھتا ہے اور اپنے پروردگار کی رحمت کا امیدوار ہے۔ (سورہ زمر، آیت ۹)

۲۔وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُم بِإِحْسَانٍ رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي تَحْتَهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ۔ ترجمہ: اور مہاجرین وانصار میں سے سبقت کرنے والے اور جن لوگوں نے نیکی میں ان کا اتباع کیا ہے ان سب سے خدا راضی ہو گیا ہے اور یہ سب خدا سے راضی ہیں اور خدا نے ان کے لئے وہ باغات مہیا کئے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں اور یہ ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔ (سورہ توبہ، آیت ۱۰۰)

رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ذَٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهُ۔ ترجمہ: خدا ان سے راضی ہے اور وہ اس سے راضی ہیں اور یہ سب اس کے لئے ہے جس کے دل میں خوف خدا ہے۔ (سورہ بینہ، آیت ۸)

۳۔يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَن يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ۔ ترجمہ: ایمان والو تم میں سے جو بھی اپنے دین سے پلٹ جائے گا... تو عنقریب خدا ایک قوم کو لے آئے گا جو اس کی محبوب اور اس سے محبت کرنے والی مومنین کے سامنے خاکسار اور کفار کے سامنے صاحبِ عزت، راہِ خدا میں جہاد کرنے والی اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہ کرنے والی ہو گی۔ یہ فضلِ خدا ہے وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور وہ صاحبِ وسعت اور علیم و دانا بھی ہے۔ (سورہ مائدہ، آیت ۵۴)

۴۔وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِن دُونِ اللَّهِ أَندَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا إِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا وَأَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعَذَابِ۔ ترجمہ: لوگوں میں

ہیں۔اور اسی طرح نفس مومن میں کسی برے یا ناپسندیدہ عمل سے نفرت اور انزجار کا احساس باعث ہوتا ہے کہ وہ ان اعمال کو انجام دینے سے پرہیز کرے، البتہ یہ جاذبہ اور دافعہ غیر مومن اور کافروں میں پوری طرح مختلف ہے۔ مثلاً وہ لوگ جو رات کی تاریکی اور تنہائی میں حالت قیام اور سجود میں اللہ کی اطاعت اور عبادت کرتے ہیں وہ آخرت کے خوف اور رحمت پروردگار کی امید میں ایسا کرتے ہیں، لیکن منافقوں کی خوشی اور رضا حکم الٰہی کے برخلاف جہاد کرنے میں ہے، اور ان کے اندر یہی رضایت خاطر کی حالت انھیں جہاد نہ کرنے پر اکساتی ہے۔

انسان میں ارادہ ہی بعض میلانات و رجحانات کو اپنانے اور بعض کو چھوڑنے کا سبب بنتا ہے اور یہی اعمال جو کہ میلان کی عینی صورت ہیں، ایمان کے مبادی (معرفتی، میلانی، ارادی) میں تاثیر گزار ہیں، اور انھیں اعمال کی تکرار سے متناسب صفات و ملکات نفس انسانی میں حاصل ہوتی ہیں[۱]۔ اگر یہ اعمال و صفات مثبت ہونگے تو وہ ایمان کے حفظ و دوام کا سبب بنیں گے لہٰذا دینی اخلاق وجود ایمان پر مبنی ہے اور ایمان انسان کو براہ راست خدا تک پہنچتا ہے اور اس کے وجود کو اللہ کی قدرت، عظمت اور ربوبیت سے سرشار کرتا ہے اور اس کو مبدا کمالات تک پہنچنے اور اسے حاصل کرنے پر ابھارتا ہے۔

اعمال صالحہ کی تکرار سے نفس میں مثبت صفات واخلاقی ملکات پیدا ہوتے ہیں اور انھیں پر تحول نفس اور اس کے قوام کا دار و مدار ہے۔ مذکورہ صفات و ملکات کی برکت سے جیسے جیسے نفس قوی ہوگا اور مرحلہ کمال سے نزدیک ہوگا، اس کے ایمان میں بھی اضافہ ہوتا جائے گا لہٰذا ایمان کے کم اور زیادہ ہونے کا مطلب صرف کمیت اعمال نہیں ہے جو اصل ایمان سے خارج ہے، بلکہ وہ حقیقت ایمان میں شدّت و ضعف کو بھی بیان کرتا ہے۔

کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اللہ کے علاوہ دوسروں کو اس کا مثل قرار دیتے ہیں اور ان سے اللہ جیسی محبت بھی کرتے ہیں جب کہ ایمان والوں کی تمام تر محبّت خدا سے ہوتی ہے اور اے کاش ظالمین اس بات کو اس وقت دیکھ لیتے جو عذاب کو دیکھنے کے بعد سمجھیں گے کہ ساری قوت صرف اللہ کے لئے ہے اور اللہ سخت ترین عذاب کرنے والا ہے۔ (سورہ بقرہ، آیت ۱۶۵)

۱۔ باقری، خسرو، پیش فرض ہای روانشاسی اسلامی، فصلنامہ حوزہ و دانشگاہ، شمارہ ۵، ص ۳۲

ہماری کوشش تھی کہ حقیقت ایمان کی اس تحلیل میں حقیقت ایمان اور اخلاق کے گہرے رابطے اور تعامل کو بیان کریں اور اب بعض اخلاقی فضیلتوں کو اختصار سے بیان کریں گے تا کہ ایمان کے عناصر اور ایمان واخلاق کے درمیان گہرے تعلق کا بھی اندازہ ہو جائے:

خوف

وہ خوف جو حقیقت ایمان کے عناصر میں سے ہے وہ مذموم و موہوم خوف نہیں ہے کہ جس میں انسانی کمزوری مضمر ہے بلکہ یہ خوف ممدوح اور پسندیدہ ہے اور ایک ایسی حقیقت ہے جو صفات وجلال الٰہی کی معرفت اور اس کی عظمت اور اس کی لامحدود قدرت کے ادراک سے حاصل ہوتی ہے۔ اپنے وجود کے عیب اور نقص کی شناخت سے اس خوف میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ اللہ کی قدرت و عظمت ہر مومن انسان پر اس کی استعداد اور وجودی ظرفیت کے اندازے کے مطابق آشکار ہوتی ہے۔ اسی لئے پیغمبر اسلام ارشاد فرماتے ہیں:

اَنَا اَخْوفکُم منَ الله۔ ترجمہ: میں تم لوگوں میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں۔[1]

اس عبارت سے پتہ چلتا ہے خوف ایمان کے ہر مرتبہ میں اسی کے جیسا ہوتا ہے، حتیٰ ایمان کے اعلیٰ ترین مرتبہ جو کہ پیغمبر اسلامؐ کے ایمان کا مرتبہ ہے اور تسلیم کامل کا مرتبہ ہے، اس میں بھی خوف پایا جاتا ہے۔ یہ خوف، مذموم خوف سے نہ صرف مختلف ہے بلکہ اس طرح کے خوف کو ختم کرنے کا اہم ترین عامل ہے۔ اس خوف کا سیدھا اثر یہ ہے کہ انسان گناہ کو ترک کرکے اطاعت الٰہی کو اختیار کرتا ہے اور اپنے نفس کو گناہ کے دلدل میں گرنے سے محفوظ رکھتا ہے۔ کتاب و سنّت میں پسندیدہ خوف کی مختلف تعابیر ہیں جیسے خشیت، رہبت، وَجَل وغیرہ جو خوف کی اقسام اور اس کے مراتب کو بیان کرتی ہیں۔

امید (رجاء):

امید حقیقت ایمان کو دوام بخشنے والے عناصر میں سے ہے۔[2] امید وہ انبساط قلبی ہے جو محبوب حقیقی

۱۔ نراقی، محمد مہدی، جامع السعادت، ج۱، ص ۲۵۴

۲۔ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ۔ ترجمہ: بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور راہ خدا میں جہاد کیا وہ رحمت الٰہی کی امید رکھتے ہیں اور خدا بہت بخشنے والا اور مہربان ہے۔ (سورہ بقرہ، آیت ۲۱۸)

اور صفات و جمال الٰہی کی معرفت سے حاصل ہوتی ہے۔ اس صفت کی وجہ سے اعمال صالحہ انجام دینے کا شوق بڑھتا ہے۔ امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں: ہر مومن کے دل میں دو نور ہے، خوف کا نور اور امید کا نور۔ اگر دونوں کا وزن کیا جائے تو کوئی بھی ایک دوسرے سے زیادہ نہ ہوگا اور خدا نے ان دو صفتوں کو ان لوگوں کے لئے ذکر کیا ہے جن کی اس نے تعریف کی ہے: یَدعونَ رَبَّھُم خَوفاً و طَمَعاً، ترجمہ: وہ لوگ اپنے پروردگار کو خوف اور امید کے ساتھ پکارتے ہیں۔[1] اور فرمایا وَیَدعُونَنَا رَغَباً وَرَھَباً۔ ترجمہ: وہ امید اور خوف کے عالم میں ہمیں کو پکارتے ہیں۔[2] ان لوگوں کا ایمان اس مرتبہ پر ہے جس میں خوف کے ساتھ امید ہے اور امید کے ساتھ خوف ہے۔ مبدا (سرچشمہ) کے لحاظ سے امید بندہ کے لئے خوف سے برتر ہے کیونکہ امید کا مبدا دریائے رحمت الٰہی ہے اور خوف کا مبدا اس کا غضب ہے اور جو رحمت الٰہی کی طرف متوجہ ہوگا اس کے اندر محبّت خدا زیادہ ہوگی۔[3]

صبر

صبر کا معنی ہوا و ہوس کے مقابلہ میں نفس انسانی کی استقامت ہے۔ ہوائے نفس انسان کو اللہ کی اطاعت سے روکتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں انسان کا مقاومت کرنا اور خدا کی اطاعت پر باقی رہنے کو صبر در اطاعت کہتے ہیں۔ اگر نفس شدائد و مشکلات میں بے تابی کرے لیکن انسان اس کے مقابلے میں اپنے سکون اور اطمینان خاطر کو باقی رکھے تو اسے صبر بر مصیبت کہتے ہیں اور جب ہوائے نفس انسان کو کسی گناہ پر اکسائے لیکن وہ اس کے بہکاوے میں نہ آئے اور اس گناہ کو انجام نہ دے تو اسے صبر بر معصیت کہتے ہیں۔ اور جب انسان کے لئے یہ صبر کرنا آسان ہو جائے اور ایک ملکہ راسخہ کی شکل اختیار کرلے تو انسان مقام رضا کا مستحق ہو جاتا ہے اور جب یہ مقام رضا دائمی ہو جاتا ہے تب انسان مقام محبّت تک پہنچتا ہے اور جس طرح مقام صبر کے بعد مقام رضا ہے اسی طرح مقام رضا کے بعد مقام محبّت ہے۔

۱۔ سورہ سجدہ، آیت ۱۶
۲۔ سورہ انبیاء، آیت ۹۰
۳۔ جامع السعادت، ج ۱۔ ص ۲۳۰۔ ۲۹۰

پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا۔ صبر کو ایمان سے وہی نسبت ہے جو سر کو بدن سے ہے، جب سر کٹے گا تو بدن بھی ختم ہو جائے گا، گویا جس کے پاس صبر نہیں ہے اس کے پاس ایمان بھی نہیں ہے۔[1]

توکل:

توکل ایک اہم اخلاقی فضیلت اور حقیقت ایمان کے مفہومی عناصر میں سے ایک اہم عنصر ہے۔[2] توکل کا معنی و مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنے کاموں میں خدا کی قدرت پر اطمینان قلب کے ساتھ بھروسہ کرے۔ اس مرحلہ میں فرد مومن اپنے تمام امور میں کائنات کے فاعل حقیقی پر اعتماد کرتا ہے اور آہستہ آہستہ مادی اسباب و علل کو مستقل سبب سمجھنا چھوڑ کر خدا سے لو لگاتا ہے اور لطف خدا و رحمت پروردگار کا امیدوار ہوتا ہے۔ اللہ پر توکل کرنے والے شخص کو ایک طرف اس بات کا یقین ہے کہ خدا ہر حال میں اس کا خیر خواہ ہے اور اس کا بھلا چاہتا ہے۔ ایسا شخص اگر ایسی حالت سے دو چار ہو جائے کہ جس میں کسی کام کا انجام دینا ضروری ہو لیکن اس کا نتیجہ بھی اسے معلوم نہ ہو، تو ایسی صورت میں چونکہ وہ اسباب و علل اور عمل کے نتائج سے آگاہ نہیں ہے لہٰذا وہ پورے وجود سے اللہ پر اعتماد کرتا ہے اور اس کی خیر خواہی پر یقین کرتا ہے۔

توکل کے مختلف درجات و مراتب ہیں جس کا تعلق انسان کی توجہ اور مسبّب الاسباب خدا پر بھروسہ کرنے اور اس کی ذات پر یقین کرنے کے مراتب سے ہے۔ جس قدر توکل کرنے والوں کی قلبی توجہ اور ان کا بھروسہ عالم کے ظاہری اسباب و علل اور اس کے استقلالی نقش پر کم ہوگا، اسی مقدار ان کا اعتماد خداوند کی قدرت اور اس کے استقلالی نقش پر بڑھتا جائے گا اور توکل کے مراتب بلند ہوتے جائیں گے۔

۱۔ جامع السعادت، ج ۳، ص ۲۸۳

۲. توکل کے موضوع پر کئی آیتیں موجود ہیں:

وَقَالَ مُوسَىٰ يَا قَوْمِ إِن كُنتُمْ آمَنتُم بِاللَّهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوا إِن كُنتُم مُّسْلِمِينَ۔ ترجمہ: اور موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اگر تم واقعاً اللہ پر ایمان لائے ہو تو اسی پر بھروسہ کرو اگر واقعاً اس کے اطاعت گزار بندے ہو۔ (سورہ یونس، آیت ۸۹)

إِذْ هَمَّت طَّائِفَتَانِ مِنكُمْ أَن تَفْشَلَا وَاللَّهُ وَلِيُّهُمَا وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ۔ ترجمہ: اس وقت جب تم میں سے دو گروہوں نے سستی کا مظاہرہ کرنا چاہا لیکن بچ گئے کہ اللہ ان کا سرپرست تھا اور اسی پر ایمان والوں کو بھروسہ کرنا چاہئے۔ (سورہ آل عمران، آیت ۱۲۲)

رضا

رضا خدا سے باطنی (قلب میں) اور ظاہری (کردار اور گفتار میں) خوشنودی کے معنی میں ہے۔ جو مومن اس مرتبہ پر فائز ہو جاتا ہے اس کی نظر میں کائنات کی ہر چیز جیسے فقر و غنا، درد و سکوں، تندرستی و بیماری، موت و حیات، سب یکساں و مساوی ہوتی ہے کیونکہ وہ ان تمام امور کو خدا کی جانب سے جانتا ہے اور خدا کے ہر فعل سے وہ راضی و خوشنود ہے۔ یہ روحی حالت اس کو ایسا آرام و سکوں اور سرور عطا کرتی ہے کہ گویا سب کچھ اس کی منشا کے مطابق ہے۔

محبت:

محبت کا مطلب لذیذ اور ملائم امور کی جانب نفس کا میلان ہے۔ دوسرے الفاظ میں محبت مناسب ادراک تک پہنچنے سے نفس کا مسرور اور شادمان ہونا ہے۔[1] حقیقی محبّت صرف حقیقی محبوب سے ہی ہوتی ہے۔ محبّت کا اصلی سبب حسن و کمال ہے اور چونکہ خدا حسن مطلق و کمال مطلقہ ہے لہٰذا صحیح معنی میں محبّت اسی سے مخصوص ہے اور ہر وہ چیز جس میں یہ دونوں چیزیں (حسن و کمال) پائی جائیں گی وہ انسان کا محبوب قرار پائے گا اس لئے مومنین اپنی محبت کے اعلیٰ ترین مرتبے کو خدا سے ہی مخصوص جانتے ہیں:

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِن دُونِ اللَّهِ أَندَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ ۖ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ ۗ وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا إِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا وَأَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعَذَابِ ۔ ترجمہ: لوگوں میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اللہ کے علاوہ دوسروں کو اس کا مثل قرار دیتے ہیں اور ان سے اللہ جیسی محبت بھی کرتے ہیں جب کہ ایمان والوں کی تمام تر محبّت خدا سے ہوتی ہے اور اے کاش ظالمین اس بات کو اس وقت دیکھ لیتے جو عذاب کو دیکھنے کے بعد سمجھیں گے کہ ساری قوت صرف اللہ کے لئے ہے اور اللہ سخت ترین عذاب کرنے والا ہے۔[2]

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

۱۔ جامع السعادت، ج ۳، ص ۱۳۲

۲۔ سورہ بقرہ، آیت ۱۶۵

من احب لله و ابغض لله و اعطى لله فهو ممن كمل ايمانه، ترجمہ: جس کی دوستی و دشمنی اللہ کے لئے ہو، اور اس کی عطا و بخشش بھی اللہ کے لئے ہو، وہ ان لوگوں میں سے ہے جن کا ایمان کامل ہے۔[1]

محبّت میں، خوف و امید اور انس و شوق بھی پایا جاتا ہے۔ اس طرح کہ جب مومن محبّت میں صفات الٰہی کے مشاہدے سے اپنی محرومیت کے بارے میں سوچتا ہے تو رنج و الم سے دو چار ہوتا ہے جو خوف کے مرتبہ سے متناسب ہے اور جب اس کی معرفت جمال الٰہی کے جلوؤں کو اس کے دل میں ظاہر کرتی ہے تو اس کے وجود میں ایک ہلچل پیدا ہوتی ہے جسے شوق کہتے ہیں اور جمال الٰہی کے مشاہدے سے شادمان ہونے کی جو حالت اس پر طاری ہوتی ہے اسے انس کہتے ہیں۔ بہت سی احادیث میں حب و محبّت کو حقیقت ایمان کے مقومات میں شمار کیا گیا ہے۔ مثلاً امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے:

هل الايمان الا الحب۔ ترجمہ: کیا ایمان محبّت کے علاوہ بھی کچھ ہے؟

تسلیم:

تسلیم کا مرتبہ رضا اور توکل کے مرتبہ سے بلند تر ہے کیونکہ اس مرتبہ میں مومن اپنے تمام امور کو خدا کے حوالے کر دیتا ہے لیکن توکل کے مرتبے میں صرف اپنے کاموں میں خدا پر بھروسہ کرتا ہے۔ گویا توکل کے مرحلہ میں اسے اپنے امور سے ایک طرح کا تعلق ہوتا ہے لیکن تسلیم کے مرحلہ میں وہ اپنے امور سے کلی طور پر منقطع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مرحلہ رضا میں افعال خدا اس کی طبیعت کے موافق ہوتے ہیں لیکن مرحلہ تسلیم میں طبع کی موافقت و عدم موافقت سب کچھ خدا کے ہی سپرد کر دیا جاتا ہے۔[2] جیسا کہ اس سے پہلے بھی کہا گیا کہ ارادہ الٰہی کے سامنے تسلیم محض ہونا ایمان کا اعلیٰ ترین مرتبہ ہے اور کمالات کے اعلیٰ ترین مرتبہ پر فائز ہونے کی پہچان ہے۔

اس بحث و گفتگو کا نتیجہ یہ ہے کہ رجحان، معرفت اور ارادی عوامل کے فراہم ہونے سے انسان میں ایمان کا عنصر پیدا ہوتا ہے اور ایمان اپنے تحقق کے بعد نفس میں بعض جاذبہ اور دافعہ قوتوں کی پیدائش کا سبب بنتا ہے اور یہی قوت جاذبہ اور دافعہ اعمال صالحہ کی جانب میلان کے اسباب و محرکات کو آمادہ کرتے

۱۔ معراج السعادت، ج ۳، ص ۱۸۴

۲۔ جامع السعادت، ج ۳، ص ۲۱۳

ہیں۔ پھر ارادہ ان تمام امیال و رجحانات کے مجموعے سے کسی ایک کو انتخاب کرتا ہے اور اس انتخاب شدہ میلان کو عملی جامہ پہنتا ہے اور یہی اعمال انجام پا جانے کے بعد خود اپنے مبادی کو متاثر کرتے ہیں اور ان کی تکرار سے آہستہ آہستہ روحی اور اخلاقی صفات کو نفس میں تقویت کرتے ہیں اور ان صفات کے ذریعے نفس کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔ در نتیجہ نفس کی قوت کے اعتبار سے ایمان کا مرتبہ بھی بلند ہو جاتا ہے اور پھر یہ عمل اور رد عمل ایمان، عمل اور صفات کے درمیان جاری رہتا ہے اور ایمان آہستہ آہستہ اعلی مراتب کی جانب اپنے صعودی سفر کو جاری رکھتا ہے۔

منابع و مآخذ

- آیتی، عبدالمحمد، ترجمہ صحیفۂ سجادیہ، سروش، تہران، ۱۳۸۰
- ابن حزم، علی بن احمد اندلسی، (بی تا)، الفصل فی الملل والاھواء والنحل، تحقیق دکتر محمد ابراہیم نصر ودکتر عبدالرحمٰن عمیرہ، دارالجیل، بیروت
- اشعری، ابوالحسن علی بن اسماعیل، مقالات الاسلامیین واختلاف المصلین، تصحیح ھلموت ریتر، انجمن مستشرقان آلمانی، ۱۹۸۰
- الٰہی قمشہ ای، محی الدین، دہ مقالہ در حکمت عملی یا اخلاق مرتضوی، با مقدمہ و تصحیح و تعلیقہ حسن حسن زادہ آملی، انتشارات قیام، قم، ۱۳۷۹
- امید مسعود، نظری بہ زندگی و برخی آرای علامہ طباطبائی، انتشارات سروش، تہران، ۱۳۸۰
- امین، مجتہدہ، اربعین الہاشمیہ، ترجمہ علویہ ہمایونی، اصفہانی نشاط، ۱۳۷۱
- ایزوتسو، توشی ھیکو، مفہوم ایمان در کلام اسلامی، ترجمہ زہرا پور سینا، انتشارات سروش، تہران، ۱۳۷۸
- باقری، خسرو، پیش فرض ھای روانشناسی اسلامی، فصلنامہ حوزہ و دانشگاہ، قم، شمارہ ۵، ۱۳۷۴
- بدخشاں، نعمت الہ، حقیقت ایمان ولوازم آن از منظر علم کلام، قرآن و علیؑ، فصلنامہ اندیشہ دینی دانشگاہ شیراز، شمارہ اول و دوم، پاییز و زمستان، ۱۳۷۹
- تیلیخ پل، پویایی ایمان، ترجمہ حسین نوروزی، انتشارات حکمت، تہران، ۱۳۷۵
- جعفریان، رسول، مرجئہ تاریخ واندیشہ، انتشارات خرم، قم، ۱۳۷۱
- جوادی آملی، عبداللہ، شناخت شناسی در قرآن، مرکز فرہنگی رجاء، تہران، ۱۳۷۲
- خمینی، روح اللہ، شرح حدیث جنود عقل و جہل، تنظیم و نشر آثار امام خمینی، تہران، ۱۳۷۸

- سروش، عبدالکریم، اخلاق خدایان، طرح نو، تہران، ۱۳۸۹
- شریعت، محمد جواد، ترجمہ نہج البلاغہ، انتشارات اساطیر، تہران، ۱۳۷۰
- طبرسی، ابی علی الفضل بن الحسن، مجمع البیان فی تفسیر القرآن با تصحیح و تعلیق سید ہاشم رسولی محلاتی و شیخ فضل آیت اللہ یزدی طباطبائی، دار المعرفہ، بیروت، ۱۳۰۸ق
- طوسی، خواجہ نصیر الدین، اوصاف الاشراف، انتشارات ہدی، تہران، ۱۳۶۱
- غزالی، ابو حامد (بی تا) احیاء علوم الدین، جلد ۱، دار المعرفہ، بیروت
- فرید تنکابنی، مرتضی، (بی تا) نہج الفصاحہ یا تنظیم موضوعی (رہنمای انسانیت)، دفتر نشر فرہنگ اسلامی، تہران
- کلینی، محمد بن یعقوب، (بی تا) اصول کافی، با شرح و ترجمہ حاج سید جواد مصطفری، انتشارات علمیہ اسلامیہ، قم
- مجتہد شبستری، محمد، پرواز در ابرہای ندانستن، مجلّہ کیان، شمارہ ۵۲، سال دہم، ۱۳۷۹
- مصطفوی، حسن، التحقیق فی کلمات القرآن الکریم، جلد ۱، بنگاہ ترجمہ و نشر کتاب، تہران، ۱۳۶۰
- مطہری، مرتضی، (بی تا) عدل الٰہی، انتشارات صدرا، تہران
- مطہری، مرتضی، (بی تا) انسان کامل، انتشارات کتابخانۂ عمومی امیر المومنین علیؑ، اصفہان
- ملکی تبریزی، جواد، اسرار الصلوۃ، ترجمہ رضا رجب زادہ، انتشارات پیام آزادی، تہران، ۱۳۷۶
- موسوی ہمدانی، سید محمد باقر، ترجمہ تفسیر المیزان، ج ۱۸، نشر بنیاد علمی و فکری علامہ طباطبائی، تہران، ۱۳۷۶
- نراقی، احمد و سلطانی، ابراہیم، عقل و اعتقاد دینی، طرح نو، تہران، ۱۳۷۴
- نراقی، محمد مہدی، (بی تا) جامع السعادت، موسسۂ الاعلمی للمطبوعات، بیروت

قرآنی تعلیمات میں دینداری کے مختلف پہلو

مؤلف: محمد باقر آخوندی
مترجم: بنت زینب خان

اس مقالہ کا مقصد قرآنی آیات کے ذریعہ دینداری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنا ہے۔ ایمان اور عمل صالح دینداری کے دو بنیادی پہلو ہیں اور انسان انہیں کے ذریعہ بالقوہ سے بالفعل اور نقص سے کمال تک پہنچتا ہے۔ دین کا نظری پہلو جب انسان کے دل و دماغ کو متاثر کرتا ہے تو ایمان کا ظہور ہوتا ہے اور اسی کی بنیاد پر عمل صالح کی تشکیل ہوتی ہے۔ ایمان اور عمل صالح میں ایک گہرا اور لازم و ملزوم کا تعلق پایا جاتا ہے لیکن ایمان ہمیشہ عمل صالح پر مقدم ہوتا ہے کیونکہ عمل صالح، ایمان کا ثمرہ اور نتیجہ ہوتا ہے۔ اسی گہرے تعلق کی بنیاد پر کہا جاسکتا کہ اگر ایمان ہوگا تو عمل صالح ضرور ہوگا اور عمل صالح بھی صرف اور صرف ایمان کی بدولت ظاہر ہوگا۔ دوسری جانب انسان ایک بااختیار موجود ہے اور اسے حق انتخاب حاصل ہے اور ایمان و عمل صالح کے ذریعہ وہ اپنے آپ کو ترقی کے راستہ پر آگے بڑھا سکتا ہے۔

دینداری کو جانچنے کے لئے مختلف معیاروں کو بروئے کار لایا جاتا ہے اور اس کی مختلف تعریفیں کی جاتی ہیں۔ اگوست کنٹ دینداری کو عقائد، جذبات اور عمل پر مشتمل جانتا ہے۔ امیل دورکیم نے دین کے لئے عقیدہ، منسک اور معاشرتی پہلو بیان کئے ہیں۔ لئوبا نے دین کے لئے چار پہلو بیان کئے ہیں: عقیدہ، جذبات، عمل اور سماجی پہلو۔ فوکویاما نے بھی دین کے چار پہلو بیان کئے ہیں: شناخت، آئین، عقیدہ اور عبادت[1]۔ شجاعی زند نے مسلمانوں کی دینداری کو جانچنے کے لئے اسلامی حوالوں کے ذریعہ دین کے پانچ پہلو بیان کئے ہیں: اعتقادات، اخلاقیات، ایمان، عبادات اور شرعیات۔ ان کی نظر میں دینداری کے بھی وہی پانچ پہلو ہوتے ہیں: اعتقاد رکھنا، بااخلاق ہونا، مؤمن ہونا، عبادت گزار ہونا اور متشرع ہونا[2]۔

۱۔ شجاعی زند، علی رضا، مدلی برای سنجش مراتب دینداری در ایران، جامعہ شناسی ایران، دورہ ششم، ش ۱، ص ۴۲
۲۔ ایضاً، ص ۵۳

خدایاری فرد نے اسلامی منابع کی بنیاد پر مسلمانوں کی دینداری کے لئے چار پہلو بیان کیے ہیں۔دینی شناخت، دینی یقین، دینی جذبات اور دین پر عمل۔[۱]

یہاں پر یہ سوٴال پیدا ہوتا ہے کہ کیاقرآنی نقطہ نظر سے بھی دین کے وہی پہلو ہیں یاان میں کچھ فرق پایا جاتا ہے؟اس مقالہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن مجید میں بیان کئے گئے دین کے مختلف پہلووٴں اور ان حضرات کے ذریعہ بیان کئے گئے دین کے پہلووٴں میں بنیادی فرق پایا جاتا ہے۔اس مقالہ کے دوسرے حصہ میں آیات قرآنی کے نقطہ نظر سے دین و دینداری کے مختلف پہلووٴں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

دینداری کے مختلف پہلو:

قرآنی نقطہ نظر کے مطابق انسان کے دو پہلو ہوتے ہیں، نفس اور بدن[۲] اور ان دونوں میں فرق ہونے کے باوجود یہ دونوں ایک واحد حقیقت ہیں جس کے دوسرے ہوتے ہیں۔اس کاایک سرا متغیر، مادی اور ختم ہونے والا ہے، جب کہ اس کا دوسرا سرا غیر مادی اور ختم نہ ہونے والا ہے۔[۳] انسان کے ان دونوں پہلووٴں ترقی ضروری ہے۔ان میں سے ہر ایک پہلو کی ترقی دوسرے پہلو کو متاثر کرتی ہے۔مختلف قرآنی آیتوں کے ذریعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علم و عمل کے ذریعہ انسان کے ان دونوں پہلووٴں کی ترقی ممکن ہے۔علم کے ذریعہ نفس اور عمل کے ذریعہ جسم کی ترقی ہوتی ہے[۴] اور آخرکار یہ دونوں مل کر انسانی شخصیت کی تشکیل

۱۔خدایاری فرد، آمادہ سازی مقیاس دینداری و ارزیابی دینداری اقشار مختلف جامعہ ایران، انتشارات دانشگاہ تہران، تہران، ۱۳۸۸، ص ۴۲

۲۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ (۱۲) ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ (۱۳) ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَ[illegible] اللَّـهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ۔ ترجمہ: اور ہم نے انسان کو گیلی مٹی سے پیدا کیا ہے۔پھر اسے ایک محفوظ جگہ پر نطفہ بنا کر رکھا ہے۔ پھر نطفہ کو علقہ بنایا ہے اور پھر علقہ سے مضغہ پیدا کیا ہے اور پھر مضغہ سے ہڈیاں پیدا کی ہیں اور پھر ہڈیوں پر گوشت [illegible] ہے پھر ہم نے اسے ایک دوسری مخلوق بنادیا ہے تو کس قدر بابرکت ہے وہ خدا جو سب سے بہتر خلق کرنے والا ہے۔ (سورہ موٴمنون، آیات ۱۲-۱۴)

۳۔حسن زادہ آملی، حسن، عیون مسایل نفس و شرح آن

۴۔ مَن كَانَ يُرِيدُ الْعِزَّةَ فَلِلَّـهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا ۚ إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ ۚ وَالَّذِينَ يَمْكُرُونَ السَّيِّئَاتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۖ وَمَكْرُ أُولَـٰئِكَ هُوَ يَبُورُ۔ترجمہ: جو شخص بھی عزّت کا طلبگار ہے وہ سمجھ لے کہ عزّت سب پروردگار کے لئے ہے۔ پاکیزہ کلمات اسی کی طرف بلند ہوتے ہیں اور عمل صالح انہیں بلند کرتا ہے اور

کرتے ہیں۔ دوسری طرف دین بھی ایک فطری شے ہے[۱] اور انسانی وجود کے ساتھ منطبق ہے۔[۲]

سورہ جمعہ کی آیت نمبر ۲[۳] اور سورہ بقرہ کی ۱۲۹[۴] اور ۱۵۱[۵] آیت میں بعثت انبیاء کا اصل مقصد تعلیم و تزکیہ بتایا گیا ہے یعنی دین کا مقصد صرف تعلیم و تربیت یا ایمان و عمل صالح ہے۔ ایمان تصدیق ہے، تصدیق علم ہے، علم نفس انسانی کا کمال ہے، اور اللہ تعالی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے اسے فعلیت حاصل ہوتی ہے۔ قرآنی منطق کی بنیاد پر ایمان و عمل صالح کے ذریعہ انسان مرحلۂ کمال پر پہنچتا ہے۔ قرآن مجید کی ۵۱ آیتوں[۶] کے مطالعہ سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے۔ ان سبھی آیتوں میں لفظ "آمنوا" کے فوراً بعد

جو لوگ برائیوں کی تدبیریں کرتے ہیں ان کے لئے شدید عذاب ہے اور ان کا مکر بہر حال ہلاک اور تباہ ہونے والا ہے۔ (سورہ فاطر، آیت ۱۰)

۱۔ فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ۔ ترجمہ: آپ اپنے رخ کو دین کی طرف رکھیں اور باطل سے کنارہ کش رہیں کہ یہ دین وہ فطرت الہی ہے جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے اور خلقت الٰہی میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی ہے یقینا یہی سیدھا اور مستحکم دین ہے مگر لوگوں کی اکثریت اس بات سے بالکل بے خبر ہے۔ (سورہ روم، آیت ۳۰)

۲۔ طباطبائی، سید محمد حسین، المیزان فی تفسیر القرآن، ج ۱۶، ص ۲۶۶؛ مکارم شیرازی، ناصر، تفسیر نمونہ، ج ۱۶، ص ۴۱۸

۳۔ هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ۔ ترجمہ: اس خدا نے مکہ والوں میں ایک رسول بھیجا ہے جو ان ہی میں سے تھا کہ ان کے سامنے آیات کی تلاوت کرے، ان کے نفوس کو پاکیزہ بنائے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اگرچہ یہ لوگ بڑی کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا تھے۔ (سورہ جمعہ، آیت ۲)

۴۔ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ۔ ترجمہ: پروردگار ان کے درمیان ایک رسول کو مبعوث فرما جو ان کے سامنے تیری آیتوں کی تلاوت کرے۔ انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور انکے نفوس کو پاکیزہ بنائے۔ بے شک تو صاحبِ عزّت اور صاحبِ حکمت ہے۔ (سورہ بقرہ، آیت ۱۲۹)

۵۔ كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ۔ ترجمہ: جس طرح ہم نے تمہارے درمیان تم ہی میں سے ایک رسول بھیجا ہے جو تم پر ہماری آیات کی تلاوت کرتا ہے تمہیں پاک و پاکیزہ بناتا ہے اور تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور وہ سب کچھ بتاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔ (سورہ بقرہ، آیت ۱۵۱)

۶۔ سورہ بقرہ: ۸۲، ۲۷۷، ۲۵؛ سورہ آل عمران: ۵۷؛ سورہ نساء: ۵۷، ۱۲۲، ۱۲۴، ۱۷۳؛ سورہ مائدہ: ۹، ۹۳؛ سورہ اعراف: ۴۲؛ سورہ یونس: ۴، ۹؛ سورہ ہود: ۱۱، ۲۳؛ سورہ رعد: ۲۹؛ سورہ ابراہیم: ۲۳؛ سورہ اسراء: ۹؛ سورہ کہف: ۳۰، ۱۰۷؛

"عملوا الصالحات" آیا ہے جس سے ان دونوں کا تلازم ثابت ہو سکتا ہے۔ مثلاً سورہ فاطر کی دسویں آیت[1] میں ایمان و عمل صالح کو انسانی رشد و ترقی کا دو اہم عنصر بتایا گیا ہے۔ "الکلم الطیب" جس کو ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے عمل صالح کو معنی بخشتا ہے اور اسے قابل قبول بناتا ہے اور "العمل الصالح" بھی ایمان یا "الکلم الطیب" کو اعلی بناتا ہے۔[2] سورہ طلاق کی آیت نمبر ۱۱[3] اور سورہ نور کی آیت نمبر ۵۵[4] میں ایمان و عمل صالح اس طرح سے ایک دوسرے کے ساتھ ہیں گویا یہ دونوں ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے

سورہ مریم: ۹۶؛ سورہ طہ: ۷۵، ۱۱۲؛ سورہ انبیاء: ۹۴؛ سورہ حج: ۲۳، ۵۰، ۵۶؛ سورہ نور: ۵۵؛ سورہ شعرا: ۲۲۷؛ سورہ عنکبوت: ۷، ۹، ۵۸؛ سورہ روم: ۱۵، ۴۵؛ سورہ لقمان: ۸؛ سورہ سجدہ: ۱۹؛ سورہ سبا: ۴؛ سورہ فاطر: ۷؛ ص: ۲۴؛ سورہ غافر: ۵۸؛ سورہ فصلت: ۸؛ سورہ شورا: ۲۲، ۲۳، ۲۶؛ سورہ جاثیہ: ۲۱؛ سورہ محمد: ۲، ۱۲؛ سورہ فتح: ۲۹؛ سورہ طلاق: ۱۱؛ سورہ انشقاق: ۲۵؛ سورہ بروج: ۱۱؛ سورہ تین: ۶؛ سورہ بینہ: ۷؛ سورہ عصر: ۳

۱۔ مَن كَانَ يُرِيدُ الْعِزَّةَ فَلِلَّهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ وَالَّذِينَ يَمْكُرُونَ السَّيِّئَاتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَمَكْرُ أُولَئِكَ هُوَ يَبُورُ۔ ترجمہ: جو شخص بھی عزّت کا طلبگار ہے وہ سمجھ لے کہ عزّت سب پروردگار کے لئے ہے۔ پاکیزہ کلمات اسی کی طرف بلند ہوتے ہیں اور عمل صالح انہیں بلند کرتا ہے اور جو لوگ برائیوں کی تدبیریں کرتے ہیں ان کے لئے شدید عذاب ہے اور ان کا مکر بہر حال ہلاک اور تباہ ہونے والا ہے۔

۲۔ المیزان فی تفسیر القرآن، ج ۱۷، ص ۲۹

۳۔ رَّسُولًا يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِ اللَّهِ مُبَيِّنَاتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَمَن يُؤْمِن بِاللَّهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا قَدْ أَحْسَنَ اللَّهُ لَهُ رِزْقًا۔ ترجمہ: وہ رسول جو اللہ کی واضح آیات کی تلاوت کرتا ہے کہ ایمان اور نیک عمل کرنے والوں کو تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آئے اور جو خدا پر ایمان رکھے گا اور نیک عمل کرے گا خدا اسے ان جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی وہ ان ہی میں ہمیشہ رہنے والے ہیں اور اللہ نے انہیں یہ بہترین رزق عطا کیا ہے۔ (سورہ طلاق، آیت ۱۱)

۴۔ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا وَمَن كَفَرَ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۔ترجمہ: اللہ نے تم میں سے صاحبان ایمان و عمل صالح سے وعدہ کیا ہے کہ انہیں روئے زمین میں اسی طرح اپنا خلیفہ بنائے گا جس طرح پہلے والوں کو بنایا ہے اور ان کے لئے اس دین کو غالب بنائے گا جسے ان کے لئے پسندیدہ قرار دیا ہے اور ان کے خوف کو امن سے تبدیل کر دے گا کہ وہ سب صرف میری عبادت کریں گے اور کسی طرح کا شرک نہ کریں گے اور اس کے بعد بھی کوئی کافر ہو جائے تو در حقیقت وہی لوگ فاسق اور بد کردار ہیں۔ (سورہ نور، آیت ۵۵)

ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ ان آیتوں میں ایمان میں عمل صالح کے ساتھ معنی پیدا ہوتا ہے اور عمل صالح بھی ایمان کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔

ان آیتوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک دیندار فرد ایمان و عمل صالح کے ذریعہ منزل کمال تک پہنچتا ہے۔ جب دین کا نظری پہلو اس کے دل و دماغ پر اثرانداز ہوتا ہے تو نفس انسانی رشد و ترقی کرتا ہے اور ایمان ظاہر ہوتا ہے اور اس کی بنیاد پر عمل صالح کا ظہور ہوتا ہے یعنی عمل صالح ایمان کا ثمرہ اور پھل ہے لہٰذا اگرچہ عمل صالح اور ایمان کے مابین دو طرفہ تعلق ہوتا ہے لیکن ایمان ہمیشہ عمل صالح پر مقدم ہوتا ہے۔ اگر فرد میں ایمان پیدا ہو جاتا ہے تو گویا اس نے تکامل کے ایک اہم حصہ کو طے کر لیا ہے اور یقیناً وہ عمل صالح انجام دیگا۔ دوسری طرف عمل صالح بھی صرف ایمان کی وجہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

اگر اقدار اور دینی اعتقادات اس طرح دل و دماغ پر اثرانداز ہوں کہ اس کی ذات کا حصہ بن جائیں اور انسان ان کے سامنے سر تسلیم خم کرلے تو ایمان کی تشکیل ہوتی ہے اور اس کے فوراً بعد عمل صالح کا ظہور ہوتا ہے۔ جو شے عمل صالح کی ضمانت دیتی ہے وہی ایمان ہے جو انسان کے وجود پر اثرانداز ہو چکا ہے۔[1]

حضرت علیؑ نے دین کی جو تعریف پیش کی ہے اس میں بھی اسی بات کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ آپ ارشاد فرماتے ہیں: اسلام یعنی تسلیم ہونا اور تسلیم ہونا یقین ہے اور یقین تصدیق ہے اور تصدیق اقرار ہے اور اقرار ادا ہے اور ادا عمل ہے اور مؤمن کا ایمان اس کے عمل سے ظاہر ہوتا ہے۔[2]

دین کی طرح دینداری کے بھی دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایمان اور عمل صالح۔ دین صرف انسان کی تعلیم و تربیت کے لئے ہے لہٰذا دین دیندار سے جدا نہیں ہے اور ان کے درمیان برابر کا تعلق پایا جاتا ہے۔ ایمان کے ذریعہ عمل صالح کا ظہور ہوتا ہے اور عمل صالح ایمان کو تقویت پہنچاتا ہے۔ قرآن کریم میں ۶۷[3] بار لفظ مؤمن کا ذکر ہوا ہے اور اس مقالہ میں اسی مؤمن کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے۔

۱۔ تفسیر نمونہ، ج ۱، ص ۱۴۲

۲۔ المیزان فی تفسیر القرآن، ج ۳، ص ۱۸۹

۳۔ سورہ بقرہ: ۹۱، ۹۳، ۲۲۱، ۲۴۷؛ سورہ آل عمران: ۴۹، ۱۳۹، ۱۷۵؛ سورہ نساء: ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۱۲۴ سورہ مائدہ: ۲۳، ۵۷، ۱۱۲؛ سورہ انعام: ۱۱۸؛ سورہ اعراف: ۸۵؛ سورہ انفال: ۱؛ سورہ توبہ: ۱۰، ۱۳، ۱۴، ۶۲؛ سورہ یونس: ۹۹؛ سورہ ہود: ۸۶؛ سورہ نور: ۱۷؛ سورہ شعراء: ۳، ۸، ۶۷، ۱۰۳، ۱۳۹، ۱۵۷، ۱۷۴، ۱۹۰، ۱۹۹؛ سورہ سبا: ۳۱، ۴۱؛ سورہ صافات: ۲۹؛ سورہ حدید: ۸؛ سورہ کہف: ۸۰؛ سورہ اعراف: ۷۵؛ سورہ دخان: ۲۵؛ سورہ ممتحنہ: ۱۰، ۱۱؛ سورہ احزاب: ۳۶؛

ایمان دینداری کا پہلا پہلو

ایمان کا مطلب اطمینان خاطر کے ساتھ تسلیم ہونا ہے۔[۱] طبرسی بھی کہتے ہیں کہ علما کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ایمان تصدیق کے معنی میں ہے۔[۲] تفسیر المیزان میں بھی اطمینان خاطر کے ساتھ تصدیق کو ایمان بتایا گیا ہے۔[۳] راغب اصفہانی نے بھی اطمینان خاطر کے ساتھ تصدیق کو ایمان بتایا ہے۔[۴] قرآن میں بھی ایمان پر زیادہ تاکید کی گئی ہے نہ کہ اعتقاد و یقین پر۔[۵] قرآنی آیتوں اور روایات کے مطابق ایمان کی سب سے بہتر تعریف تسلیم ہونا یا تصدیق کرنا ہے کیونکہ قرآن مجید ایسے لوگوں کو کافر مانتا ہے جو اعتقاد تو رکھتے ہیں لیکن تصدیق نہیں کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر قوم فرعون کو یہ یقین تھا کہ موسی کا معجزہ اللہ تعالی کی جانب سے ہے لیکن انہوں نے اس بات کا اقرار نہیں کیا۔[۶] سورہ اسرا کی آیت نمبر ۱۰۲ میں[۷] بھی اس بات پر تاکید کی گئی ہے کہ فرعون کو یقین تھا کہ یہ نشانیاں اللہ تعالی کی جانب سے ہیں لیکن وہ تسلیم نہیں ہوتا تھا۔ شیطان بھی اللہ پر یقین رکھتا تھا اور کہتا تھا خَلَقتَنی من نّار...[۸] یا شیطان خدا کو اپنا رب مانتا تھا کہ

سورہ فتح: ۲۵؛ سورہ تحریم: ۵؛ سورہ طہ: ۷۵، ۱۱۲؛ سورہ سجدہ: ۱۸؛ سورہ نوح: ۲۸؛ سورہ نحل: ۹۷؛ سورہ اسراء: ۱۹؛ سورہ انبیاء: ۹۴؛ سورہ غافر: ۲۸، ۴۰؛ سورہ تغابن: ۲

۱۔ قرشی، سید علی اکبر، واژہ شناسی قرآن، دار الکتب اسلامیہ، ج ۱، ص ۱۲۵

۲۔ طبرسی، فضل بن حسن، مجمع البیان فی تفسیر القرآن، ج ۱، ص ۱۲۵

۳۔ المیزان فی تفسیر القرآن، ج ۱، ص ۷۳

۴۔ راغب اصفہانی، حسین بن محمد، المفردات فی غریب القرآن، ص ۹۰

۵۔ واژہ شناسی قرآن، ج ۱، ص ۱۲۵

۶۔ وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ۔ ترجمہ: ان لوگوں نے ظلم اور غرور کے جذبہ کی بنائی پر انکار کر دیا تھا ورنہ ان کے دل کو بالکل یقین تھا پھر دیکھو کہ ایسے مفسدین کا انجام کیا ہوتا ہے۔ (سورہ نمل، آیت ۱۴)

۷۔ قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا أَنزَلَ هَـٰؤُلَاءِ إِلَّا رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ بَصَائِرَ وَإِنِّي لَأَظُنُّكَ يَا فِرْعَوْنُ مَثْبُورًا۔ ترجمہ: موسیٰ نے کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ سب معجزات آسمان و زمین کے مالک نے بصیرت کا سامان بنا کر نازل کئے ہیں اور اے فرعون میں خیال کر رہا ہوں کہ تیری شامت آ گئی ہے۔ (سورہ اسراء، آیت ۱۰۲)

۸۔ قَالَ مَا مَنَعَكَ أَلَّا تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ۔ ترجمہ: ارشاد ہوا کہ تجھے کس چیز نے روکا تھا کہ تو نے میرے حکم کے بعد بھی سجدہ نہیں کیا۔ اس نے کہا کہ میں ان سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور انہیں خاک سے بنایا ہے۔ (سورہ اعراف، آیت ۱۲)

رب بما اغویتنی[۱]۔ اسے معاد کا بھی یقین تھا انظرنی الی یوم یبعثون[۲]۔ وہ انبیا پر بھی اعتقاد رکھتا تھا اور جانتا تھا کہ عباداللہ المخلصین کو فریب نہیں دے سکتا۔[۳] لیکن ان ساری باتوں کو ماننے کے باوجود أَبَىٰ وَٱسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ ٱلْكَٰفِرِينَ[۴]۔ اس آیت کے مطابق اللہ تعالی نے شیطان کو عقیدہ اور یقین نہ رکھنے کی وجہ سے نہیں بلکہ اللہ کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرنے کی بنیاد پر کافر کہا ہے۔

ظہور اسلام کے وقت بہت سے اہل کتاب بھی پیغمبر اکرمؐ پر یقین رکھتے تھے اور انہیں اپنے فرزند کی طرح پہنچانتے تھے[۵] لیکن آپ کی رسالت کو چھپاتے تھے اور اپنے عقیدہ و یقین کی وجہ سے رسول خداؐ کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتے تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ایمان کا مطلب اعتقاد یا یقین کے معنی میں نہیں ہے بلکہ مؤمن وہ ہے جو اللہ تعالی کے ارادہ کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہو اور اس کی بنیاد پر عمل کرے۔ اس کے علاوہ سورہ نساء کی آیت نمبر ۱۳۷[۶] اور سورہ منافقون کی آیت نمبر ۳[۷] کی بنیاد پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ

۱۔ قَالَ رَبِّ بِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَلَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ۔ ترجمہ: اس نے کہا کہ پروردگار جس طرح تو نے مجھے گمراہ کیا ہے میں ان بندوں کے لئے زمین میں ساز و سامان آراستہ کروں گا اور سب کو اکٹھا گمراہ کروں گا۔ (سورہ حجر، آیت ۳۹)

۲۔ قَالَ أَنظِرْنِي إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ۔ ترجمہ: اس نے کہا کہ پھر مجھے قیامت تک کی مہلت دے دے۔ (سورہ اعراف، آیت ۱۴)

۳۔ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ۔ ترجمہ: علاوہ تیرے ان بندوں کے جنہیں تو نے خالص بنالیا ہے۔ (سورہ حجر، آیت ۴۰)

۴۔ وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ۔ ترجمہ: اور یاد کرو وہ موقع جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کے لئے سجدہ کرو تو ابلیس کے علاوہ سب نے سجدہ کرلیا. اس نے انکار اور غرور سے کام لیا اور کافرین میں ہوگیا۔ (سورہ بقرہ، آیت ۳۴)

۵۔ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ۔ ترجمہ: جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ رسول کو بھی اپنی اولاد کی طرح پہچانتے ہیں۔ بس ان کا ایک گروہ ہے جو حق کو دیدہ و دانستہ چھپا رہا ہے۔ (سورہ بقرہ، آیت ۱۴۶)

۶۔ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللَّهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيلًا۔ ترجمہ: جو لوگ ایمان لائے اور پھر کفر اختیار کرلیا پھر ایمان لے آئے اور پھر کافر ہوگئے اور پھر کفر میں شدید و مزید ہوگئے تو خدا ہرگز انہیں معاف نہیں کرسکتا اور نہ سیدھے راستے کی ہدایت دے سکتا ہے۔

۷۔ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا فَطُبِعَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُونَ۔ ترجمہ: یہ اس لئے ہے کہ یہ پہلے ایمان لائے پھر کافر ہوگئے تو ان کے دلوں پر مہر لگادی گئی تو اب کچھ نہیں سمجھ رہے ہیں۔

کہ مؤمنوں میں پہلے اعتقاد و یقین پیدا ہوا، پھر ان کا یہ اعتقاد و یقین ختم ہو گیا، دوبارہ اعتقاد و یقین پیدا ہوا اور پھر یہ یقین و ایمان ختم ہو گیا اور وہ کافر ہو گئے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ ان لوگوں نے ابتدا میں اللہ تعالی کے سامنے سر تسلیم خم کیا، پھر حالت تسلیم سے خارج ہوئے، پھر تسلیم ہوئے اور پھر حالت تسلیم سے خارج ہوئے اور کافر ہو گئے۔[۱]

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ ایمان ایک سیال شئے ہے جب کہ یقین ایسا نہیں ہے۔اسی وجہ سے ایمان یقین کے بعد پیدا ہوتا ہے اور یقین ایمان کا مقدمہ ہے اور جو لوگ اعتقاد کے بعد اس کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں وہ لوگ مؤمن ہیں ورنہ کافر یا منافق ہوں گے۔[۲] اس بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ ایمان رکھنے والا شخص مؤمن ہوتا ہے اور صرف دین کا علم رکھنے یا اس پر یقین رکھنے سے شخص مؤمن نہیں ہوتا ہے۔ ایمان علم و یقین کے بعد پیدا ہوتا ہے لہٰذا مؤمن کے پاس علم و یقین کے علاوہ ایمان بھی ہوتا ہے اور ہر حال میں اوامر الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہے اور اس پر اطمینان رکھتا ہے۔[۳] سورہ فتح کی چوتھی آیت[۴] کے مطابق سکینہ یعنی تسکین یا اطمینان خاطر اور سکون ایمان کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے۔سکینہ مادہ سکون سے بنا ہے جس کا مطلب ہے سکون اور اطمینان خاطر اور ہر طرح کی شک و تردید و خوف کا انسان سے دور ہونا اور حوادث و مشکلات کے سامنے انسان کا ثابت قدم رہنا۔[۵] اسی وجہ سے بعض روایتوں میں سکینہ کو ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے۔[۶] سورہ نور کی آیت نمبر ۵۱ کے مطابق مؤمنین اس طرح سے اوامر الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم

۴۔واژہ شناسی قرآن، ج ۱، ص ۱۲۷

۲۔ایضاً

۳۔قُلْ آمِنُوا بِهِ أَوْ لَا تُؤْمِنُوا إِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مِن قَبْلِهِ إِذَا يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ يَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ سُجَّدًا ﴿۱۰۷﴾ وَيَقُولُونَ سُبْحَانَ رَبِّنَا إِن كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُولًا ﴿۱۰۸﴾ وَيَخِرُّونَ لِلْأَذْقَانِ يَبْكُونَ وَيَزِيدُهُمْ خُشُوعًا۔ ترجمہ: آپ کہہ دیجئے کہ تم ایمان لاؤ یا نہ لاؤ جن کو اس کے پہلے علم دے دیا گیا ہے ان پر تلاوت ہوتی ہے تو منہ کے بل سجدہ میں گر پڑتے ہیں۔اور کہتے ہیں کہ ہمارا رب پاک و پاکیزہ ہے اور اس کا وعدہ یقینا پورا ہونے والا ہے۔اور وہ منہ کے بل گر پڑتے ہیں روتے ہیں اور وہ قرآن ان کے خشوع میں اضافہ کر دیتا ہے۔ (سورہ اسراء، ۱۰۷-۱۰۹)

۴۔ھُو الّذی اَنْزلَ السَّکینَۃَ فِی قُلوب المُومنین

۵۔ المیزان فی تفسیر القرآن، ج ۱۸، ص ۳۸۷

۶۔بحرانی، سید ہاشم، البرہان فی تفسیر القرآن، ج ۲، ص ۱۱۴

کئے ہیں کہ ندائے الٰہی کے سنتے ہی یا خدا اور رسول کے فیصلہ سے مطلع ہوتے ہی بغیر چون وچرا کے کہتے ہیں: ہم نے سن لیا اور اطاعت کی۔ آیت میں لفظ انما حصر پر دلالت کرتا ہے یعنی مؤمنین کی زبان پر ندائے الٰہی یا اللہ و رسول کے فیصلے کو سنتے وقت صرف یہی دو لفظ ہوتا ہے اور اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا ہے۔[1]

اگر ایمان سے متعلق قرآنی آیتوں کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کی حقیقت صرف سمعنا اور اطعنا ہے۔ اور آیت کے آخری حصہ وَ اُولئِکَ ھُمُ المُفلِحُون کے مطابق، اللہ تعالی اور رسولؐ کی ندا کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے نتیجہ میں ہی وہ حقیقی رستگار ہونگیں اور سورہ یونس کی نویں آیت[2] کے مطابق وہ لوگ ایمان کی طرف ہدایت کئے جائیں گے۔ ایمان کی طرف ہدایت کا مطلب ہے کہ ان کا ایمان اور مضبوط ہوگا۔[3]

ایمان اور علم

قرآنی آیتوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ایمان صرف علم کا نام نہیں ہے بلکہ اس سے بڑھ کر ہے کیونکہ قرآن کریم ایسے لوگوں کے بارے میں خبر دیتا ہے جو علم کے باوجود کفر وارتداد میں مبتلا ہوگئے۔[4] ان

۱۔ تفسیر نمونہ، ج ۱۴، ص ۵۲۲

۲۔ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ يَهْدِيهِمْ رَبُّهُم بِإِيمَانِهِمْ تَجْرِي مِن تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ۔ ترجمہ: بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کئے خدا ان کے ایمان کی بنا پر اس منزل کی طرف ان کی رہنمائی کرے گا جہاں نعمتوں کے باغات کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔

۳۔ تفسیر نمونہ، ج ۸، ص ۲۳۹

۴۔ إِنَّ الَّذِينَ ارْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِهِم مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى الشَّيْطَانُ سَوَّلَ لَهُمْ وَأَمْلَىٰ لَهُمْ۔ ترجمہ: بیشک جو لوگ ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد الٹے پاؤں پلٹ گئے شیطان نے ان کی خواہشات کو آراستہ کر دیا ہے اور انہیں خوب ڈھیل دے دی ہے۔ (سورہ محمد، آیت ۲۵)

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّـهِ وَشَاقُّوا الرَّسُولَ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَىٰ لَن يَضُرُّوا اللَّـهَ شَيْئًا وَسَيُحْبِطُ أَعْمَالَهُمْ۔ ترجمہ: بیشک جن لوگوں نے کفر اختیار کر لیا اور لوگوں کو خدا کی راہ سے روکا اور ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد بھی پیغمبر سے جھگڑا کیا وہ اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے ہیں اور اللہ عنقریب ان کے اعمال کو بالکل برباد کر دے گا۔ (سورہ محمد، آیت ۳۲)

آیتوں میں کفر، ارتداد، جحود اور ضلالت علم کے ساتھ آیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ ان آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی چیز کے حق ہونے کے بارے میں علم رکھنا، حصول ایمان کے لئے کافی نہیں ہے اور اس علم کے مالک شخص کو مؤمن نہیں کہا جاسکتا ہے لیکن اگر وہ اپنے علم پر التزام کرے تو اس صورت میں اسے مؤمن کہا جاسکتا ہے۔ یعنی اگر کسی کو اس بات کا علم ہے کہ کوئی خدا ہے اور اس کے علاوہ کوئی اور نہیں ہے اور وہ اپنے علم پر التزام بھی رکھتا ہے تو اسے مؤمن کہا جائے گا لیکن اگر اسے علم ہے لیکن التزام نہیں ہے تو ایسے شخص کو عالم کہا جائے گا مؤمن نہیں۔[1] ایمان کے مقابلہ میں کفر آتا ہے لہٰذا وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوا فَمِنْهُمْ مَنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَنْ كَفَرَ[2] جیسی آیتوں میں کفر کا مطلب علم رکھنے کے بعد کافر ہونا یا سر تسلیم خم نہ کرنا ہے۔ حق کے واضح ہونے کے بعد جو اس کے سامنے سر تسلیم خم کرے گا وہ مؤمن اور جو اسے چھپائے گا اسے کافر کہا جائے گا۔ قرآنی آیتوں کے مطابق ایمان و کفر کی بنیاد پر ہی جنت و جہنم کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اس نکتہ کی طرف توجہ دینا بھی ضروری ہے کہ ایمان اور سر تسلیم خم کرنا بھی علم و یقین کے بعد ہی ممکن ہے جیسا کہ سورہ اسرا کی آیت ۱۰۷-۱۰۹ میں آیا ہے۔ مضبوط ایمان علم کے سائے میں ہی ممکن ہے اور اس سے بالاتر مراحل میں علم ایمان سے مدد لیتا ہے۔ حقیقت میں یہ عالم افراد ہیں جو نہ صرف اللہ تعالی پر ایمان لے آتے ہیں بلکہ آیات الٰہی کے سامنے ہر لمحہ ان کے خضوع و خشوع میں اضافہ ہوتا ہے۔

وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ۔ ترجمہ: ان لوگوں نے ظلم اور غرور کے جذبہ کی بنائی پر انکار کر دیا تھا ورنہ ان کے دل کو بالکل یقین تھا پھر دیکھو کہ ایسے مفسدین کا انجام کیا ہوتا ہے۔ (سورہ نمل، آیت ۱۴)

أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَـٰهَهُ هَوَاهُ وَأَضَلَّهُ اللَّـهُ عَلَىٰ عِلْمٍ وَخَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَاوَةً فَمَن يَهْدِيهِ مِن بَعْدِ اللَّـهِ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ۔ ترجمہ: کیا آپ نے اس شخص کو بھی دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش ہی کو خدا بنالیا ہے اور خدا نے اسی حالت کو دیکھ کر اسے گمراہی میں چھوڑ دیا ہے اور اس کے کان اور دل پر مہر لگادی ہے اور اس کی آنکھ پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور خدا کے بعد کون ہدایت کر سکتا ہے کیا تم اتنا بھی غور نہیں کرتے ہو۔ (سورہ جاثیہ، آیت ۲۳)

۱۔ المیزان فی تفسیر القرآن، ج ۱۸، ص ۳۹۰

۲۔ سورہ بقرہ، آیت ۲۵۳

ایمان واسلام

قرآنی نقطہ نظر سے مسلمان اور مؤمن میں فرق ہوتا ہے[۱]۔ سورہ حجرات کی آیت نمبر چودہ اور پندرہ میں یہ فرق واضح طور بیان کیا گیا ہے[۲]۔ اس سورہ میں کچھ اعراب کا واقعہ بیان کیا گیا ہے جو رسول خداؐ کی خدمت میں آئے اور خود کو مؤمن بتلایا۔ قرآن پیغمبر اسلامؐ کو خطاب کرتے ہوئے ان کے جواب میں فرماتا ہے کہ: ان سے کہو کہ تم ایمان نہیں لائے ہو بلکہ اسلام لائے ہو۔ اس آیت میں جس اسلام کا ذکر ہوا ہے وہ زبان و اعضا و جوارح سے قائم ہوتا ہے، جب کوئی شخص اسلام کا اقرار کرتا ہے اور شہادتین زبان پر جاری کرتا ہے اور اوامر الٰہی کو انجام دیتا ہے چاہے وہ تہ دل سے اس کی حقانیت پر ایمان نہ رکھتا ہو۔ اس طرح کے مسلمان ہونے کا اثر اسلامی معاشرہ میں یہ ہوگا اس شخص کا جان و مال محترم ہے، اس سے شادی جایز ہے اور وہ دوسرے مسلمانوں سے میراث پاتا ہے اور دوسرے بھی اس سے میراث پاتے ہیں۔[۳]

۱۔ إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِينَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِينَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّائِمِينَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُم مَّغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا۔ ترجمہ: بیشک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور مومن مرد اور مومن عورتیں اور اطاعت گزار مرد اور اطاعت گزار عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں اور صابر مرد اور صابر عورتیں اور فروتنی کرنے والے مرد اور فروتنی کرنے والی عورتیں اور صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اور اپنی عفّت کی حفاظت کرنے والے مرد اور عورتیں اور خدا کا بکثرت ذکر کرنے والے مرد اور عورتیں. اللہ نے ان سب کے لئے مغفرت اور عظیم اجر مہیا کر رکھا ہے۔ (سورہ احزاب، آیت ۳۵)

۲۔ قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُل لَّمْ تُؤْمِنُوا وَلَكِن قُولُوا أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ وَإِن تُطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَا يَلِتْكُم مِّنْ أَعْمَالِكُمْ شَيْئًا إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٤﴾ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ۔ ترجمہ: یہ بدو عرب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں تو آپ کہہ دیجئے کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ یہ کہو کہ اسلام لائے ہیں کہ ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے اور اگر تم اللہ اور رسول کی اطاعت کروگے تو وہ تمہارے اعمال میں سے کچھ بھی کم نہیں کرے گا کہ وہ بڑا غفور اور رحیم ہے۔ صاحبان ایمان صرف وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آئے اور پھر کبھی شک نہیں کیا اور اس کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد بھی کیا در حقیقت یہی لوگ اپنے دعویٰ ایمان میں سچّے ہیں۔

۳۔ المیزان فی تفسیر القرآن، ج۱۸، ص ۴۹۴

اسلام کا مطلب ہے اپنے افعال کو دین کے ڈھانچے میں ڈھالنا مثلاً کلمہ شہادتین پڑھنا لیکن اس کے برخلاف ایمان تسلیم قلبی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے جس کا اثر فرد کے افعال سے ظاہر ہوتا ہے۔ سورہ حجرات کی پندرہویں آیت[1] کے مطابق وہ شخص مؤمن ہے جس کے قلب میں دین داخل ہو چکا ہے اور وہ اپنے علم و یقین کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ظاہر ہے کہ سر تسلیم خم کرنا عمل کے ہمراہ بلکہ عین عمل ہوتا ہے۔ ثم لم یرتابو سے پتہ چلتا ہے کہ مؤمن کبھی اپنے ایمان کی حقانیت پر شک و تردید نہیں کرتا ہے اور اپنے ایمان پر ثابت قدم رہتا ہے۔[2]

دوسری طرف ممکن ہے انسان مادی منافع کی وجہ سے مسلمان ہو جائے لیکن ایمان ہمیشہ معنوی دلائل کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے[3] اور علم و آگاہی سے منشعب ہوتا ہے۔[4] بعض روایتوں میں اسلام کو اقرار لفظی اور ایمان کو عمل کے ساتھ اقرار سے تعبیر کیا گیا ہے۔[5] اسلام فرد کے کردار سے ظاہر ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے دل میں اس کی تصدیق نہ ہو اور فرد صرف ظاہری طور بعض اعمال کو بجالا رہا ہو جو اسلام کی علامت ہیں اور وہ ان کے بارے کوئی شناخت نہیں رکھتا ہے اور قلباً انہیں تسلیم نہیں کرتا ہے۔ اس کے برخلاف ایمان علم و یقین کے بعد کا مرحلہ ہے جب فرد علم و یقین کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہے اور اسے مکمل اطمینان ہوتا ہے۔[6]

ایمان کے کچھ سماجی اثرات مرتب ہوتے ہیں جو اسلام لانے پر مرتب نہیں ہوتے ہیں، جیسے:

۱. ایک دوسرے سے دوستانہ تعلقات میں اضافہ: وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۔ترجمہ: اور جو کچھ انہیں دیا گیا ہے اپنے دلوں

۱۔ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ

۲۔ المیزان فی تفسیر القرآن، ج ۱۸، ۴۹۴

۳۔ پیغمبر اسلامؐ فرماتے ہیں: الاسلام علانیہ والایمان فی القلب، اسلام علانیہ ہوتا ہے لیکن ایمان دل میں ہوتا ہے۔

۵۔ امام صادقؑ فرماتے ہیں: اسلام لانے سے انسان کا خون محفوظ ہوتا ہے، ادائے امانت لازم ہے اور اس سے شادی جائز ہو جاتی ہے لیکن ثواب ایمان پر ملتا ہے۔

۵۔ الایمان اقرار و عمل والاسلام اقرار بلا عمل

۶۔ تفسیر نمونہ، ج ۲۲، ص ۲۱۰۔۲۱۴

میں اس کی طرف سے کوئی ضرورت نہیں محسوس کرتے ہیں اور اپنے نفس پر دوسروں کو مقدم کرتے ہیں چاہے انہیں کتنی ہی ضرورت کیوں نہ ہو۔[۱]

۲. شخصیت کا استحکام: هُوَ الَّذِي أَنزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ لِيَزْدَادُوا إِيمَانًا مَّعَ إِيمَانِهِمْ۔ ترجمہ: وہی خدا ہے جس نے مومنین کے دلوں میں سکون نازل کیا ہے تاکہ ان کے ایمان میں مزید اضافہ ہو جائے۔[۲]

۳. فرد اور معاشرہ میں احساس تحفظ: يَا عِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَا أَنتُمْ تَحْزَنُونَ۔ الَّذِينَ آمَنُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا مُسْلِمِينَ۔ ترجمہ: میرے بندو آج تمہارے لئے نہ خوف ہے اور نہ تم پر حزن وملال طاری ہوگا۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہماری نشانیوں پر ایمان قبول کیا ہے اور ہمارے اطاعت گزار ہو گئے ہیں۔[۳]

۴. قومی اور تہذیبی رشتوں میں مضبوطی: وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ مِن قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔ ترجمہ: اور جن لوگوں نے دارالہجرت اور ایمان کو ان سے پہلے اختیار کیا تھا وہ ہجرت کرنے والوں کو دوست رکھتے ہیں اور جو کچھ انہیں دیا گیا ہے اپنے دلوں میں اس کی طرف سے کوئی ضرورت نہیں محسوس کرتے ہیں اور اپنے نفس پر دوسروں کو مقدم کرتے ہیں چاہے انہیں کتنی ہی ضرورت کیوں نہ ہو.... اور جسے بھی اس کے نفس کی حرص سے بچالیا جائے وہی لوگ نجات پانے والے ہیں۔[۴]

۵. شناخت میں اضافہ: وَمَن يُؤْمِن بِاللَّهِ يَهْدِ قَلْبَهُ۔ ترجمہ: اور جو صاحبِ ایمان ہوتا ہے خدا اس کے دل کی ہدایت کر دیتا ہے۔[۵]

۱۔ سورہ حشر، آیت ۹
۲۔ سورہ فتح، آیت ۴
۳۔ سورہ زخرف، آیت ۶۹
۴۔ سورہ حشر، آیت ۹
۵۔ سورہ تغابن، آیت ۱۱

۶. سختیوں اور پریشانیوں کے مقابلہ میں حوصلہ افزائی: مَا أَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّـهِ۔ترجمہ: کوئی مصیبت نازل نہیں ہوتی ہے مگر خدا کی اجازت سے۔[۱]

۷. تہذیبی بقا کے اسباب فراہم کرنا: مَا آمَنَتْ قَبْلَهُم مِّن قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا أَفَهُمْ يُؤْمِنُونَ۔ترجمہ: ان سے پہلے ہم نے جن بستیوں کو سرکشی کی بناپر تباہ کرڈالا وہ تو ایمان لائے نہیں یہ کیا ایمان لائیں گے۔[۲]

۸. سماجی تعلقات میں تمایز کے اسباب فراہم کرنا: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قِيلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوا فِي الْمَجَالِسِ فَافْسَحُوا يَفْسَحِ اللَّـهُ لَكُمْ ۖ وَإِذَا قِيلَ انشُزُوا فَانشُزُوا يَرْفَعِ اللَّـهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ ۚ وَاللَّـهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ۔ترجمہ: ایمان والو جب تم سے مجلس میں وسعت پیدا کرنے کے لئے کہا جائے تو دوسروں کو جگہ دیدو تاکہ خدا تمہیں جنّت میں وسعت دے سکے اور جب تم سے کہا جائے کہ اُٹھ جاؤ تو اُٹھ جاؤ کہ خدا صاحبان ایمان اور جن کو علم دیا گیا ہے ان کے درجات کو بلند کرنا چاہتا ہے اور اللہ تمہارے اعمال سے خوب باخبر ہے۔[۳]

۹. گناہ اور انحراف کے مواقع ختم کرنا: قُلْ يَا عِبَادِ الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا رَبَّكُمْ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَـٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۗ وَأَرْضُ اللَّـهِ وَاسِعَةٌ ۗ إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ۔ترجمہ: کہہ دیجئے کہ اے میرے ایماندار بندو! اپنے پروردگار سے ڈرو. جو لوگ اس دار دنیا میں نیکی کرتے ہیں ان کے لئے نیکی ہے اور اللہ کی زمین بہت وسیع ہے بس صبر کرنے والے ہی وہ ہیں جن کو بے حساب اجر دیا جاتا ہے۔[۴]

ایک بات قابل غور ہے کہ اسلام و ایمان کا فرق اسی وقت سامنے آئے گا جب ان دونوں لفظ کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں استعمال کیا جائے لیکن اگر یہ دونوں لفظ ایک ساتھ استعمال ہوتے ہیں تو ممکن ہے کہ

۱۔ سورہ تغابن، آیت ۱۱

۲۔ سورہ انبیاء، آیت ۶

۳۔ سورہ مجادلہ، ۱۱

۴۔ قُلْ يَا عِبَادِ الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا رَبَّكُمْ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَـٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۗ وَأَرْضُ اللَّـهِ وَاسِعَةٌ ۗ إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ ۔(سورہ زمر، آیت ۱۰)

اسلام ایمان کی جگہ پر استعمال ہو۔ اسی وجہ سے بہت سی آیتوں[1] میں ایمان اسلام کے معنی میں اور اسلام ان دونوں کی جگہ استعمال ہوتا ہے۔[2]

عمل صالح: دینداری کا دوسرا پہلو

عمل اور فعل میں فرق: قرآن کریم میں لفظ عمل اور فعل الگ الگ معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ عمل اور فعل میں قرآنی نقطہ نظر سے یہ فرق ہے کہ عمل فکر و اختیار یعنی علم و شناخت کے ساتھ انجام پاتا ہے جب کہ یہ ممکن ہے کہ فعل عقل و اختیار کے ساتھ انجام نہ پائے۔ دوسری طرف فعل انسان اور دوسرے موجودات کے لئے استعمال ہو سکتا ہے جب کہ عمل صرف انسان کے لئے استعمال ہوا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ عمل قصد و نیت اور ارادہ کے ساتھ انجام پاتا ہے جب کہ فعل ممکن ہے قصد و نیت کے ساتھ انجام نہ پائے[3] یعنی عمل معرفت، مرضی اور اختیار کی بنیاد پر ہوتا ہے۔

۱۔ فَقَالُوا أَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عَابِدُونَ۔ ترجمہ: تو ان لوگوں نے کہہ دیا کہ کیا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں جب کہ ان کی قوم خود ہماری پرستش کر رہی ہے۔ (سورہ مؤمنون، ۴۷)
وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَكِن لَّا يَعْلَمُونَ۔ ترجمہ: جب ان سے کہا جاتا ہے کہ دوسرے مومنین کی طرح ایمان لے آؤ تو کہتے ہیں کہ ہم بے وقوفوں کی طرح ایمان اختیار کر لیں حالانکہ اصل میں یہی بے وقوف ہیں اور انہیں اس کی واقفیت بھی نہیں ہے۔ (سورہ بقرہ، آیت ۱۳)
وَقُلْ آمَنتُ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ مِن كِتَابٍ۔ ترجمہ: اور یہ کہیں کہ میرا ایمان اس کتاب پر ہے جو خدا نے نازل کی ہے۔ (سورہ شوری، آیت ۱۵)
أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ۔ ترجمہ: کیا تم کتاب کے ایک حصّہ پر ایمان رکھتے ہو اور ایک کا انکار کر دیتے ہو۔ (سورہ بقرہ، آیت ۸۵)
آمَنَّا بِاللَّهِ وَاشْهَدْ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ۔ ترجمہ: اس پر ایمان لائے ہیں اور آپ گواہ رہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ (سورہ آل عمران، آیت ۵۲)
وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَانًا وَتَسْلِيمًا۔ ترجمہ: اور اس ہجوم نے ان کے ایمان اور جذبہ تسلیم میں مزید اضافہ ہی کر دیا۔ (سورہ احزاب، ۲۲)
إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ۔ ترجمہ: بیشک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور مومن مرد اور مومن عورتیں۔ (سورہ احزاب، آیت ۳۵)

۲۔ واژہ شناسی قرآن، ج ۳، ص ۳۰۱

۳۔ واژہ شناسی قرآن، ج ۵، ص ۴۵، المفردات فی غریب القرآن، ج ۱، ص ۵۸۷

سورہ ہود کی ٤٦ آیت میں حضرت نوح کے بیٹے کو عمل غیر صالح کہا گیا ہے[١] جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شناخت، فکر اور ارادہ کے ہمراہ انجام پانے والے اعمال، انسان کی حقیقت کی تشکیل کرتے ہیں۔ سورہ آل عمران آیت نمبر ١٦٣[٢]، سورہ نجم کی آیت نمبر ٣٩[٣]، سورہ مدثر کی آیت نمبر ٣٨[٤]، سورہ نور کی آیت نمبر ٣٩[٥]، سورہ نباء کی آیت نمبر ٢٦[٦]، سورہ زمر کی آیت نمبر ٩[٧]، سورہ انعام کی آیت نمبر ١٠٨[٨] اور سورہ کہف کی آیت نمبر ٣٠[٩] میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ سورہ جاثیہ کی آیت نمبر ٢٩ اللہ تعالی اس

١۔ انه عمل غیر صالح

٢۔ هُمْ دَرَجَاتٌ عِندَ اللَّـهِ ۗ وَاللَّـهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ۔ ترجمہ: سب کے پیش پروردگار درجات ہیں اور خدا سب کے اعمال سے باخبر ہے۔

٣۔ وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ۔ تر[illegible]اتنا ہی ہے جتنی اس نے کوشش کی ہے۔

٤۔ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ۔ ترجمہ: ہر نفس اپنے اعمال میں گرفتار ہے۔

٥۔ وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُ[illegible] فَوَفَّاهُ حِسَابَهُ ۗ وَاللَّـهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ۔ ترجمہ: اور جن لوگوں نے کفر اختیار کرلیا ان کے اعمال اس ریت کے مانند ہیں جو چٹیل میدان میں ہو اور پیاسا اسے دیکھ کر پانی تصور کرے اور جب اس کے قریب پہنچے تو کچھ نہ پائے بلکہ اس خدا کو پائے جو اس کا پورا پورا حساب کردے کہ اللہ بہت جلد حساب کرنے والا ہے۔

٦۔ جَزَاءً وِفَاقًا۔ ترجمہ: یہ ان کے اعمال کا مکمل بدلہ ہے۔

٧۔ أَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ آنَاءَ اللَّيْلِ سَاجِدًا وَقَائِمًا يَحْذَرُ الْآخِرَةَ وَيَرْجُو رَحْمَةَ رَبِّهِ ۗ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۗ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ۔ ترجمہ: کیا وہ شخص جو رات کی گھڑیوں میں سجدہ اور قیام کی حالت میں خدا کی عبادت کرتا ہے اور آخرت کا خوف رکھتا ہے اور اپنے پروردگار کی رحمت کا امیدوار ہے.... کہہ دیجئے کہ کیا وہ لوگ جو جانتے ہیں ان کے برابر ہو جائیں گے جو نہیں جانتے ہیں۔ اس بات سے نصیحت صرف صاحبان عقل حاصل کرتے ہیں۔

٨۔ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّـهِ فَيَسُبُّوا اللَّـهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ كَذَٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِم مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔ ترجمہ: اور خبردار تم لوگ انہیں برا بھلا نہ کہو جن کو یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہیں کہ اس طرح یہ دشمنی میں بغیر سمجھے بوجھے خدا کو برا بھلا کہیں گے ہم نے اسی طرح ہر قوم کے لئے اس کے عمل کو آراستہ کردیا ہے اس کے بعد سب کی بازگشت پروردگار ہی کی بارگاہ میں ہے اور وہی سب کو ان کے اعمال کے بارے میں باخبر کرے گا۔

٩۔ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ إِنَّا لَا نُضِيعُ أَجْرَ مَنْ أَحْسَنَ عَمَلًا۔ ترجمہ: یقینا جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے نیک اعمال کئے ہم ان لوگوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتے ہیں جو اچھے اعمال انجام دیتے ہیں۔

نکتہ پر تاکید کرتا ہے کہ ہم تمہارے اعمال کو برابر لکھوار ہے تھے ' . . . اور سورہ زلزال کی آیت نمبر آٹھ میں ارشاد ہوتا ہے وَمَن يَعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُۥ۔ ترجمہ: اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہے وہ اسے دیکھے گا۔ ان ساری آیتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے عمل ہی انسانی حقیقت ہے۔

عمل صالح

عمل صالح ایک ایسا اچھا عمل ہے جسے قربت الی اللہ انجام دیا جائے۔ قرآن مجید میں پچاس سے زائد مقامات پر آمنو و عملوا الصالحات کا ذکر ایک ساتھ ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی نقطہ نظر سے عمل اسی وقت حایز اہمیت الہی ہوگا جب وہ اللہ پر ایمان کے ساتھ انجام پائے[2] لہذا ایمان کے ساتھ ساتھ ہر اچھا کام جو عدل و انصاف کے موازین کے ساتھ اور رضای الہی کے لئے انجام پائے اسے الصالحات میں شامل کیا جا سکتا ہے چاہے وہ شرع کی طرف سے معین کیا گیا ہو جیسے عبادات و شرعیات یا معین نہ کیا گیا ہو[3]۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ کسی بھی کام کی روح اور اصل ایمان ہے اور عمل صالح اس کے ساتھ (نہ کہ اس کے بغیر) حقیقت کا جامہ پہنتا ہے یعنی قرآنی نقطہ نظر سے بغیر ایمان کے عمل صالح ممکن نہیں ہے۔ عبادات، شرعیات، اخلاقیات، اور سارے دوسرے کام جو اللہ کے لئے اور عدل و انصاف کی بنیاد پر انجام پاتے ہیں وہ سب اعمال صالحہ میں شامل ہیں۔[4]

۱۔ هَـٰذَا كِتَابُنَا يَنطِقُ عَلَيۡكُم بِالۡحَقِّ إِنَّا كُنَّا نَسۡتَنسِخُ مَا كُنتُمۡ تَعۡمَلُونَ۔ ترجمہ: یہ ہماری کتاب (نامۂ اعمال) ہے جو حق کے ساتھ بولتی ہے اور ہم اس میں تمہارے اعمال کو برابر لکھوار ہے تھے۔

۲۔ مَّثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمۡ أَعۡمَالُهُمۡ [illegible] شَيۡءٍ ذَٰلِكَ هُوَ الضَّلَالُ الۡبَعِيدُ۔ ترجمہ: جن لوگوں نے اپنے پروردگار کا انکار کیا ان کے اعمال کی مثال اس راکھ کی ہے جسے اندھڑ کے دن کی تند ہوا اڑا لے جائے کہ وہ اپنے حاصل کئے ہوئے پر بھی کوئی اختیار نہ رکھیں گے اور یہی بہت دور تک پھیلی ہوئی گمراہی ہے۔ (سورہ ابراہیم، آیت ۱۸)

۳۔ واژہ شناسی قرآن، ج۵، ص۴۵

۴۔ سنی اور شیعہ دونوں نے رسول خدا (ص) سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا: انّما الاعمال بالنیّات.

منابع ومآخذ

قرآن کریم

❖ آرون، ریمون، مراحل اساسی اندیشہ در جامعہ شناسی، ترجمہ باقر پرہام، بی جا: شرکت سہامی انتشار، ۱۳۷۰

❖ آلوسی، سید محمود، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۵۱

❖ استراس، آنسلم، کوربین، جولیت، اصول روش تحقیق کیفی نظریہ مبنایی، ترجمہ محمدی بیوک، پژوہشگاہ علوم انسانی ومطالعات فرہنگی، تہران، ۱۳۸۷

❖ بحرانی، سید ہاشم، البرہان فی تفسیر القرآن، بنیاد بعثت، تہران، ۱۴۱۶

❖ حسن زادہ آملی، حسن، عیون مسائل نفس وشرح آن، انتشارات قیام، قم، ۱۳۸۰

❖ حسن زادہ آملی، انسان وقرآن، انتشارات قیام، قم، ۱۳۸۱

❖ حسن زادہ آملی ماٴثر آثار، تدوین: داوود صمدی آملی، بی جا

❖ خدایاری فرد، محمد وہمکاران، آمادہ سازی مقیاس دنیداری وارزیابی دینداری اقشار مختلف جامعہ ایران، انتشارات دانشگاہ تہران، ۱۳۸۸

❖ دورکیم، امیل، صور بنیانی حیات دینی، ترجمہ باقر پرہام، نشر مرکز، ۱۳۸۳

❖ راغب اصفہانی، حسین بن محمد، المفردات فی غریب القرآن، دار العلم، الدار الشامیہ، دمشق، بیروت، ۱۴۱۲

❖ سراج زادہ، سید حسین، پویافر، محمد رضا مقایسہ تجربی سنجہ ہای دینداری، مجلّہ جامعہ شناسی ایران، دورہ ہشتم، ش ۴، ۱۳۸۷

❖ شجاعی زند، علی رضا، مدلی برای سنجش مراتب دینداری در ایران، در جامعہ شناسی ایران، دورہ ششم، ش ۱، ۱۳۸۴

❖ تبار شناسی، تجربہ دینی در مطالعات دینداری، تحقیقات فرہنگی، دورہ دوم، ش ۶، ۱۳۸۸

❖ صدیق سروستانی، رحمت اللہ فرا تحلیل مطالعات انجام شدہ در حوزہ آسیب شناسی اجتماعی در ایران، مطالعات جامعہ شناختی، ش ۱۵

❖ طباطبائی، سید محمد حسین، ترجمہ تفسیر المیزان، ترجمہ محمد باقر موسوی ہمدانی، دفتر جامعہ مدرسین حوزہ علمیہ قم، ۱۳۷۴

❖ طبرسی، فضل بن حسن، مجمع البیان فی تفسیر القرآن، ناصر خسرو، تہران، ۱۳۷۲

❖ تفسیر جوالجامع، انتشارات دانشگاہ تہران ومدیریت حوزہ علمیہ قم، تہران، ۱۳۷۷

❖ فلیک، اووہ، درآمدی بر تحقیق کیفی، ترجمہ ہادی جلیلی، نشر نی، تہران، ۱۳۸۷

❖ قرشی، سید علی اکبر، واژہ شناسی قرآن، دار الکتب الاسلامیہ، تہران، ۱۳۷۱

❖ مکارم شیرازی، ناصر تفسیر نمونہ، دار الکتب الاسلامیہ، تہران، ۱۳۷۴

دعا کی زبان وانداز بیان کا تجزیہ

مؤلف: ڈاکٹر محمد جواد سلمانپور
مترجم: مولانا مقداد حیدر روحانی

دعا تمام انسانوں اور تہذیبوں میں مشترک اور شیعی تہذیب میں ایک خاص مقام کی حامل ہے۔ یہ زبا ن فطری اور تاریخی زبان اور حقیقی دعا کی ترجمان ہے جو فقیر محض اور غنی مطلق یعنی خداوند متعال کے بیچ ایک خاص ارتباط برقرار کرتی ہے۔ دعا کی زبان کی حقیقت نے اس زبان کو ایک ایسی خصوصیت عطا کی ہے جو اسے دوسری زبانوں سے جدا اور زبان عرفان سے نزدیک کرتی ہے۔ اس مضمون میں ائمہ اطہارؑ سے منقول دعاؤں خصوصاً حضرت امام سجادؑ کی صحیفہ سجادیہ سے فیض حاصل کرتے ہوئے، زبان دعا کی خصوصیتوں کو بیان کیا جائے گا۔

زبان دعا کی تاریخ، تاریخ بشر کی ہمزاد

دعا کی تاریخ انسان کی پیدائش اور ہبوط جناب آدم سے شروع ہوتی ہے۔ ضرورت کا احساس اور کمزوری ہمیشہ انسان کے ساتھ رہی ہے اور انسان شروع سے ہی اپنے آرام اور بقا کے لئے لازوال قدرت کی پناہ میں جانا ضروری سمجھتا رہا ہے اسی وجہ سے بشریت کی تاریخ کبھی بھی مبدا عالم پر توجہ اور اس کی درگاہ میں دعا سے خالی نہیں رہی۔ آیات وروایات میں حضرت آدمؑ اور حوّا کے ہبوط کے بعد کی بعض دعائیں بیان ہوئی ہیں[1]۔ اسی طرح آیات وروایات میں دوسرے انبیائے الٰہی اور ان کی امتّوں کی زبانی بہت سی دعائیں نقل ہوئی ہیں۔ یہی دعاء اور عبادت انسانی حیات و تہذیب کے خاص باب کی شروعات ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ دعا حیات انسانی کا جزء لاینفک ہے اور چاہے انسان کفر اور بت پرستی میں غرق ہو پھر بھی دعا کی زبان، اس کی زندگی کے ایک حصّہ میں بیان کے لئے زبان کھولتی ہے۔

۱۔ فعال عراقی، حسین، داستان ہای قرآن وتاریخ انبیا در المیزان، ج ۱، ص ۱۲۵

دعا کی زبان، فطرت میں پوشیدہ صلاحیت

یہ ثابت ہو چکا ہے کہ جملہ مخلوقات بشمول انسان کی حقیقت غنی مطلق کے سامنے اظہار فقر و نیاز کے علاوہ کچھ نہیں ہے[1] اور یہ فقر وقتی نہیں ہے بلکہ ذاتی اور دائمی ہے اور فقر، فقیر اور مفتقرٌبہ ایک ہی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں فقر عین تحقق ذات مخلوقات ہے اور اسی کے ذریعہ وہ خالق سے مرتبط ہیں اور اپنے وجود کو بچانے کے لئے خالق کی طرف رخ کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ اس لئے ایسے وجود کی ذات سے ہر گز دعا کو الگ نہیں کیا جاسکتا ہے اگر چہ وہ اس حقیقت سے غافل ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ انسان اپنی خلقت کی اصل اور بنیاد سے ہی ہمیشہ حالت دعا میں ہے جیسے کہ دعائے تکوینی کائنات میں گونج رہی ہے۔ اکثر انسان شہوت، قساوت اور جہالت کی وجہ سے اس زبان کے بیان سے غافل ہیں لیکن مصائب کے بھنور میں پھنس جانے کے بعد جب پردے ہٹ جاتے ہیں تو فطری انحصار اور ذاتی فقر اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے اور اس وقت انسان بیدار ہوتا ہے، اضطرار کی حالت میں دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتا ہے، اللہ کی بارگاہ میں پناہ لیتا ہے اور پورے خلوص کے ساتھ "یارَبّ" کہتا ہے:

هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتَّىٰ إِذَا كُنتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِم بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوا بِهَا جَاءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ وَجَاءَهُمُ الْمَوْجُ مِن كُلِّ مَكَانٍ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ لَئِنْ أَنجَيْتَنَا مِنْ هَٰذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ۔ ترجمہ: وہ خدا وہ ہے جو تمہیں خشکی اور سمندر میں سیر کراتا ہے یہاں تک کہ جب تم کشتی میں تھے اور پاکیزہ ہوائیں چلیں اور سارے مسافر خوش ہو گئے تو اچانک ایک تیز ہوا چل گئی اور موجوں نے ہر طرف سے گھیرے میں لے لیا اور یہ خیال پیدا ہو گیا کہ چاروں طرف سے گھر گئے ہیں تو دین خالص کے ساتھ اللہ سے دعا کرنے لگے کہ اگر اس مصیبت سے نجات مل گئی تو ہم یقینا شکر گزاروں میں ہو جائیں گے۔[2]

۱۔ صدر المتالہین، محمد بن ابراہیم، الحکمۃ المتعالیہ فی الاسفار الاربعہ، ج ۲، ص ۱۳۱؛ ج ۸، ص ۱۱۰ و ۱۱۱

۲۔ سورہ یونس آیت ۲۲

زبان دعا عالم بشریت کی مشترکہ زبان

دعا کی تاریخ ،اس کی فطری منشا اور زبان دعا کے تجزیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا کی زبان ،آفاقی اور تمام انسانوں کے بیچ واحد مشترکہ زبان ہے جسے سکھانے کی ضرورت نہیں ہے اور نسل ، جغرافیائی سرحدیں اور زمانہ کے اختلافات کے باوجود یہ زبان تمام انسانوں میں مساوی طور پر موجود ہے۔التفات اور توجہ اس استعداد کے کھلنے اور بالفعل ہونے کا اہم ترین راستہ ہے اور اگر دینی رہنماؤں نے دعا کے سلسلہ میں کچھ باتیں بتائی ہیں تو وہ زبان دعا کی تعلیم کے لئے نہیں ہے بلکہ اس کی افادیت کو ظاہر کرنے کے لئے ہے۔

مختلف ادیان و ملل میں زبان دعا کا مشترک ہونا، وحدت بشریت کا اہم محور ہے اور اسے ہر دور میں مختلف انسانوں کی ہمدلی کی زبان قرار دیا جاسکتا ہے۔ دعا کی زبان تمدنوں اور مذاہب کے بیچ گفتگو کا بہترین ذریعہ ہے جو ابھی تک غفلت کا شکار تھا۔ یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ اگر آج بہت سی عرفانی تعلیمات مختلف ادیان میں ایک جیسی ہیں یا ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں یا اگر مثنوی معنوی میں مولانا روم کا بیان مختلف ادیان کے ماننے والوں میں خصوصاً یورپ اور امریکہ میں مقبول ہے تو یہ اس وجہ سے ہے کہ اس میں دعا کی زبان سے کام لیا گیا ہے اور زبان عرفان ،زبان دعا سے بہت قریب بلکہ اس کی ہمزاد ہے۔

زبان دعا کی حقیقت

دعا کی زبان کا بیان وجودی

زبان دعا الفاظ اور تکلم جیسی نہیں ہے جو فضائے دہن سے نکلتی ہے، اسی طرح مفاہیم کو پیش کرنے والے نشانوں اور علامتوں کی طرح بھی نہیں ہے، بلکہ یہ انسانی وجود کا ایسا عنصر ہے جو تمام انسانوں میں اختلاف زبان کے باوجود مشترک ہے۔ دعا کی زبان میں کیونکہ حقیقی مخاطب خداوند متعال ہے لہٰذا الفاظ موضوعیت نہیں رکھتے، اگر چہ جب دعا الفاظ کے پیکر میں زبان پر جاری ہو کر خداوند متعال کے سامنے پیش ہوتی ہے تو زیادہ تاثیر گذار ہوتی ہے اور اسی وجہ سے ہمارے ائمہ اطہارؑ نے سفارش کی ہے کہ ہم اپنی ضرورتوں کو اللہ تعالی کی بارگاہ میں الفاظ کی شکل میں اور زبان سے پیش کریں۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :

اِنَّ اللّٰہَ تَبَارَکَ وَتَعَالیٰ یَعلم مایُرید العبد اذا دعاہ ولکنہ یُحب ان تبثَّ الیہ الحوائج فاذا دعوت فسم حَاجَتُکَ۔ ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ یہ جانتا ہے کہ بندہ دعا میں کیا طلب کر رہا ہے لیکن وہ چاہتا ہے کہ اس کی بارگاہ میں اپنی حاجت کو بیان کیا جائے۔[۱]

زبان دعا، عام زبان سے برتر

دعا کی زبان کو بہتر سمجھنے کے لئے ہم عام زبان کا تجزیہ کرتے ہوئے دعا کی زبان سے اس کا موازنہ کریں گے۔ عام زبان میں کبھی کبھی کلمات اور الفاظ بغیر اس کے کہ متکلم کے ذہن میں اس کا مفہوم بھی ہو زبان سے نکلتے ہیں، اور متکلم بنیادی طور پر ان کے استعمال کا ارادہ نہیں رکھتا۔ ٹھیک ایسے جیسے نیند میں انسان بڑبڑاتا ہے لیکن ان الفاظ کا کوئی معنی و مقصد نہیں ہوتا ہے، اس طرح سے اللہ تعالی کے سامنے درخواست پیش کرنے کو دعا نہیں کہتے ہیں۔ امیر المونینؑ فرماتے ہیں:

اذا دعا احدکم للمیت فلا یدعو لہ وقلبہ لاہ ولکن لیجتھد لہ فی الدعاء۔[۲]

دعا کے دوسرے مرحلہ میں دعا کرنے والا الفاظ کے معانی سے پوری طرح واقف ہوتا ہے اور وہ اس خاص معنی کا قصد بھی کرتا ہے۔ اس مرحلہ کو علمائے اصول فقہ دلالت تصدیقی کے نام جانتے ہیں[۳]۔ دوسروں سے ارتباط برقرار کرنے کے لئے الفاظ کے ذہنی معنی ہی کفایت کرتے ہیں اور مخاطب، متکلم کے الفاظ کے ظاہری معنی کو اس سے نسبت دے سکتا ہے۔ الفاظ کے یہ ذہنی معنی ممکن ہے متکلم کے دل میں بھی ہو اور ہو سکتا ہے اس کا دل سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اس طرح کی دعا بھی حقیقی دعا نہیں ہے اور دعا کرنے والا فقط عام زبان میں دعا کرتا ہے اور زبان دعا سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ روایتوں میں اسے غافل یا ساہی کی دعا کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

عام زبان میں الفاظ معانی ذہنی پر تکیہ کرتے ہیں لیکن اس کے بعد دوسرا مرحلہ بھی ہوتا ہے جب معنی نفس کے اندر عینی طور پر موجود ہوتا ہے اور دعا اس وجود عینی کی بنیاد پر ظاہر ہوتی ہے نہ کہ وجود ذہنی کی بنیاد پر۔ ایسے میں پہلے زبان دعا جو زبان عرفان سے قریب ہے، محقق ہوتی ہے اور پھر ممکن ہے کہ مانوس الفاظ

۱۔ کلینی، محمد بن یعقوب، اصول کافی، ج ۴، ص ۲۲۵

۲۔ ایضاً، ص ۲۲

۳۔ نائینی، میرزا محمد حسین، فوائد الاصول، ج ۳، ص ۱۴۰ و ج ۴، ص ۱۶۷

کے قالب میں زبان پر بھی جاری ہو جائے لیکن یہ الفاظ سارے معانی کو عام بشر کے لئے بیان نہیں کر پاتے ہیں اور مخاطبان بشری اس دعا کے الفاظ سے اپنی وسعت کے اعتبار سے کچھ معانی اخذ کرتے ہیں۔ اس طرح کے بیان میں وجود عینی معنی، نفس انسان میں ظاہر ہونے سے قبل، اللہ تعالی کی بارگاہ میں موجود رہتا ہے۔[1]

قرآنی آیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند متعال نے تمام حوائج انسانی جو کہ تکوینی طور پر اس کے لئے ضروری تھیں اور دوسری بہت سی اہم ضرورتوں کو قبل اس کے کہ انسان ان کی طرف متوجہ ہو، اسے عطا کر دیا۔

البتہ اگر کسی وجہ سے کوئی نعمت انسان سے سلب ہو جاتی ہے، تو وہ اس اہم چیز کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور خداوند کریم سے دوبارہ اس چیز کی عطا چاہتا ہے۔ اسی وجہ سے دعا کو زبان پر جاری کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ امام علیؑ نے مناجات شعبانیہ میں اس حقیقت کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

...وَتَعلم مَا فِي نَفسی وَتَخبر حَاجَتی وَتَعرف ضَميری وَلاَ يَخفی عَلَيكَ امر منقلبی وَمَثوای وَمَا اريد اَن ابدی بِه مِن مَنطقی و اتفوه بِهِ مِن طَلَبَتی وَارجوه لعاقبتی[2]۔

ترجمہ: پالنے والے تو جانتا ہے جو میرے نفس میں ہے، اور میری حاجت کو جانتا ہے، میری ضمیر سے واقف ہے۔ میری آخری منزل اور دائمی اقامت گاہ تجھ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اور جو کچھ زبان پر لانے والا ہوں اپنی عافیت کے لئے تو ان سے واقف ہے قبل اس کے کہ میں ان کا اظہار کروں۔

امام سجادؑ نے صحیفہ سجادیہ کی دعاوں میں بارہا اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے اور اسے فضل پروردگار کا لازمہ جانا ہے:

بَل مَلَكتَ يَا الٰهی اَمرَ هُم قَبلَ اِن يَملِكُوا عِبادَتَكَ وَاَعدَدتَ ثَوابَهُم قَبلَ اَن يَفيضُوا فِي طَاعَتِكَ وَذَالِكَ اَنَّ سُنتك الافضال وَ عَادَتَكَ الاَحسَانُ وَ سَبيلَكَ العَفوُ۔ ترجمہ: جب کہ ایسا کچھ نہیں ہے بلکہ میرے کردگار تو ان کے اختیار عبادت کے پہلے سے خود ان کا صاحب اختیار ہے اور تو نے ان کے مسلسل اطاعت کرنے سے پہلے ہی ان کا

۱۔ اِنَّ اللهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرءِ وَقَلْبِهِ (سورہ انفال، آیت ۲۴)

۲۔ قمی، عباس، مفاتیح الجنان، ص ۲۶۸

ثواب مہیا کر دیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تیری سیرت فضل و کرم ہے اور تیری عادت احسان ہے اور تیرا راستہ معاف کر دینے کا ہے۔[۱]

یَا اِلٰہی فَلَکَ الحَمدُ فَکَم مِن عَائِبَۃٍ سَتَرتَھَا عَلَیَّ فَلَم تَفضَحنی وَکَم مِن ذَنبٍ غَطَّیتَہُ عَلَیَّ فَلَم تَشھَرنِی وَکَم مِن شَائِبَۃٍ اَلَمتُ بِھَا فَلَم تَھتِک عَنِّی سِترَ ھا...۔

ترجمہ: خدایا تیرا شکر ہے کہ میرے کتنے ہی عیب ہیں جن کی تو نے پردہ پوشی کی اور مجھے رسوا نہیں کیا اور کتنی ہی خطائیں ہیں جن کا میں نے ارتکاب کیا ہے لیکن تو نے ان کے پردے کو چاک نہیں کیا ہے اور تو نے بدترین ننگ و عار کا متحمل نہیں بنایا ہے۔[۲]

دعا کا غیر لفظی ہونا

زبان دعا کی حقیقت بے جان لفظ کی طرح نہیں ہے بلکہ درخواست کے عینی ہونے پر توجہ ہے اور اسی وجہ سے داعی کو ایک مضبوط مدعو (خداوند متعال) سے مربوط کرتی ہے اور ایک جذب وانجذاب معنوی ہے۔ فقیر علی الاطلاق کو غنی علی الاطلاق سے جوڑتی ہے۔ اس لئے تمام حقیقی دعائیں عبادت ہیں۔ فسمیت دعائک عبادۃ۔[۳] دوسری طرف تمام عبادتیں بھی دعا ہیں۔ اس لئے صاحب تفسیر المنار کا یہ کہنا کہ ہر عبادت دعا نہیں ہے، معتبر نہیں ہے کیونکہ ہر حقیقی عبادت میں دعا پوشیدہ ہے۔ ہر عبادت میں انسان اپنے فقر کے ساتھ غنی مطلق کی طرف رخ کرکے اسے پکارتا ہے اور اپنے فقر کو دور کرنے کی درخواست کرتا ہے۔ دوسری دلیلیں بھی اس حقیقت پر قائم کی گئی ہیں جو کہ اس مضمون کے بساط سے باہر ہے[۴]۔

دعا کی زبان کا غیر وضعی ہونا

دعا کے ذریعہ ہم کسی درخواست یا ضرورت کو اللہ تعالی کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس میں بیان و معنی متحد ہوتے ہیں اور الفاظ ارادہ کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ الفاظ معنی میں فانی یا معانی

۱۔ صحیفہ سجادیہ، دعا ۳۷، بند ۷
۲۔ ایضاً، دعا ۱۶، بند ۲۱
۳۔ ایضاً، دعا ۴۵
۴۔ طباطبائی، محمد حسین، المیزان فی تفسیر القرآن، ج ۲

کے آئینہ دار ہوں جیسا کہ عام زبان میں ہوتا ہے، اس لئے وضع اور قرارداد کا جو کہ عام زبان کی اساس ہے[۱] اس میں دخل نہیں ہے اور اگر زبان سر، زبان دعا کی ترجمان ہوتی ہے اور دعا الفاظ کے شکل میں ظاہر ہوتی ہے اور قلب، ذہن اور زبان سر باہم، ہم آہنگ ہو جاتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ الفاظ ارادہ کے ساتھ استعمال ہو رہے ہیں اور الفاظ کے حقیقی معنی نفس میں موجود ہیں اور پھر دعا اس وقت عام زبان کے مرتبہ تک تنزل کرتی ہے اور انشائی اور طلبی جملات کی شکل میں ادا ہوتی ہے۔

دعا کی زبان، حقیقی اور مجازی دعا کا معیار

زبان دعا کے بارے میں اب تک جو ہم نے بتایا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکثر دعائیں حقیقی نہیں ہوتی ہیں بلکہ داعی اور دعا دونوں مجازی ہیں۔ مجازی دعا میں استجابت کی قابلیت نہیں ہوتی اور اکثر لوگوں کی دعاؤں کے مستجاب نہ ہونے کا راز یہی ہے۔ داعی صرف زبان اور الفاظ سے دعا کرتا ہے۔ مثلاً :

۱- دعا کرنے والا عام زبان میں اپنی درخواست کو خداوند عالم کے سامنے پیش کرتا ہے لیکن اس کی درخواست عینی طور پر اس کے دل میں نہیں ہوتی ہے بلکہ اس کی درخواست کا معنی اور مفہوم ذہنی ہوتا ہے اور علم حصولی سے حاصل ہوتا ہے نہ کہ علم حضوری سے۔ ایسے دعا کرنے والے کی دعا فقط لقلقہ زبان ہے اور ذہن اور معانی الفاظ کے متحد ہونے کی علامت ہے۔ رسول اللہؐ نے ایسے شخص کی دعا کو دعائے غافل اور امام صادقؑ نے دعائے ساہی کا نام دیا ہے جو استجابت کے لایق نہیں ہے۔

واعلموا ان الله سبحانه لا يستجيب دعاء من قلب غافل۔[۲] ترجمہ: اور آگاہ ہو جاؤ بے شک اللہ تعالیٰ غافل کی دعا کو قبول نہیں کرتا ہے۔

قال الصادقؑ: ان الله لا يستجيب دعاء بظهر قلب ساه فاذا دعوت فاقبل بقلبك ثم استيقن بالاجابه۔[۳]

۱۔ خراسانی، محمد کاظم، کفایۃ الاصول، ص ۲۴
۲۔ فیض، محسن، المحجۃ البیضا، ج ۲، ص ۲۹۴
۳۔ ایضاً، ص ۲۹۴

۲۔ دعا کرنے والے کے دل میں دعا کی زبان موجود ہوتی ہے لیکن توجہ کے فقدان اور علم کی محدودیت کی بناپر داعی واضح طور پر اسے نہیں دیکھتا، اس لئے زبان سے کچھ کہتا ہے اور دل سے کچھ چاہتا ہے یعنی جو زبان سے کہہ رہا ہے وہ دل کی طلب کے خلاف ہے۔

امیر المومنینؑ نے ایک شخص کو یہ کہتے ہوئے سنا: اللھم انی اعوذبك من الفتنه ، حضرتؑ نے اس سے فرمایا : اراك تتعوذ من مالك و ولدك ! يقول الله تعالى : انما اموالكم و اولادكم فتنة ولكن قل: اللھم انی اعوذبك من مضلات الفتن ۔

امام صادقؑ فرماتے ہیں :واعرف طريق نجاتك و هلاكك كيلا تدعو الله بشئ منه هلاكك وانت تظن فيه نجاتك۔[۱]

البتہ خداوند متعال نے کیونکہ استجابت کوامتنان سے متعلق قرار دیا ہے لہٰذا زبان دعاکے ساتھ بیان کی گئی حاجت پر توجہ کرتا ہے نہ کہ عام زبان کی دعاپر۔

۳۔ کبھی دعا کرنے والا دعا کی زبان سے دعا کرتا ہے لیکن عام زبان کے قواعداور دستور سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے الفاظ کو درست ادانہیں کرتااور اس صورت میں زبان دعا، عام زبان سے الگ ہو جاتی ہے جب کہ الفاظ دعا کی صحت شرط اجابت دعانہیں ہے لیکن شرط ادب حضور قلب ہےاور عالی تر نتیجہ میں موثر ہے۔

حضرت امام جوادؑ نے فرمایا: ... ودعائه اليه من حيث لا يلحن به منزله مدح ۔

اس قسم کی دعا بھی حقیقی دعا نہیں ہے کیونکہ حضرت اس کے بعد فرماتے ہیں :" ان الدعا الملحون لا يصعد الى الله"۔ترجمہ: دعائے ملحون اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں نہیں پہنچتی ہے۔

اجابت دعالطف عظیم ہےاور ملحون دعا کی اجابت اس لطف کے خلاف ہے۔ پیغمبر اکرمؐ کی فرمایش بھی اس معنی کی مؤید ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

۱۔ المحجۃالبیضا، ج ۲، ص ۲۹۴

"ان الرجل الاعجمی من امتی لیقرء القرآن بعجمته فترفعه الملائکة علی عربیته"[۱]۔ ترجمہ: عجم کا رہنے والا میرا امتی قرآن کو عجمی لہجہ میں پڑھتا ہے لیکن فرشتہ اس کی قرائت کو فصیح عربی میں آسمان پر لے جاتے ہیں۔

۴ ۔ کبھی داعی عام زبان میں دعا کرتا ہے اور خدا کو پکارتا ہے اور اس سے سوال کرتا ہے لیکن اس کے دل میں زبان دعا موجود نہیں ہوتی، کیونکہ حقیقت میں وہ خدا کو نہیں پکارتا ،اس کی نگاہ عام اسباب پر رہتی ہے، وہ فقط زبان سے خدا کو پکارتا ہے لیکن دل سے ظاہری اسباب پر بھروسہ کرتا ہے۔[۲] اس طرح کی دعا بھی استجابت کے قابل نہیں ہے۔ حضرت امام سجادؑ کی نظر میں دعائے حقیقی کا لازمہ ظاہری اسباب سے مکمل انقطاع اور اخلاص ہے:

اللهم اِنّی اَخلَصتُ بِانقِطاعی اِلیكَ وَاَقبَلتُ بِكُلّی عَلَیكَ وَصَرفتُ وَجهی عَمَّن یحتاجُ اِلی رَفدِكَ... وَرَایتُ اَنَّ طَلَبَ المُحتاجِ اِلی المُحتاجِ سَفَةٌ مِن رَایهِ و ظَلَّةٌ مِن عَقلِهِ فَكَم قَد رَایتُ یا اِلٰهی مِن اُناسٍ طَلَبُوا العِزَّ بِغَیرِكَ فَذَلّوا وَ رامُوا الثَّروةَ مِن سِواكَ فَافتَقَرُوا وَحاوَلُوا الاِرتِفاءَ فَاتَّضَعُوا۔

ترجمہ: خدایا مکمل اخلاص کے ساتھ تیری طرف آرہا ہوں۔ اور پورے وجود کے ساتھ تیری طرف متوجہ ہوں، میں نے اپنا رخ ان تمام لوگوں سے موڑ لیا ہے جو خود ہی تیری عطا کے محتاج ہیں اور اپنے سوال کو ان کی طرف سے ہٹالیا ہے جو خود بھی تیرے فضل و کرم سے بے نیاز نہیں ہیں۔ اور میں نے یہ اندازہ کرلیا ہے کہ محتاج کا محتاج سے مانگنا فکر کی نادانی اور عقل کی گمراہی ہے۔ میں نے بارہا دیکھا ہے کہ جن لوگوں نے تیرے غیر سے عزت کا تقاضا کیا وہ ذلیل ہوگئے۔ اور جنہوں نے تیرے علاوہ کسی اور سے دولت کا سوال کیا وہ حقیر ہوگئے،

۱۔ اصول کافی، ج ۴، ص ۴۲۴
۲۔ المیزان فی تفسیر القرآن، ج ۲

انہوں نے بلند ہونا چاہا تھا لیکن پست ہوگئے تو ان سب کا انجام دیکھ کر وہ ہوش مند ہوش میں آگیا جسے نگاہ عبرت نے توفیق فراہم کردی اور اسے اس کے انتخاب کا سیدھا راستہ دیکھادیا۔[1]

زبان دعا کی خصوصیات

زبان دعا علم حضوری پر مبنی

حقیقت زبان کے تجزیہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حقیقی دعا میں ضرورتیں فقط مفاہیم اور تصورات ذہنی نہیں ہیں بلکہ وجود انسان میں موجود ہیں اور اگر زبان دعا، زبان سر سے متحد ہوجائے تو الفاظ دعا علم حصولی سے حاصل ذہنی مفاہیم پر متکی نہیں ہوں گے بلکہ واقعی ضرورت کے ترجمان ہوں گے۔

زبان دعا علم اور یقین پر مبنی

جب زبان دعا علم حضوری پر مبنی ہوگی تو اس کا بیان یقین واقعی پر مبنی ہوگا نہ کہ یقین اعتقادی پر یا ظن وگمان پر جس میں احتمال خطا ہوتا ہے۔ انسان کا کلام علم حصولی کی محدودیت کی وجہ سے اکثر الفاظ کے ظنی معانی پر مبنی ہوتا ہے جسے اس نے اپنے ذہن میں ذخیرہ کر رکھا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ معانی اور ذہنی نیت کے بیان کے لئے لفظوں کے انتخاب میں ممکن ہے اشتباہ میں پڑ جائے کیونکہ الفاظ اور معنی کا ارتباط، علم حصولی کے ذریعہ حاصل ہوا ہے، اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ عام زبان یا زبان سر ہمیشہ یقین اور صدق پر مبنی ہوتی ہے لیکن زبان دعا ہمیشہ یقین پر مبنی ہوتی ہے کیونکہ معنی حقیقت میں زبان کے ساتھ اتحاد حقیقی کے طریقہ سے متحد اور ایک ہے۔ زبان دعا میں موضوع اور موضوع لہ واحد ہے اسی لئے وضع اور اقسام وضع کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

یہ خصوصیت ائمہ اطہارؑ کی تمام دعاوں اور خاص کر صحیفہ سجادیہ میں قابل مشاہدہ ہے۔ ائمہ اطہار علیہم السلام کی دعاوں کے فقرات کے بہت سے الفاظ، زبان دعا کی ترجمانی کرتے ہیں، اس لئے یہ فقرات رایت[2]، وجدت، علمت، وایقنت[3] جیسے الفاظ سے شروع ہوتے ہیں جو یقین پر دلالت کرتے ہیں۔

۱۔ صحیفہ سجادیہ، دعا۲۸، بند۱-۷

۲۔ ایضاً، دعا ۲۸

۳۔ ایضاً، دعا۱۲

صحیفہ سجادیہ کی دعاؤں کا باریکی سے مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ امام سجادؑ کی کسی بھی دعا میں شک اور تردید دکھائی نہیں دیتا ہے اور بنیادی طور پر جو مطالب اور حاجات ذکر ہوئے ہیں، ان میں ظن اور گمان کا کوئی شائبہ نہیں ملتا، چہ جائے کہ شک وتردید اور ان دعاوں میں استجابت پر یقین موجزن ہے۔

یاد رکھنا چاہئے کہ دعاوں کے تمام جملے طلبی اور انشائی ہوتے ہیں جن کے ظاہر میں صدق اور کذب (سچ اور جھوٹ) نہیں پایا جاتا ہے، لیکن ان کو اخباری جملوں میں بدلا جاسکتا ہے جو کہ واقع اور نفس الامر کی حکایت کرتا ہے، اس لئے اس خصوصیت سے یہ شبہ پیدا نہ ہو کہ کیونکہ دعاوں میں صدق اور کذب نہیں ہوتا، تو ان کا مقطوع اور مظنون ہونا بھی بے معنی ہے۔ حضرت امام سجادؑ فرماتے ہیں:

اَللّٰهُم فَهَا اَنَا ذَاقَد جِئتُکَ مُطیعاً لِاَمرِکَ فِیما اَمَرتَ بِهَ مِنَ الدُّعَا مُتَنَجِّزاً وَعدَکَ فِیمَا وَعَدتَ بِه مَنَ الاِجابَةِ اِذ تَقولُ۔ ترجمہ: اب میں تیرے سامنے اس امر کی اطاعت کرتے ہوئے حاضر ہوا ہوں کہ تو نے دعا کا حکم دیا ہے اور اس وعدہ کی وفا کا طلبگار ہوں جو تو نے دعاؤں کی قبولیت کے بارے میں کیا ہے اور فرمایا ہے کہ تم دعا کرو میں قبول کروں گا۔[1]

زبان دعا، داعی کے رتبہ وجودی کی ترجمان

انسان کا رتبہ وجودی ایک تشکیکی امر ہے اور انسانوں کے مراتب قرب اور فقر وجودی کی مقدار متحرک اور متفاوت ہے۔ پیغمبر اکرمؐ اور ائمہ طاہرینؑ اس مرتبہ وجودی پر فائز ہیں کہ تمام فرشتوں سے بالاتر ہیں اور ان کا وجودی رتبہ، پروردگار کے وجود مطلق کے رتبہ کے بعد قرار پاتا ہے اور تمام ملائکہ اور انسان کے مراتب ان کے بعد ہیں۔

زبان دعا، انسان کے رتبہ وجودی میں ظاہر ہوتی ہے۔ اسی لئے زبان دعا، ہر امر سے پہلے داعی کے وجودی رتبہ اور میزان فقر کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کلام کا لازمہ یہ نہیں ہے کہ داعی لازمی طور پر زبان دعا کے ساتھ اور خود اپنی دعاوں میں، اپنے رتبہ وجودی کا مشاہدہ اور درک کرے البتہ اگر چاہے تو دعا کے تجزیہ اور زبان دعا کے درک کے ساتھ، اپنے وجود میں خداوند عالم کے طئے اپنے میزان فقر کو سمجھ سکتا ہے۔ ائمہ معصومینؑ کی دعاؤں خاص کر صحیفہ سجادیہ کی دعاوں میں، دعا حقیقی معنی میں ہے اور ان کی حلاوت کا راز بھی

۱۔ صحیفہ سجادیہ، دعا۳۱، بند۱۱

یہی ہے۔ اسی لئے معصومینؑ کی دعاوں میں ''کلم الناس علی قدر عقولھم ''کا معیار نہیں پایا جاتا ہے بلکہ آپ حضرات نے اس اصل کو عام زبان میں اور وہ بھی عام لوگوں کے لئے رعایت کی ہے، خواص کے لئے نہیں، لیکن زبان دعا میں اس اصل کی رعایت نہیں کی گئی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے ائمہ معصومینؑ کی دعاوں سے عوام استفادہ نہیں کر سکتے ہیں۔

حضرت امام سجادؑ فرماتے ہیں: ... واقبلت بکلی علیک...۔ تمام وجود کے ساتھ تیری طرف رخ کیا ہے[1]۔

زبان دعا، فطرت کی ترجمان

فقر، داعی (دعا کرنے والے) کی عین ذات ہےاور غنا مدعو یعنی خداوند متعال کی حقیقت ہے۔ پس انسان کی ذات اور فطرت، فقر پر استوار ہے لہٰذا احساس فقراور نیازایک فطری احساس ہے۔ بنیادی طور پر انسانی فطرت کی خداجوئی، حقیقت طلبی، فضیلت طلبی، زیبائی طلبی وغیرہ اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کی ذات عین فقر ہے اور وہ اپنی تمام ضرورتوں کو خدا کی ذات میں پاتا ہےاور دعا بھی کسی چیز کا خداوند متعال سے طلب کرنے کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان دعا حقیقت میں زبان فطرت اوراس کی ترجمان ہے۔

اللہ تعالی کی بارگاہ میں پیش کی گئی تمام حقیقی دعائیں کسی نہ کسی شکل میں اس کے فقر وجودی کی مظہر ہیں، جہاں ہم اپنے فقر کے ایک گوشہ کو اللہ تعالی کے سامنے پیش کرکے اس کی رحمت کو تلاش کرتے ہیں۔ صحیفہ سجادیہ کی ساری دعائیں آئینہ فقر ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس صحیفہ میں زبان دعا، ایک طرف سے داعی کے فقر وجودی کا مظہر اور دوسری طرف داعی کی وسعت وجودی کے مطابق مدعو کے غنا کا مشاہدہ اور تیسری طرف فقیر اور غنی کے بیچ رابطہ کی نوعیت کا اظہار ہے۔ صحیفہ سجادیہ کا ہر فقرہ ضمنی یا صریحی طور پر ان تینوں میں سے ایک کو بیان کر رہا ہے۔

حضرت امام سجادؑ اس طرح دعا کرتے ہیں:

۱۔ صحیفہ سجادیہ، دعا ۲۸

اَللّٰھُمّ یَا مُنتَھی مَطلَبِ الحَاجاتِ وَیَا مَن عِندَہُ نَیلُ الطَّلِباتِ... تَمَدَّحتَ بِالغِنَاءِ عَن خَلقِکَ وَ اَنتَ اَھلُ الغِنی عَنھُم وَ نَسَبتَھُم اِلَی الفَقرِ وَ ھُم اَھلُ الفَقرِ اِلَیکَ فَمَن حَاوَل سَدَّ خَلَّتِہِ مِن عِندِکَ وَ رَامَ صَرفَ الفَقرِ عَن نَفسِہَ بِکَ فَقَد طَلَبَ حاجَتَہُ فی مَظانِّھا و اتی طَلِبَتہُ مِن وجھِھا۔

ترجمہ: پروردگارا! اے حاجت طلب کرنے کی منزل آخر۔ اور اے وہ جس کی بارگاہ سے مقاصد حاصل ہوتے ہیں... تو نے اپنی تعریف ہی یہ کی ہے کہ تو مخلوقات سے بے نیاز ہے اور اس بے نیازی کا اہل ہے اور تو نے مخلوقات کو فقر کی طرف نسبت دی ہے کہ وہ واقعا تیرے محتاج ہیں لہٰذا جو شخص بھی اپنی حاجت کو تیری بارگاہ سے پورا کرانا چاہتا ہے اور اپنے نفس سے فقر کو تیرے ذریعہ دور کرنا چاہتا ہے، اس نے حاجت کو اس کی منزل سے طلب کیا ہے اور مقصد تک صحیح رخ سے آیا ہے۔[1]

لکَ یَا اِلٰھی وَحدانِیّۃُ العَدَدِ وَ مَلَکَۃُ القُدرَۃِ الصَّمَدِ وَ فَضیلَۃُ الحَولِ وَ القُوَّۃِ وَ دَرَجَۃُ العُلُوِّ و الرَّفعَۃِ وَ مَن سِوَاکَ مَرحُومٌ فِی عُمُرِہ مَغلُوبٌ عَلَی اَمرِہَ مَقھُورٌ عَلَی شَانِہِ مُختَلِفُ الحالاتِ مُتَنَقِّلٌ فِی الصِّفاتِ۔ ترجمہ: میرے مالک عدد کی یکتائی بھی تیرے لئے ہے اور بے نیازی کی قدرت بھی تیری ہے۔ساری قوت وطاقت اور درجات کی بلندی و رفعت سب تیرے لئے ہے۔ تیرے علاوہ جو بھی ہے وہ اپنی زندگی میں بھی تیرے رحم کا محتاج ہے اور اپنے معاملات میں بھی مغلوب ہے اور اپنی شان میں بھی تیرے زیر اقتدار ہے۔سب کے حالات بدلتے رہتے ہیں اور سب کے صفات میں تغیر ہوتا رہتا ہے۔[2]

... وَ بِفَقری اِلَیکَ وَ غِناکَ عَنّی فَاِنّی لَم اُصِب خَیراً قَطُّ اِلّا مِنکَ وَلَم یَصرِف عَنّی سوءً قَطُّ اَحَدٌ غَیرُکَ...۔ ترجمہ: اور میں اس کے بارے میں تیرا محتاج ہوں اور تو مجھ سے بے

۱۔ صحیفہ سجادیہ، دعا ۱۳، بند ۱ و ۲؛ ۱۱ - ۱۳

۲۔ ایضاً، دعا ۲۸، بند ۱۰

نیاز ہے، میں نے تیرے بغیر کوئی خیر حاصل نہیں کیا ہے اور مجھ سے شر کو تیرے علاوہ کوئی بھی روک نہیں سکتا ہے۔[۱]

زبان دعا، احساس کی ترجمان

حقیقت دعا، داعی اور مدعو کے بیچ جذب اورانجذاب پر مبنی ہے۔ دعا میں ہر بیان محبت اور شوق میں لپٹا ہوا ہے، اس لئے زبان دعا میں عشق اور محبت پوشیدہ ہے۔ بنیادی طور پر زبان دعا اس عشق کو بیان کرنے والی اور خود عین شوق اور عشق ہے یہاں تک کہ مدعو بھی اپنے عشق کو، داعی کی زبان دعا میں ڈال دیتا ہے اور خداوند متعال کے عشق کی خوشبو داعی کے مشام جان میں پہونچتی رہتی ہے۔

اسی وجہ سے حضرت امام سجادؑ کی دعاوں کے ہر فقرہ میں محبت کی آواز، عشق کا پیام اور ان حضرت کا بیان شوق پوشیدہ ہے۔ اس سے امام سجادؑ کے لئے اللہ تعالی کے عشق کی بو بھی آتی ہے۔ اس بنیاد پر کہا جا سکتا ہے دعا کرنے والا اگر اپنی دعاوں میں شوق اور عشق نہ پائے اور خداوند عالم کے عشق کی خوشبو کو محسوس نہ کر سکے تو وہ داعی مجازی ہے۔

ہمیشہ یہ توجہ رکھنا چاہئے کہ دعا کی زبان میں، خداوند عالم سے، اس کے لئے شوق اور عشق طلب کرنا[۲] اور یہ حقیقت کہ دعا حب پر مبنی عشق و شوق کا بیان ہے، دونوں میں فرق ہے۔ زبان دعا کی یہ خصوصیت کبھی کبھی اتنی صراحت کے ساتھ صحیفہ سجادیہ کی دعاوں میں آتی ہے کہ دعا اور زبان دعا سے ناواقف لوگ، دعاوں میں مبالغہ کا احساس کرتے ہیں، جبکہ زبان دعا میں، خداوند متعال سے عشق اور شوق کے اظہار میں ہر گز مبالغہ نہیں ہوتا اور بنیادی طور پر زبان دعا میں مبالغہ کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے اور مبالغہ عام زبان سے مخصوص ہے۔ حضرت امام سید الساجدینؑ اپنی دعا میں فرماتے ہیں:

وَلَيْسَ عَذَابِي مِمَّا يَزِدَ فِي مُلْكِكَ مِثقالَ ذَرَّةٍ وَلَو اَنَّ عَذابی مِمَّا يَزيدُ فی مُلكِكَ لِسَأَلتُكَ الصَّبرَ عَلَيهِ وَ اَحبَبتُ اَن يَكُونَ ذَالِكَ لَكَ....۔ ترجمہ: اگر میرے عذاب سے تیرے ملک میں

۱۔ صحیفہ سجادیہ، دعا ۴۸، بند ۴

۲۔ الٰہی اغرس فی افئدتنا محبتك (مجلسی، علامہ محمد باقر، بحار الانوار، ج ۹۱، ص ۱۵۳)

اضافہ ہو سکتا تھا تو میں تجھ سے اس کو برداشت کرنے کا سوال کرتا اور یہ چاہتا کہ یہ کام تیرے حق میں ہے تو ہو جائے۔[1]

اللّٰھُمَّ اجعَل رَغبَتِی فِی مَسئَلَتی مِثلَ رَغبَةِ اَولِیائِکَ فِی مَسائِلِھِم...اللّٰھُم ھَذِہ حاجَتی فَاعظِم فِیھا رَغبَتی۔ ترجمہ: خدایا میرے سوال میں میری رغبت کو ویسا ہی بنا دینا جیسا تیرے اولیا اپنے سوال میں رغبت رکھتے ہیں ...خدایا یہ میری حاجت ہے اس میں میری رغبت بڑھا دے۔[2]

دعا کی زبان دل ودماغ کی ترجمان

دعا، شہودات غیبی اور مکاشفات اشراقی تک پہونچنے کا راستہ ہے اور کبھی کبھی داعی کی زبان دعا اس فضا کی خبر دیتی ہے۔ اس حالت میں زبان دعا، زبان عرفان سے نزدیک ہوتی ہے[3]۔ البتہ اس وقت، اگر زبان دعا، عام زبان تک تنزل کرکے زبان پر جاری ہو جائے تو زبان دعا کا شھودی اور کشفی بیان جو کہ اخباری ہے، انشا کے قالب میں بدل جاتا ہے۔ اسی لئے، معصومین علیہم السلام کی اس طرح کی دعاوں کو تھوڑی دقت نظر کے ساتھ اخباری جملوں میں بدلا جاسکتا ہے۔ حقیقت میں زبان دعا، بعض مواقع پر عقل بشری سے بالاتر اور زبان غیب میں تبدیل ہو جاتی ہے اور وجود کے عالی ترین مقام کی طرف اشارہ کرتی ہے اور ان مقامات تک پہونچنے میں رہنمائی کرتی ہے۔ حضرت امام سجادؑ ایک مناجات میں اس طرح فرماتے ہیں:

الٰھی فاجعلنا من الذین ترسخت اشجار الشوق الیک فی حدائق صدورھم واخذت لوعة محبتک بمجامع قلوبھم فھم الی اوکار الافکار یاوون وفی ریاض القرب والمکاشفة یرتعون و من حیاض المحبه بکاس الملاطفه یکرعون وشرایع...۔ ترجمہ: میرے خدا! مجھے ان لوگوں میں سے قرار دے کہ جن کے دلوں کے باغ میں تیرے شوق ملاقات کے پودے ہرے بھرے ہوں اور تیری سوز محبت ان کے دلوں میں کوٹ کوٹ بھری ہو، اسی وجہ سے وہ لوگ افکار عالی انس کے آشیانوں میں، نشیمن پاگئے اور مقام قرب و شہود کے باغوں میں چہل

۱۔ صحیفہ سجادیہ، دعا۵۰، بند ۶

۲۔ ایضاً، دعا ۵۴، بند ۶

۳۔ تہرانی، جواد، عارف وصوفی چہ می گوید، ص ۱۳۸

قدمی کر رہے ہیں اور تیری محبت کے سرچشمہ سے جام فیض کے ذریعہ سیراب ہو رہے ہیں اور صفا کی نہر میں پہونچ گئے ہیں اس حال میں کہ ان کی آنکھوں کے سامنے سے پردے اٹھ گئے ہیں اوران کے باطن سے شک اور ریب کی تاریکی زائل ہو گئی ہے۔ تجھ سے عشق کتنا شیرین ہے، تیرے قرب کا شربت کتنا خوشگوار ! اے میرے اللہ مجھے اپنے مخصوص ترین آشناوں اور صالح ترین بندوں میں قرار دے۔[1]

زبان دعا، انسان کی معنوی حالات کی ترجمان

زبان دعا نہ صرف یہ کہ عالم بشریت کی ایک خوبصورت حقیقت ہے بلکہ انسان کی روحی اور معنوی حالت کی ترجمان بھی ہے جوہ چشم بینا کو تمام خوبصورتیوں سے منصرف کرکے اپنے میں مشغول کر لیتی ہے۔ زبان دعا ہی عالم تکوین کو خوبصورتی عطا کرتی ہے اور اس زبان میں تمام موجودات اس سے کلام کرتے ہیں اوراس کی تسبیح اور سجدہ کرتے ہیں۔

حضرت امام سید الساجدینؑ فرماتے ہیں: الٰهی وزین لی التفرد بمناجاتک باللیل والنهار ۔ترجمہ: اے خدا دعااور مناجات کو شب وروز، حالت تنہائی میں میرے لئے خوبصورت بنا۔[2]

دعاسکون کاذریعہ

دعاایک آرام بخش دوا ہے اور اس سے داعی کے سکون واطمینان کا بھی پتہ چلتا ہے۔ حضرت امام سید الساجدینؑ فرماتے ہیں: واجعل لی عندک مقیلاً اوی الیه مطمئناً[3]. یا انس کل مستوحش غریب ۔[4]

شک وتردید کا منحوس سایہ انسان کے اندر غم اور خوف طاری کرتا ہے اور روح کو مضطرب اور نامتعادل بناتا ہے اور صرف علم اور یقین کے ذریعہ ہی اس خوف واضطراب کو اپنے اندر سے دور کیا جاسکتا ہے۔ خوف واضطراب کو دور کرنے کے دوسرے راستے وقتی ہیں:

واجعل قلبی واثقاً بما عندک ۔[1]

۱۔ بحار الانوار، ج ۹۱، ص ۱۵۰و۱۵

۲۔ صحیفہ سجادیہ، دعا ۴۷

۳۔ ایضاً، دعا ۴۷

۴۔ ایضاً، دعا ۱۶

اور چونکہ دعا کرنے والا انسان دعا میں ایسی زبان میں کلام کرتا ہے جو کہ علم و یقین پر مبنی ہے لہٰذا دعا کے وقت شک اور تردید نہیں رہتا اور داعی پر سکون طاری رہتا ہے۔ حضرت امام سید الساجدینؑ مناجات المریدین میں فرماتے ہیں:

وفی مناجتک روحی و راحتی و عندک دواء علتی و شفاً غلتی و برد لوعتی۔ ترجمہ:
تیری مناجات میں میرے لئے خوشحالی اور آرام اور تیرے پاس میری بیماری کی دوا اور قلب کی تشنگی کا علاج اور میری سوزش جان کی تسکین ہے۔[۲]

انداز دعا کی لذت آفرینی

زبان دعا کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ داعی کے دل میں سرور پیدا کرتی ہے۔ یہ خصوصیت بھی زبان دعا کی ذاتی خصوصیات میں سے ہے، اس لئے اگر داعی اس لذت اور سرور کو دعا کے وقت محسوس نہ کرے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تہ دل سے دعا نہیں کر رہا ہے اور اس کی دعا مجازی ہے۔

حقیقت دعا اور اس کی زبان کے تجزیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ داعی دعا کی حالت میں جذب اور انجذاب اور غنی مطلق سے فیضیاب ہونے میں مشغول ہوتا ہے اور یہ سارے فیوض و برکات زبان دعا اور داعی کی فقر وجودی کی وجہ سے ہیں۔ اسی وجہ سے دعا ذاتاً انسان کو مطلوب ہے اور اہل نظر کا ماننا ہے کہ دعا اصل اور اجابت اس کی فرع ہے لیکن افسوس کہ اکثر دعا کرنے والے کیونکہ فقط نوک زبان سے دعا کرتے ہیں اور انداز دعا سے دور ہیں اور اجابت کو مقصد اور دعا کو ذریعہ مانتے ہیں لہٰذا دعا کی لذت آفرینی سے محروم ہیں۔

اس سلسلہ میں دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ دعا مدعو اور باری تعالیٰ کے لئے بھی محبوب اور لذت بخش ہے اور داعی اور مدعو کے بیچ جذب اور انجذاب کا راز یہی ہے۔ ائمہ اطہارؑ کی دعاؤں کی کثرت کا راز بھی شاید یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اس انداز دعا کو پسند کرتا تھا۔ حضرت امام صادقؑ فرماتے ہیں:

۱۔ صحیفہ سجادیہ، دعا ۴۷

۲۔ بحار الانوار، ج ۹۱، ص ۱۴۸ و ج ۱۵، ص ۲۱۵

اِنَّ الْمُومِن لیدعو اللہ عزوجل فی حاجتہ. فیقول اللہ عزوجل اخروا اجابتہ شوقاً الیٰ صوتہ و دعائہ ۔ ترجمہ: اکثر مومن، خداوند کو اپنی حاجت کے لئے پکارتا ہے اور خدا حکم دیتا ہے کہ اس کی دعا کی اجابت میں تاخیر کرو کیونکہ میں اس کی آواز اور دعا کا مشتاق ہوں۔[۱]

حضرت سید الساجدینؑ اپنی مناجات میں فرماتے ہیں:

الٰھی من ذالذی ذاق حلاوۃ محبتک فرام منک بدلا؟ ومن ذالذی انس بقربک فابتغی عنک حولاً ۔ ترجمہ: اے میرے پالنے والے، کون ہے جو تیری محبت کی چاشنی کو چکھنے کے بعد تیرے علاوہ کسی دوسری چیز کو اپنا مقصود بنائے اور کون ہے جو تیرے قرب سے مانوس ہونے کے بعد تجھ سے چشم پوشی کرے اور طلب اور جستجو کے مقام پر کسی دوسری چیز کی خواہش کرے۔[۲]

یاد رکھنا چاہئے کہ دعا کی لذت اور اللہ تعالی کے ذریعہ اجابت دعا کی لذت میں فرق ہے: اللھم واذقنی حلاوۃ المغفرۃ۔[۳]

لہجہ دعا، ربوبی نظام علیت پر مبنی

ائمہ معصومینؑ کی دعاوں بالخصوص صحیفہ سجادیہ میں سببیت اور موثریت براہ راست اسما اور صفات الٰہی سے منسوب ہے۔ دعا میں، نظام ربوبی تمام حوادث کا علت محض ہے اور پروردگار کا مطلق ارادہ تمام امور میں بغیر کسی واسطہ کے جاری ہے۔ اسی لئے عرفان مکتب دعا سے نزدیک ترین مسلک ہے۔ عارفوں کے مسلک میں قاعدہ علیت بھی خالق عالم کے حتمی ارادہ کا معلول ہے اور جو کچھ اس عالم میں کثرت سے نظر آتا ہے، وہ حضرت ربُّ الارباب کے مقامات کی ایک تجلی ہے[۴]۔اسی وجہ سے حقیقی مکتب عرفان کی سنگ بنیاد معصومینؑ کی دعاوں میں ملتی ہے جو کہ زبان دعا کے اثر سے ہے۔

۱۔ اصول کافی، ج ۴، ص ۲۴۶

۲۔ بحار الانوار، ج۹۱، ص۱۴۸

۳۔ صحیفہ سجادیہ، دعا۱۶، ص: ۸۷

۴۔ صدر المتالہین؛ محمد بن ابراہیم، الحکمۃ المتعالیہ فی اسفار الاربعا، ج ۲، ص ۳۰۰؛ صدر المتالہین؛ محمد بن ابراہیم ، الشواہد الربوبیہ، ص ۵۰، ابن عربی، محی الدین، ص ۱۰۱ ؛لاہیجی، عبدالرزاق، ص ۲۰۴

زبان دعا کی یہ خصوصیت تمام صحیفہ سجادیہ میں منعکس ہےاور حضرت امام سید الساجدینؑ نے بطور واضح ضمنی طور پر اس حقیقت کو ظاہر کیا ہے۔ نمونہ کے طور پر چند نمونوں پر اکتفا کی جاتی ہے:

یا من لا تبدل حکمته الوسائل۔[1]

اَلحمدلله الذی خلق اللیل والنهار بقوته ومیز بینهما بقدرته وجعل لکل وَاحد منهما حداً محدودا۔ ترجمہ: حمد اور تعریفیں اس خدا کے لئے ہیں جس نے دن اور رات کو اپنی قوت سے خلق کیااور اپنی قدرت سے ان دونوں میں جدائی ڈالی اور ہر ایک کے لئے اندازہ معین فرمایا۔[۲]

وَخَلَقَ لَکُم اللیل لِیَسکُنوا فیه مِن حَرکَات التَّعب۔ خلق النَّهار مُبصراً لِیَبتَغوا فیه مِن فَضلِه وَلِیَتسببوا اِلی رِزقه۔ وَاَنزل عَلَینا نَفع هٰذِه السَّحاب و بَرکتها واصرف عَنَّا اذاها وَ مضرتها ۔ اللّٰهم اذهب مَحل بَلادِنا بِسقیاک و اخرج وحر صدورنا برزقک۔ ترجمہ: رات کو بنایا تاکہ سکون حاصل کریں، دن کو روشن بنایا تاکہ فضل خدا سے فائدہ اٹھائیں اور خدا کی عطا کردہ روزی ہاتھ آئے، ان بادلوں کی برکت اور نفع کو ہمارے لئے نازل فرمااور ضرر اور نقصان کو ہم سے دور فرما۔ خدایاہماری سرزمین سے خشکسالی کو دور فرما اور بدبنی کو ہمارے سینوں سے خارج فرما۔[۳]

فَصَلِّ عَلَیْهِمْ وَعَلی الرّوحانِیّینَ مِنْ مَلائِکَتِک وَخُزّانَ المَطَرِ وَ زَواجِرِالسَّحَابِ ---- وَمُشِّیعی الثَّلج و البَرَدِ والهابِطینَ مَعَ قَطر المَطَرِاذا نَزَل والقُوّامِ علی خَزاین الرِّیاحِ ۔[۴] ترجمہ: خدایاان پر اوراپنے ملائکہ کے تمام روحانی افراد پر اور بارش کے خزانہ داروں پر بھی اور بادلوں کے ہنکلانے والوں پر بھی اور برف کے ٹکڑوں اور اولوں کے لانے والوں پر اور بارش کے قطروں کے ساتھ نازل ہونے والوں پر اور ہواوں کے خزانوں کی نگرانی کرنے والوں پر۔

۱۔ صحیفہ سجادیہ، دعا۱۷، ص۱۳

۲۔ ایضاً، دعا۶، بند ۱سے ۴

۳۔ ایضاً، دعا۳۶، ص۱۶۴

۴۔ ایضاً، دعا۳

امام علیہ السلام ہلال اول ماہ کو دیکھ کر فرماتے تھے:

اٰمَنتُ بِمَن نَوَّرَ بكَ الظُّلَمَ وَ اَوضَحَ بِكَ البُهَمَ وَ جَعَلَكَ آيةً مِن آياتِ مُلكِهِ وَ عَلامَةً مِن عَلاماتِ سُلطانِهِ وَامتَهَنَكَ بِالزِّيادةِ والنُّقصانِ ۔ترجمہ: میں ایمان لاتا ہوں اس پر جس نے تیرے وسیلہ سے تاریکیوں کو روشنائی عطا کی اور جسے دشواری سے حاصل کیا جاسکتا تھا آشکار کردیا۔ تجھے اپنی بلند نشانیوں میں سے ایک نشانی قرار دیا۔

زبان دعاء تضرع اور اعتراف پر مبنی

ائمہ اطہار خصوصاً حضرت امام سید الساجدینؑ دعا کے وقت شدت سے گریہ وزاری کرتے تھے جس سے انسان حیرت میں پڑ جاتا ہے ۔اس تضرع اور گریہ کا راز کیا ہے؟ جب کہ وہ حضرات گناہوں سے پاک اور عالم امکان کے اعلیٰ ترین وجود کے حامل تھے؟

شاید اس کا راز اس بات میں پوشیدہ ہو کہ وہ حقیقت میں داعی تھے اور ان کی دعائیں واقعی تھیں،اس لئے ایسی دعا میں تضرع اور گریہ وزاری کا ہونا ضروری ہے۔جب فقیر محض اپنے فقر اور نقص کو غنی مطلق کے آئینہ میں دیکھتا ہے تو اسے وحشت ہوتی ہے اور پھر جب داعی اپنے آئینہ فقر میں غنی مطلق کی جھلک دیکھتا ہے تو یہ وحشت اشک و زاری میں تبدیل ہوجاتی ہے جس سے وحشت جاتی رہتی ہے اور تضرع و زاری بڑھتا رہتا ہے۔ تضرع ،انابت اور گریہ زبان دعا کی ذاتی خصوصیت ہے جس سے یہ نتیجہ نکالنا چاہئے کہ جہاں داعی تضرع وزاری سے خالی ہے، وہاں در حقیقت زبان دعا موجود نہیں ہے اور دعا کرنے والا فقط زبانی طور پر اللہ کو پکار رہا ہے۔

حضرت سید الساجدینؑ اور تمام ائمہ اطہارؑ کی دعاؤں میں استغفار کثرت سے پایا جاتا ہے۔ آپ حضرات کی دعاؤں میں گریہ و زاری ،عجز و ناتوانی اور کوتاہیوں کا اظہار اور گناہوں، جہالت اور ناتوانی کا اعتراف پایا جاتا ہے، جب کہ گناہ و قصور ان کے قریب بھی نہیں آسکتے ،اس لئے کہنا چاہئے کہ ائمہ طاہرین علیہم السلام کی دعاوں کی یہ خصوصیت ، زبان دعا کی ذاتی خصوصیت کی وجہ سے ہے۔ حضرت سید الساجدین علیہ السلام دعای ابوحمزہ ثمالی میں فرماتے ہیں:

فو عزتك يا سيدى لوانتهرتنى ما برحت من بابك ولا كففت عن تملقك۔ترجمہ: اے میرے مولا تجھے تیری عزت کی قسم! اگر مجھے اپنے سے دور کرے گا میں تیرے درخانہ سے نہیں جاؤں گا اور تیری تملق گوئی سے بھی پیچھے نہیں ہٹوں گا۔[۱]

هذا مقام من تداولته ايدى الذنوب و قادته ازمه الخطايا۔ترجمہ: یہ مقام اس کا ہے، جسے اس کے گناہوں نے گمراہ کر رکھا ہے اور اس کے خطا کی باگ ڈور اپنے پیچھے کھینچ رہا ہے شیطان اس پر غالب ہو گیا ہے اس لئے تیرے حکم کی بجاآوری میں کوتاہی کرتا ہے۔[۲]

اللهم انى اعتذراليك من جهلى واستوهبك سوء فعلى ۔ترجمہ: اے پروردگار میں اپنی جہالت اور نادانی کی تجھ سے معذرت چاہتا ہوں اور اپنے برے افعال کی بخشش کا تقاضا کرتا ہوں۔[۳]

اَللّٰهُم اِنّى اَسَالُكَ سُوالَ مَنِ اشتدَّت فَاقَتُهُ وَ ضَعفت قُوَّتُهُ وَ كَثرتُ ذُنُوبه، سُوالَ مَنْ لا يَجِدُ لِفَاقَتِهِ مُغيثاً ولا لضعفه مقوياً و لا لذنبه غَافراً غَيرَك ۔ترجمہ: پالنے والے! من اس شخص کی طرح ہوں جو سخت ضرورت مند ہے اور اس کی طاقت زائل ہو گئی ہے اور اس کی گناہیں زیادہ ہو گئی ہیں تیرے علاوہ میرا کوئی فریاد رس نہیں ہے۔ اور اس کی کمزوری کو کوئی اور دور کرنے والا نہیں ہے۔ اور اس کے گناہوں کو کوئی معاف کرنے والا نہیں ہے[۴]۔

زبان دعا، اصرار اور تاکید پر مبنی

اپنی درخواست پر اصرار کرنا زبان دعا کی خاص بات ہے۔ یہ واضح خصوصیت، زبان دعا کی حقیقت اور اسی سے جدائی ناپذیر ہے۔ اصرار اور الحاح دو طرح کا ہوتا ہے یا تو ہم مدعو کے غنا کا اعتراف کرتے ہیں جو خود مدعو کی ایک قسم کی تسبیح اور تحمید ہے اور یا درخواست و طلب ہے جو کہ فقر کے آئینہ میں غنی کی شعاوں

۱۔ مفاتیح الجنان، ص ۳۱۹
۲۔ صحیفہ سجادیہ، دعا ۳۱
۳۔ ایضاً، دعا ۳۱
۴۔ ایضاً، دعا ۴۵

کاانعکاس ہے۔ اسی لئے ائمہ معصومین علیہم السلام نے اپنی تعلیمات میں بتایا ہے کہ ہم دعاکے وقت الحاح و اصرار کریں اور صحیفہ سجادیہ میں اس خصوصیت کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ رسول خداؐ سے روایت ہے: ان اللہ یحب السائل اللحوح ۔ترجمہ اللہ تعالیٰ اصرار کرنے والے سائل کو دوست رکھتا ہے۔

حضرت امام صادقؑ نے فرمایا: ان اللہ عز وجل کرہ الحاح الناس بعضھم علی بعض فی المسالہ و احب ذالك لنفسه، ان اللہ عزّ وجل یحب ان یسال و یطلب ما عندہ ۔[۲]

صحیفہ سجادیہ میں ایک ہی مضمون کو الگ الگ عبارتوں میں بیان کرنے کا راز بھی یہی ہے۔بطور نمونہ امام سید الساجدینؑ ایک دعا میں فرماتے ہیں:

اللھم صلِّ علی محمد و آلہ و کن لدعائی مجیباً و من ندائی قریباً و لتضرعی راحماً و لصوتی سامعاً۔[۳]

بل انا یا الٰہی اکثر ذنوباً ۔[۴]

زبان دعا اخلاص پر مبنی

زبان دعا اس وقت انسان پر اثر انداز ہوتی ہے جب داعی صرف اور صرف اللہ تعالی کو پکارے اور اپنے فقر وجودی کو اس کے غنا کے سامنے قرار دے اور کسی بھی طرح سے ظاہری اسباب و وسائل پر نظر نہ کرے۔ حقیقت میں جس وقت زبان دعا، نظام ربوبی کے افق علیت محض پر جاری ہو اور داعی اور دعا دونوں حقیقی ہوں نہ مجازی، اخلاص قہراً ظاہر ہو جاتا ہے،اسی لئے جہاں دعا کے وقت اخلاص نہیں ہوتا اور داعی ریاکاری میں رہتا ہے اور یا غیر خدا سے لو لگائے رہتا ہے تو وہ دعائے مجازی میں پھنسا ہوا ہے اور خداوند متعال نے دعائے داعی کی قطعی اجابت کا وعدہ حقیقی معنی کے لئے کیا ہے نہ کہ دعائے مجازی کے لئے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ان لوگوں کے جواب میں جنھوں نے آپؑ کی خدمت میں سوال کیا تھا کہ کیوں

۱۔ المحجۃ البضا، ج ۲، ص ۲۸۲
۲۔ اصول کافی، ج ۴، ص ۲۸۲
۳۔ صحیفہ سجادیہ، دعا ۱۳
۴۔ ایضاً، دعا ۱۶

ہماری دعائیں مستجاب نہیں ہوتیں؟ فرمایا: "لا نکم تدعون من لا تعرفون وتسئالون ما لا تفهمون"[۱]

امام سیدالساجدینؑ اس حقیقت کے بارے میں اس طرح فرماتے ہیں : "اللهم انی اخلصت بانقطاعی الیك واقبلت بکلی علیك و صرفت وجهی عمن یحتاج الی رفدك۔۔۔" ترجمہ: خدایا، دوسروں سے الگ ہو کر خالصانہ تجھ سے متصل ہو رہا ہوں اور اپنے تمام وجود کے ساتھ تیری طرف آیا ہوں اور ہر اس شخص سے جو تیری بخشش کا محتاج ہے اس سے منھ موڑ چکا ہوں ۔

منابع و مآخذ:

- ابن عربی، محی الدین، فصوص الحکم، تعلیق ابو العلا عفیفی، دار الکتب العربی، بیروت ، ۱۴۰۰ق
- تہرانی، جواد، عارف وصوفی چہ می گوید، بنیاد بعثت، تہران، ۱۳۶۹
- جوادی آملی، عبد اللہ، مبدأ و معاد، انتشارات الزہرا، قم، ۱۳۶۴
- حائری، سید مہدی، دایرۃ المعارف تشیع (ج ۷)، نشر شہید محبی، تہران، ۱۳۸۰
- خراسانی، محمد کاظم، کفایۃ الاصول، مؤسسہ النشر الاسلامی، قم، ۱۴۱۲ق
- شعرانی، ابو الحسن، صحیفہ سجادیہ، ترجمہ و شرح شعرانی، کتاب فروشی اسلامیہ، تہران
- صحیفہ سجادیہ، ترجمہ علی شیروانی، دار الفکر، قم، ۱۳۷۹
- صدر المتالہین، محمد بن ابراہیم، الشواہد الربوبیہ، تعلیق و تصحیح آشتیانی، مرکز نشر دانشگاہی، تہران، ۱۳۶۰
- صدر المتالہین، محمد بن ابراہیم، الحکمہ المتعالیہ فی الاسفار الاربعہ، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۸۱م
- طباطبائی، محمد حسن، المیزان فی تفسیر القرآن، مؤسسہ الاعلمی، بیروت، ۱۳۹۳ق
- طباطبائی، محمد حسن، نہایہ الحکمہ، انتشارات دار التبلیغ، قم، ۱۳۶۳
- فعال عراقی، حسین، داستان ہای قرآن و تاریخ انبیاء در المیزان، نشر سبحان، تہران، ۱۳۷۸
- فیض، محسن، المحجہ البیضاء (۸ جلدی)، دفتر انتشارات اسلامی، قم، ۱۳۸۳ق
- فیض، محسن، تفسیر الصافی، دار المرتضی للنشر، مشہد، ۱۳۹۹ق

۱۔ فیض، محسن، تفسیر الصافی، ج ۱۰، ص ۲۵۴

- قمی، عباس، مفاتیح الجنان، انتشارات حر،، تہران، ۱۳۷۸
- کلینی، محمد ابن یعقوب، اصول کافی، ترجمہ سید جواد مصطفوی (۴ جلدی)، نشر اہل البیت، تہران
- لاہیجی، عبد الرزاق، گوہر مراد، تہران، کتاب فروشی اسلامیہ، تہران، (۱۳۶۵)
- لاہیجی، محمد، مفاتیح الاعجاز فی شرح گلشن راز، کتابفروشی محمودی، تہران، ۱۳۶۸
- مجلسی، علامہ محمد باقر، بحار الانوار، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۰۳ق
- نائینی، میرزا محمد حسین، فوائد الاصول، مؤسسہ نشر اسلامی، قم، ۱۴۱۲ ق
- نہج البلاغہ، ترجمہ محمد دشتی، نشر روح، قم، ۱۳۷۹

دعاؤں میں توحید کی تجلی

مؤلف: محمد شریفانی
مترجم: مولانا مقداد حیدر روحانی

توحید اور معصومینؑ کی دعائیں خصوصاً امام سجادؑ کی دعائیں علمی اور عملی طور پر ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں۔ یہ دعائیں توحید اور اس کے مراحل واقسام کی تعلیم دیتی ہیں اور خود بھی توحید نظری اور عملی کی خالص تجلی گاہ ہیں۔

اس مضمون میں معصومینؑ کی ماثورہ دعاؤں میں توحید اور اس کے ابعاد کی تحقیق کی کوشش کی گئی ہے۔ سب سے پہلے اسلام میں توحید کے مرکزی کردار اور دعا کی اہمیت و حقیقت کو بیان کیا گیا ہے اور اس کے بعد امام سجادؑ سے منقول دعاؤں سے کچھ فقرات نقل کئے گئے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دعائیں توحید تک پہونچنے کا ذریعہ ہیں اور اسی کے ساتھ توحید عملی کا جلوہ بھی ان میں نمایاں ہے۔

توحید، ادیان الٰہی کا اساسی ترین رکن ہے کیونکہ مطلق حق اور صاحب حق صرف خداوند عالم ہے اسی لئے فقط توحید اور اس کا اظہار بعض انسانوں سے جنگ اور سلب حیات کا منشا ہے:

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ فَإِنِ انتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ۔ ترجمہ: اوران سے اس وقت تک جنگ جاری رکھو جب تک سارا فتنہ ختم نہ ہو جائے اور دین صرف اللہ کا نہ رہ جائے پھر اگر وہ لوگ باز آجائیں تو ظالمین کے علاوہ کسی پر زیادتی جائز نہیں ہے[1]۔

اس بارے میں امام سجادؑ فرماتے ہیں:

۱۔ سورہ بقرہ، آیت ۱۹۳

اَللّٰھُم اغزُ بِکُلِّ ناحیۃٍ مِنَ المُسلِمِینَ عَلی مَن بِإزَائِھِم مِنَ المُشرِکِینَ وَ أمدِدھُم بِمَلَائِکَۃٍ مِن عِندِکَ مُردِفِینَ حَتّٰی یَکشِفُوھُم اِلی مُنقَطَعِ التُّرَابِ قَتلاً فِی اَرضِکَ وَ اَسراً اَو یُقِرُّوا بِاَنَّکَ اَنتَ اللّٰہُ الَّذِی لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنتَ وَحدَکَ لَا شَرِیکَ لَکَ۔[1]

ترجمہ: خدایا! مسلمانوں کو ہر علاقہ میں ان کے مد مقابل مشرکین پر فتح عنایت فرما اور اپنی طرف سے مسلسل آنے والے ملائکہ کے ذریعہ ان کی امداد فرما تاکہ دشمنوں کو آخری خطہ زمین تک باہر کردیں یا قتل کردیں یا گرفتار کرلیں یا اس بات کا اقرار لے لیں کہ تو ہی خدا ہے اور تیرے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے، تو وحدہ لاشریک ہے۔

دوسری طرف، اسلامی تربیت کی بناپر، دعا بہترین عبادت اور خالص ترین توحید کا اظہار ہے جبکہ کامل ترین بندگان خدا، معصومین علیہم السلام ہیں اور معصومینؑ کی دعائیں، دعاؤں کا بہترین طریقہ اور مرکز ہیں۔ ائمہ طاہرین علیہم السلام سے ماثورہ دعاؤں میں، اکثر دعائیں چوتھے امام، حضرت سجادؑ سے نقل ہوئیں ہیں۔آن حضرت نے اپنے زمانہ حیات کے کچھ خاص حالات کی وجہ سے دینی تعلیمات خصوصاً توحید کو دعا کے پیرائے میں بیان فرمایا ہے۔

اس مضمون میں، سب سے پہلے توحید اور دعا کے مسائل کو بیان کیا گیا ہے اور اس کے بعد ان دو مقولوں کے آپسی تعلق کے بارے میں تحقیق کی گئی ہے۔

توحید

توحید مصدر ہے جس کی اصل وَحِدَ (وُحُدَ) ہے جو تنہا ہونے کے معنی میں ہے[2] اور اصطلاح میں "ایمان باللہ وحدہ لاشَریکَ لَہ"[3] کے معنی میں ہے لہٰذا خدائے تعالیٰ کی وحدانیت پر اعتقاد رکھنا توحید ہے۔ امیر المومنینؑ اِنَّ اللّٰہَ وَاحِدٌ کے معنی کی توضیح میں فرماتے ہیں:

۱۔ صحیفہ سجادیہ، دعاء نمبر ۲۷، بند ۸

۲۔ ایضاً، ص ۴۴۹

۳۔ کلینی، محمد بن یعقوب، الکافی، ج ۳، ص ۲۸۱

اِنَّ القَولَ فِی اِنَّ اللہ وَاحِدٌ عَلی اَربَعَة اَقسَامٍ، فَوَجْهَانِ مِنْهاَ لاَيَجُوزَانِ عَلى اللہ وَ وَجْهانِ يَثبِتَانِ فِيه، فَاَمَّاالَّذَانِ لَايَجُوزَانِ عَلَيه فقول القائل واحد يقصد به باب الاعداد فهذا ما لايجوز لانَّ ما لاثانى له لايدخل فى باب الاعداد، اما تَریٰ انَّهُ كَفَرَ مَنْ قال ثالث ثلاثة؛ وَقَولُ القائل هوَ واحدٌ مِنَ النَّاس يُرِيدُ به النوع من الجنس فهذا مالايجوز عليه لانه تشبيه، وَ جَلَّ ربُّنَا عَن ذالك؛ فامّاالوجهان اللذان يثبتان فيه فقول القائل هو واحد ليس له فى الاشياء شبه، كذالك ربُّنا؛و قول القائل اِنَّه عَزَّوَجَلَّ اَحدِيُّ الْمَعْنی يَعنى به اَنَّهُ لاَ يَنقَسِمُ فِی وجودٍ و لاعقلٍ وَ لاَ وَهمٍ، كَذالكَ رَبُّنَا عَزَّوجَلَّ۔[1]

ترجمہ: اس کلام میں، واحد کے چار معنی بیان کیے گئے ہیں: واحد عددی، واحد نوعی، واحد بہ معنائے بے نظیر، واحد بہ معنای تجزیہ ناپذیر۔ اول کے دونوں معنی ذات حق عزّوجل کے لئے صحیح نہیں ہیں، کیونکہ خداوند عالم نہ تکثر و تعدد پذیر ہے اور نہ ہم جنس اور نہ ہم نوع کا حامل ہے۔ ہاں دوسرے دونوں معنی خداوند عالم کے لئے قابل اثبات ہیں۔

توحید کی اہمیت:

آیات اور روایات میں توحید کا مقام: اکثر قرآنی آیتیں اور معصومینؑ سے منقول روایتیں بلاواسطہ یا باالواسطہ توحید سے مرتبط ہیں۔ قرآن واحادیث کے مطالعہ سے توحید کے بارے میں جو اہم باتیں سامنے آتی ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ **نجات:** انسانوں کو فلاح اور رستگاری فقط توحید کے پرچم تلے مل سکتی ہے۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: قولوا لااله الا الله تُفلحوا۔[2]

۱۔ دلشاد تہرانی، مصطفیٰ، سیری در تربیت اسلامی، ص ۸۳

۲۔ صدر المتالہین شیرازی، محمد، المبداء والمعاد، ج ۱۸، ص ۲۰۲

فبالتوحید حرّم اجساد امتی علی النار[۱]۔

حدیث قدسی میں آیا ہے انی انا اللہ لااله الا انا من اقر بالتوحید دخل حصنی و من دخل حصنی امن عذابی[۲]۔

۲۔ فرد اور معاشرہ کی معنوی حیات توحید سے وابستہ ہے، جیسا کہ حضرت علیؑ ارشاد فرماتے ہیں : التوحید حیاۃ النفس۔اسی لئے قرآن مجید نے کفار کو توحید سے دور رہنے کی وجہ سے مردہ قرار دیا ہے اور انھیں زندہ لوگوں کے مقابلے میں شمار کیا ہے[۳]۔

یُنذِرَ مَن كَانَ حَيًّا وَيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكَافِرِينَ۔ ترجمہ : تاکہ اس کے ذریعہ زندہ افراد کو عذاب الٰہی سے ڈرائیں اور کفّار پر حجّت تمام ہو جائے[۴]۔

۳۔ تمام انسانوں کا اس حیات بخش عنصر پر فطری اور مسلّم حق ہے اور ہر ایک اس سے فائدہ حاصل کر سکتا ہے اور مادی حیات کی طرح اس سے کسی کو روکا نہیں جا سکتا اور خود کو بھی اس سے محروم نہیں رکھا جا سکتا ہے۔

۴۔ توحید، تمام ادیان الٰہی کی اصل بنیاد ہے:

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّـهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّـهِ۔

ترجمہ : اے پیغمبر آپ کہہ دیں کہ اہلِ کتاب آؤ ایک منصفانہ کلمہ پر اتفاق کرلیں کہ خدا کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کریں، کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں اور آپس میں ایک دوسرے کو خدائی کا درجہ نہ دیں۔[۵]

۱۔ المبداء والمعاد ،ج ۳،ص ۲۰۶

۲۔ایضاً، ج ۲۲

۳۔ الراغب اصفہانی، مفردات الفاظ قرآن، ص ۲۴

۴۔ سورہ یٰس، آیت ۷۰

۵۔ سورہ آل عمران، آیت ۶۴

علم توحید کی شرافت: ہر علم کی قیمت،اس علم کے موضوع کی بنیاد پر ہوتی ہے۔علم توحید،اپنے موضوع کی شرافت کے لحاظ سے تمام علوم میں سے بہترین علم ہے۔ توحید کی شرافت کی تصدیق کے لئے اتنا کافی ہے کہ ہم اس بات پر توجہ دیں کہ تمام کائنات ایک خاص طرح سے خداوند عالم سے مرتبط ہے لیکن خداوند عالم کے اسماو صفات کے لامحدود ہونے کی وجہ سے بشر اس کی حقیقت کو درک کرنے سے عاجز ہے۔

لا یدرکه بعد الهمم و لا ینا له غوص الفتن ۔[1]

خداوند عالم مطلق ہے جس کی وجہ سے اس کی کنہ اور ذات،انسان کے دائرۂ شناخت سے خارج ہے۔خداوند کا مطلق ہونا ذات حق کا کمال ہےاور اللہ تعالی کے کمال مطلق ہونے پر مکمل یقین کرنا،انسان کا کمال ہے۔

توحید پر عقیدہ رکھنے کا نتیجہ: توحید پر نظری اعتقاد کی وجہ سے انسان اس معرفت تک پہونچتا ہے کہ تمام کمالات اور جمالات ذات خداوند میں منحصر ہیں۔ یہی اعتقاد عمل کے ہر مرحلہ پر جامعہ بشری کو اتحاد کی طرف دعوت دیتا ہےاور اختلاف اور تشتت سے روکتا ہے؛ کیونکہ انسان کو صحیح سمت کی طرف چلنے کے لئے آمادہ کرتا ہے[2]۔

دین اور دینداری کا محور

توحید معارف دین کی بنیاد اور اساس: قرآن کریم اور ائمہ معصومین (علیہم الاسلام) کی تعلیمات سے معلوم ہوتا ہے کہ توحید دین کی بنیاد ہے۔

اَوَّلُ الدّینَ مَعرِفَتُهُ وَ کَمَالُ مَعرِفَتِه التَّصدیقِ بِهِ و کَمَالُ التَّصدیقِ بِهِ تَوحیدُهُ۔

ترجمہ: خدا شناسی، سرآغاز دین ہے اور معرفت خدا کا کمال، خدا پر یقین رکھنا ہےاور خدا پر یقین رکھنے کا کمال،اس کے یکتا ہونے کی گواہی دینا ہے[3]۔

قُلْ إِنَّمَا يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَـٰهُكُمْ إِلَـٰهٌ وَاحِدٌ فَهَلْ أَنتُم مُّسْلِمُونَ۔ ترجمہ: آپ کہہ دیجئے کہ ہماری طرف صرف یہ وحی آتی ہے کہ تمہارا خدا ایک ہے تو کیا تم اسلام لانے والے ہو۔[4]

۱۔ طریحی، فخر الدین، مجمع البحرین، ص ۳۲
۲۔ مفردات الفاظ قرآن ، صص ۲۴۔۲۵
۳۔ مجمع البحرین، ص ۳۲
۴۔ سورہ انبیا، آیت ۱۰۸

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو مجھے دین کی وحی ہوتی ہے وہ توحید اور اس کے فروعات کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور معارف، احکام اور اخلاق تمام توحید کی فروعات میں سے ہیں، اس کی دلیل یہ ہے کہ حصر "اَنَّما" حصر "اِنَّما" کے بعد واقع ہوا ہے جس سے حصر حقیقی ظاہر ہوتا ہے۔[۱]

آیہ کریمہ الر كِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِن لَّدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ ﴿۱﴾ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّـهَ إِنَّنِي لَكُم مِّنْهُ نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ،[۲] کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی جملہ تعلیمات جیسے معارف الٰہی، اخلاقی فضائل، تشریع احکام، آغاز اور انجام خلقت، جنت اور جہنم وغیرہ صرف اور صرف توحید کی حقیقت پر مبنی ہیں۔ توحید دین خدا کی سنگ بنیاد ہے لیکن وہ توحید جسے اسلام پہچنواتا ہے، جس کا ماننا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام اشیائے عالم کا ربّ ہے اور اس کے علاوہ کوئی ربّ نہیں ہے۔[۳]

توحید دوسرے اصول دین کے اثبات کا محور: توحید کے بعد، دین کے اہم ترین بنیادی اصول، نبوت، امامت اور قیامت ہیں جن کے اثبات کی اہم ترین دلیل توحید ہے۔ بطور مثال قرآن مجید میں، معاد توحید کے اقرار سے پائے اثبات کو پہونچتی ہے:

اللَّـهُ لَا إِلَـٰهَ إِلَّا هُوَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّـهِ حَدِيثًا ۔ترجمہ: اللہ وہ خدا ہے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے۔ وہ تم سب کو روزِ قیامت جمع کرے گا اور اس میں کوئی شک نہیں ہے اور اللہ سے زیادہ سچی بات کون کرنے والا ہے[۴]۔

اس آیت میں خدا کی وحدانیت، معاد پر دلالت کرتی ہے۔ اسی طرح جیسے خدا کا وجود اس کی وحدانیت پر بھی دلیل ہے اور معاد کی ضرورت پر بھی دلیل ہے۔[۵]

۱۔ شیخ صدوق، توحید، ج ۱۴، ص ۴۶۷

۲۔ سورہ ہود، آیت ۱ و ۲

۳۔ توحید، ج ۱۰، ص ۱۹۹۔۲۰۰

۴۔ سورہ نساء، آیت ۸۷

۵۔ الفراہیدی، خلیل بن احمد، کتاب العین، ج ۴، ص ۱۴۰

توحید انبیا کی تعلیمات کا مرکز: قرآن کریم نے کئی آیتوں میں فلسفہ رسالت اور دعوت انبیا کو فقط وحدانیت اور توحید الٰہی کے بیان اور شرک سے لوگوں کی دوری بتایا ہے:

وَالَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَفْرَحُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمِنَ الْأَحْزَابِ مَن يُنكِرُ بَعْضَهُ قُلْ إِنَّمَا أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللَّهَ وَلَا أُشْرِكَ بِهِ إِلَيْهِ أَدْعُو وَإِلَيْهِ مَآبِ۔ ترجمہ: اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس تنزیل سے خوش ہیں اور بعض گروہ وہ ہیں جو بعض باتوں کا انکار کرتے ہیں تو آپ کہہ دیجئے کہ مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ کی عبادت کروں اور کسی کو اس کا شریک نہ بناؤں۔ میں اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف سب کی بازگشت ہے[۱]۔

يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ أَأَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾ مَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءً سَمَّيْتُمُوهَا أَنتُمْ وَآبَاؤُكُم مَّا أَنزَلَ اللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَانٍ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ۔

ترجمہ: میرے قید خانے کے ساتھیو! ذرا یہ تو بتاؤ کہ متفرق قسم کے خدا بہتر ہوتے ہیں یا ایک خدائے واحد و قہار۔ تم اس خدا کو چھوڑ کر صرف ان ناموں کی پرستش کرتے ہو جنہیں تم نے خود رکھ لیا ہے یا تمہارے آباواجداد نے -اللہ نے ان کے بارے میں کوئی دلیل نازل نہیں کی ہے جب کہ حکم کرنے کا حق صرف خدا کو ہے اور اسی نے حکم دیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کی جائے کہ یہی مستحکم اور سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے ہیں[۲]۔

یہ حصر توحید کے علاوہ کسی بھی دوسرے دینی امور کے لئے ذکر نہیں ہوا ہے اس بنا پر نبوت اور بعثت کا اصلی ہدف توحید ہے۔

۱۔ سورہ رعد، آیت ۳۶

۲۔ سورہ یوسف، آیت ۳۹ و ۴۰

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا (۴۵) وَدَاعِيًا إِلَى اللَّـهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا۔ ترجمہ: اے پیغمبر ہم نے آپ کو گواہ، بشارت دینے والا، عذاب الٰہی سے ڈرانے والا اور خدا کی طرف اس کی اجازت سے دعوت دینے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے[۱]۔

اس آیت میں بیان کئے گئے تمام نظریات سے واضح ہے کہ تنہا خدا کی طرف دعوت ایسی چیز ہے جو اصلی ہدف شمار ہو سکتی ہے۔

توحید دعاؤں کا محور: اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنہ کی توحید ہر دعا کی اصل اور محور ہے۔ اسی وجہ سے ایک موحّد کی معرفت جتنی زیادہ ہوگی اس کی دعائیں اتنا ہی توحیدی مضمون سے لبریز ہونگیں۔ ائمہ معصومین علیہم السلام کی روایات میں سب سے بہترین دعا خدائے سبحان کی تہلیل، تحمید، تسبیح اور تکبیر ہے۔ اور اللہ تعالی کی حمد، تسبیح اور تقدیس سے قبل درخواست پیش کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اس حمد اور ثنا کا پیغام یہ ہے کہ کسی بھی زمانے میں اور کسی بھی فعل میں غیر خدا کو شریک نہیں کرنا چاہئے۔[۲]

حضرت امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:

"ہر وہ دعا جس کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ کی حمد نہ ہو، ناقص اور ابتر ہے اور ہدف تک نہیں پہونچتی: پہلے حمد، پھر دعا"۔ راوی نے سوال کیا: کس مقدار تک تحمید اور تمجید کفایت کرتی ہے۔ حضرت نے فرمایا:

کہو: اللھم انت الاوّل فَلَیسَ قَبلکَ شئ و انت الاخر فلیس بعدکَ شئ و انت الظاھر فَلَیس فَوقَکَ شئ و انت الباطن فلیس دونکَ شئ و انت العَزیزُ الحَکیم۔[۳]

دعا کرنے والوں کی عملی سیرت اور ان کے شہودی و حضوری فائدے اس بات کی تائید ہیں۔ مناجات شعبانیہ، دعائے ابو حمزۂ ثمالی اور دعائے سحر جیسی دعائیں، عصمت اور طہارت کے سرچشمہ سے صادر ہوئے عالی نمونے ہیں جو مکمل نور اور توحید ہیں اور کوئی جگہ یا کوئی حصہ غیر خدا کے لئے باقی نہیں چھوڑا ہے۔

۱۔ سورہ احزاب، آیت ۴۵۔۴۶

۲۔ کتاب العین، ج ۲، ص ۵۴۷۔۵۴۹

۳۔ مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار الجامعۃ لدرر اخبار الائمۃ الاطہار، ج ۲، ص ۵۰۳

قرآن میں بر محل توحید

جس طرح متکلمین اور فلاسفہ وجود خدا کے اثبات کے درپئے ہیں، قرآن ہر گز اس طرح وجود خدا کے اثبات کے درپئے نہیں ہے؛ بلکہ اللہ کے وجود کو ایک بدیہی امر اور اثبات و برہان سے بے نیاز بتاتا ہے۔ برہان اور استدلال کا استعمال فقط انسانوں کو توحید کی طرف متوجہ کرنے کے لئے ہوتا ہے کیونکہ توحید ایک امر فطری ہے۔ اسی بنیاد پر اصول دین کے بارے میں تعلیمات انبیا کا اصل مقصد، فطرت انسانی کو "توجہ دلانا" ہے، نہ کہ اصول کی تعلیم:

فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ ۔ ترجمہ: لہٰذا تم نصیحت کرتے رہو کہ تم صرف نصیحت کرنے والے ہو۔[۲]

یہاں تک کہ قرآن وجود خالق یکتا کی تردید کو بے معنیٰ بتاتا ہے:

أَفِي اللَّـهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ ۔ ترجمہ: تمہیں اللہ کے بارے میں بھی شک ہے جو زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا ہے[۳]۔

اسی طرح قرآن نے منکران مبدا اور معاد کے اقوال کو بہت کم بیان کیا ہے تاکہ اس طرح ان کے قول کا بے اہمیت ہونا زیادہ سے زیادہ آشکار ہوسکے۔ قرآن کریم کی آیات اور ائمہؑ طاہرین علیہم السلام کی دعاؤں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے فطرت توحیدی کو دلوں میں مستقر کردیا ہے۔[۴] اس لئے انسانی دلوں کا توحید سے رابطہ، عَرَض اور معروض کا رابطہ نہیں ہے، بلکہ انسان کا دل، عارف اور موحّد بنایا گیا ہے، کچھ اس طرح کہ اگر اس سے عرفان اور توحید زائل ہوجائے، تو اس کے قلب کی حقیقت بدل جاتی ہے اور انسانیت کے مقام سے تنزّل پذیر ہوجاتا ہے۔ اسی بنیاد پر خداوند عالم کافروں کی توصیف میں فرماتا ہے:

۱۔ سورہ غاشیہ، آیت ۲۱
۲۔ کتاب العین، جلد ۱۲، ص ۵۰ و ۵۱ و ۷۳
۳۔ سورہ ابراہیم، آیت ۱۰
۴۔ نہج البلاغہ، ص ۶۳

إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلاً۔ ترجمہ: یہ سب جانوروں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی کچھ زیادہ ہی گم کردہ راہ ہیں[1]۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ توحید، اصل اور شرک عارضی ہے، اسی لئے عام حالات میں لوگ ظواہر میں مشغول ہوجاتے ہیں اور مسبّب بالذات سے غافل رہتے ہیں، لیکن مصیبت کی گھڑی میں جب ظاہری اسباب منقطع ہوجاتے ہیں وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ [2] اور تمام اعتباری نسبتیں منقطع ہوجاتی ہیں: فَلَا أَنسَابَ بَيْنَهُمْ۔ [3] انسان اندرونی جذبہ کی بدولت مسبّب الاسباب کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس سے امید کی لو لگاتا ہے اور اسی بنیاد پر اس کی فریاد استغاثہ بلند ہوتی ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص بالکل ناامید ہوجائے اور پھر بھی وہ علیم وقدیر مطلق کی طرف عبادی لگاؤ نہ رکھتا ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی فطرت نابینا ہوچکی ہے اور وہ ایک موجود پست میں تبدیل ہوچکا ہے۔

إِنَّهُ لَا يَيْأَسُ مِن رَّوْحِ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُونَ۔ ترجمہ: اس کی رحمت سے کافر قوم کے علاوہ کوئی مایوس نہیں ہوتا ہے[4]۔

کیونکہ کافروں کی فطرت موحد انسان کی فطرت نہیں ہے لہٰذا وہ إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلاً[5] کی منزل میں ہیں۔

مراحل توحید

رسول خداؐ نے ارشاد فرمایا: اللهُمَّ اِنّی اَعُوذُ بِعَفوِكَ مِن عِقابِكَ وَ اَعوذُ بِرِضاكَ مِن سَخَطِكَ وَ اَعُوذُ بِكَ مِنكَ۔ اہل حقیقت نے اس کلام سے استفادہ کرتے ہوئے توحید کے لئے تین مرحلہ طے کیا ہے:

۱۔ سورہ فرقان، آیت ۴۴
۲۔ سورہ بقرہ، آیت ۱۶۶
۳۔ سورہ مومنون، آیت ۱۰۱
۴۔ سورہ یوسف، آیت ۸۷
۵۔ سورہ فرقان، آیت ۴۴

توحید عامہ (توحید عقلی): اس مرحلہ کی توحید اسلام کی بنیاد اور شرک جلی سے نجات کا ذریعہ ہے، جسے لااله الاالله وحده لاشريك له ، الاحد، الصمد، الذی لم يلد و لم يولد و لم يكن له كفواً احد کی گواہی کہتے ہیں۔ توحید کے اس مرتبہ کی بنیاد پر قبلہ واحد کا التزام ہوتا ہے، جان اور مال محترم شمار ہوتے ہیں اور سرزمین اسلام، کفر سے جدا ہو جاتی ہے۔ دین کا یہ مرتبہ عام لوگوں کے لئے قابل قبول ہے، باوجودیکہ کوئی صحیح دلیل اس پر نہ لا سکتے ہوں۔[1]

اس مرحلہ میں توحید دو حصوں میں تقسیم ہوتی ہے: (۱) توحید تقلیدی، (۲) توحید برہانی۔ توحید تقلیدی کمتر درجہ کی توحید ہے جو کفر اور اسلام کے بیچ حد فاصل ہے۔ توحید برہانی توحید خواص (علما) ہے جنھیں نجات یافتہ مانا جاتا ہے۔

خواص کے دو حصہ ہیں، پہلے گروہ میں وہ ہیں جو برہان تمانع سے استدلال کرتے ہیں لو كان فيهما الهة الا الله لفسدتا۔ دوسرے گروہ کے لوگ وہ ہیں جو حجت، اتصال، تدبیر اور وحدت صانع سے استدلال کرتے ہیں جن کا ذکر معصومینؑ کے اقوال میں ہوا ہے۔ توحید کے سلسلہ میں پیغمبرِ اکرمؐ سے منقول روایتیں، اور دیگر مضبوط دلیلیں جو مختلف طریقوں سے خلاق ہستی کی توحید پر دلالت کرتی ہیں، توحید کے اس مرتبہ کی بنیاد ہیں۔

اس درجہ کی توحید کو قبول کرنا، نقلی دلیلوں (توحید پر آیات اور روایات کی دلالت) کے ذریعہ سے واجب ہو جاتا ہے، مگر مٹھاس کا احساس اور اس کے معنی کا احساس اس بصیرت سے ہوتا ہے، جسے خداوند عالم مؤمن کے قلب پر ڈالتا ہے اور شواہد کے مشاہدے، ظواہر میں تامّل اور زمین اور آسمان کی خلقت میں تفکر کے سبب مرحلہ رشد اور کمال سے نزدیک ہو جاتا ہے[2]۔

توحید خاصّہ (توحید عینی): توحید کا یہ درجہ اہل سیر و سلوک کے متوسط گروہ سے مربوط ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ موحّد ظاہری اسباب پر اعتماد نہ کرے اور ان اسباب پر اپنے امور کو معلق نہ کرے اور ان کی تاثیر اور فعلیت کو صرف اور صرف حق تعالیٰ کی جانب سے جانے اور حقیقت میں لا مؤثر فی الوجود اِلّا الله اور لا فاعِلَ اِلّا الله کا مشاہدہ کرے۔ اس مرحلہ کا موحّد احکام شریعت اور عقل میں کشمکش جو کہ اس کی

۱۔ آمدی، عبدالواحد بن محمد، شرح غرر الحکم و درر الکلم، ص ۳۲۰۔ ۳۲۲

۲۔ شرح غرر الحکم و درر الکلم، ص ۳۲۲

حکمتوں کو نہ سمجھ پانے کی وجہ سے ہوتی ہے نیز علما وفضلا کے مجادلات (جیسے فلاسفہ اور متکلمان کے تنازعات) پر دھیان نہیں دیتا ہے۔اسی طرح وہ شواہد کے مرحلہ سے آگے جا چکا ہے۔اور نہ توتوحید کے لئے اسے دلیل کی ضرورت ہے اور نہ توکل کے لئے سبب کی تلاش اور نجات کے لئے وسیلہ کا خواہاں ہے۔[۱] یہ لوگ فنائے علمی تک پہونچ چکے ہیں، جو حضرت صفات اور اسما (حضرت واحدیت) میں فنا ہے، لیکن ابھی تک عین فنا جو کہ ذات حضرت احدیت ہے ان کے لئے ظاہر نہیں ہو سکا ہے۔

توحید اخصّ الخواص (توحید ذاتی): در حقیقت اس مرحلہ کی توحید خدائے تعالیٰ سے مخصوص ہے اور اس نے اس توحید کی ایک جھلک اپنے بندوں کے ایک گروہ پر ڈالی ہے۔یہ لوگ "اھل اللّٰہ" ہیں جو فنا کے بعد، حالت بقا میں زندگی گذار رہے ہیں۔ان لوگوں کا مقام، مقربین کا مقام اور ان کی توحید، پچھلے دونوں گروہوں سے برتر ہے۔توحید کا یہ مرحلہ تمام خلایق کے فنا ہونے اور بقائے حق سے تحقق پذیر ہوتا ہے اس لئے اس کے بارے میں غیر خدا کچھ بیان نہیں کر سکتا ہے اور کسی ایک عبارت میں اس کی تعبیر نہیں کی جاسکتی ہے۔اس مقام پر موحد بھی اس کی توصیف اور ظہور سے عاجز ہے؛ کیونکہ اس مقام کی کوئی صفت نہیں ہے جس سے اس کی تعریف کی جائے اور جتنی بھی خصوصیات ہیں وہ تمام حضرت احدیت کی ہیں اور اس کے بارے میں کوئی خبر بھی نہیں دی جاسکتی؛ کیونکہ وہ ہر خبر سے بالاتر ہے[۲]۔

یہ گروہ اس مقام پر پہونچ چکا ہے کہ ان کے لئے نہ کثرت، شہود وحدت قاہرہ حق کے لئے مانع ہے اور نہ شہود وحدت حق، شہود کثرت خلق کے لئے مانع ہے۔جیسا کہ امیر المومنینؑ کے بارے میں نقل ہوا ہے کہ رکوع (جہاں حضرت حق تعالیٰ سے اعلیٰ درجہ کی توجہ برقرار ہے) میں اپنی انگوٹھی سائل کو بخش دیتے ہیں۔

۱۔ شرح غرر الحکم ودرر الکلم، ص ۳۲۳

۲۔ ایضاً، ص ۳۲۵

دعا

معصومین علیہم السلام کے نورانی کلمات کا ایک عظیم حصّہ ربّ الارباب سے مناجات اور اس کے وجود سے درخواست والتجا کی شکل میں ہے جسے ہم دعا کہتے ہیں اور جو راہ توحید کے سالکین کو عظیم اور لطیف تعالیم کا درس دیتی ہے۔ راغب نے مفردات میں، کلمہ دعا کے لئے، پانچ معنی بیان کئے ہیں:

❖ ندا: وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً ، ترجمہ: جو لوگ کافر ہو گئے ہیں ان کی مثال اس شخص کی ہے جو جانوروں کو آواز دے اور جانور پکار اور آواز کے علاوہ کچھ نہ سنیں اور نہ سمجھیں۔[1]

❖ تسمیہ: لَّا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُم بَعْضًا۔ ترجمہ: مسلمانو! خبردار رسول کو اس طرح نہ پکارا کرو جس طرح آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔[2]

❖ سوال (مادی یا معنوی درخواست): قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ، ترجمہ: ان لوگوں نے کہا کہ اچھا خدا سے دعا کیجئے کہ ہمیں اس کی حقیقت بتائے۔[3]

❖ استغاثہ (فریاد) اور مدد چاہنا: وَإِذَا مَسَّ الْإِنسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنبِهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا ، ترجمہ: انسان کو جب کوئی نقصان پہنچتا ہے تو اٹھتے بیٹھتے کروٹیں بدلتے ہم کو پکارتا ہے۔[4]

❖ کسی خاص ہدف تک پہونچنے کے لئے ترغیب دینا: وَيَا قَوْمِ مَا لِي أَدْعُوكُمْ إِلَى النَّجَاةِ وَتَدْعُونَنِي إِلَى النَّارِ۔ ترجمہ: اور اے قوم والو آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ میں تمہیں نجات کی دعوت دے رہا ہوں اور تم مجھے جہنم کی طرف دعوت دے رہے ہو۔[5]

۱۔ سورہ بقرہ، آیت ۱۷۱
۲۔ سورہ نور، آیت ۶۳
۳۔ سورہ بقرہ، آیت ۶۸
۴۔ سورہ یونس، آیت ۱۲
۵۔ سورہ غافر، آیت ۴۱

لغت کی دوسری کتابوں میں، موارد بالاکے علاوہ، دوسرے معنی بھی ذکر ہوئے ہیں ،مثال کے طور پر :

❖ عبادت : إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّـهِ عِبَادٌ أَمْثَالُكُمْ ۔ترجمہ : تم لوگ جن لوگوں کو اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہو سب تم ہی جیسے بندے ہیں۔[۱]

❖ نسبت دینا : أَن دَعَوْا لِلرَّحْمَـٰنِ وَلَدًا۔ترجمہ : کہ ان لوگوں نے رحمان کے لئے بیٹا قرار دے دیا۔[۲]

❖ عذاب کرنا: تَدْعُو مَنْ أَدْبَرَ وَتَوَلَّىٰ۔ترجمہ : ان سب کو آواز دے رہی ہے جو منہ پھیر کر جانے والے تھے۔[۳]

❖ ترغیب دینا یا مجبور کرنا، لگے ہوئے دستر خوان پر لوگوں کو بلانا، خداوند عالم کی طرف شوق سے آنا وغیرہ۔[۴]

لغت سے ہٹ کر اہل دل کے قاموس میں بھی دعا کا ایک خاص معنی ہوتا ہے۔دعا وہ معنوی حالت ہے جس سے انسان اور اس کے معبود کے درمیان اُنس پیدا ہوتا ہے اور انسان ربوبی جذبہ سے ہمکنار ہوتا ہے۔[۵]

دعا اور دعوت کے معنی مدعوّ کی توجہ حاصل کرنا ہے جو غالباً لفظ سے یا اشارے سے حاصل ہوتا ہے اور اجابت یا استجابت داعی کی دعوت قبول کرنا اور اس کی طرف پہونچنا ہے۔حاجت طلب کرنا اور حاجت کا پورا ہونا دعا کے معنی کا جز نہیں ہے بلکہ اس کا متمم ہے۔[۶]

مدعو کی حقیقت

دعا کے مفہوم پر توجہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مدعو یعنی جس کی بارگاہ میں دعا کی جارہی ہے اس کو ایسا ہونا چاہئے کہ اگر وہ ارادہ کرے تو اپنی نظر کو داعی کی طرف متوجہ کرسکے۔اسی طرح صاحب قدرت اور تمکّن ہو تاکہ دعا کی استجابت میں کمزور اور عاجز نہ ہو۔فاقد درک و شعور فرد یا ایسے افراد کو پکارنا جس میں

۱۔ سورہ اعراف، آیت ۱۹۴

۲۔ سورہ مریم، آیت ۹۱

۳۔ سورہ معارج، آیت ۱۷

۴۔ صحیفہ سجادیہ، ص ۲۵۷؛ جعفری، محمد تقی، نیایش امام حسینؑ، ج ۱، ص ۱۳۸؛ حسن زادہ آملی، حسن، مد الہمم فی شرح فصوص الحکم، ص ۱۶۹

۵۔ابن منظور، جمال الدین ابوالفضل، لسان العرب، ص ۲

۶۔ توحید، ج ۱۱، ص ۴۳۴

حاجت پوری کرنے کی طاقت نہیں ہے، حقیقت میں دعا ہے ہی نہیں۔ قرآن اس طرح کی دعاؤں کو دعائے باطل کہتا ہےاور اسے دعوۃ الحق کے مقابل قرار دیتا ہے:

لَهُ دَعْوَةُ الْحَقِّ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِهِ لَا يَسْتَجِيبُونَ لَهُم بِشَيْءٍ إِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ إِلَى الْمَاءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهِ۔ ترجمہ: برحق پکارنا صرف خدا ہی کا پکارنا ہےاور جو لوگ اس کے علاوہ دوسروں کو پکارتے ہیں وہ ان کی کوئی بات قبول نہیں کر سکتے۔ انہیں پکارنا تو ایسا ہے جیسے کوئی شخص پانی کی طرف ہاتھ پھیلا کر اس سے درخواست کرے کہ تو میرے منہ تک پہنچ جا۔ حالانکہ پانی اس تک پہنچنے والا نہیں ہے۔[1]

اس آیت میں "لہ دعوۃ الحق" اور دوسری عبارت میں جو موازنہ کیا گیا ہے وہ دعوت حق اور دعوت باطل کے فرق کو بیان کرتی ہے۔ دعوت حق میں، مدعوّ دعوت کو سنتا ہےاور استجابت بھی کرتا ہےاور یہ صفات خدا سے متعلق ہے۔("دعوۃ الحق" کی اضافت موصوف کا صفت کی طرف اضافہ یا اضافۂ حقیقیہ کی قسم سے ہےاور لام مالکیّت کے معنی میں ہے)۔ دعائے باطل مستجاب نہیں ہوتی، مثال کے طور پر کسی ایسے کو پکارنا جو دعا کو نہیں سنتا یا استجابت کی قدرت نہیں رکھتا، کیونکہ آیت کی دوسری قسم کی بنیاد پر غیر خدا کو پکارنا ضلالت میں پڑے کافروں کی دعا ہے۔

"لہ دعوۃ الحق" میں ظرف کا مقدم ہونا دعا کو منحصراً خدا کے لئے ثابت کرتا ہےاور آگے کی آیت اس کو غیر خدا سے نفی کرتی ہے: والّذینَ یدعونَ مِن دونهِ لایَستَجیبُونَ لَهُم بِشیءٍ اِلّا کباسِطِ کَفَّیهِ اِلی الماءِ لِیَبلُغَ فاهُ وَ ما هُوَ بِبالِغِه۔[2] اسی لئے واقعی مدعوّ فقط خدا ہے۔

دعا داعی کی ضرورتمندی اور عدم استقلال کی حکایت کرتی ہے۔ سوال تبھی حقیقی ہوگا جب مسئول، مستقل اور غنی ہوگا اور توحید کی دلیلوں کی بنیاد پر، وہ مستقل مسئول فقط خدائے سبحان ہے۔[3] اسی بنیاد پر حضرت امام زین العابدینؑ پروردگار کی درگاہ میں اس طرح عرض کرتے ہیں:

۱۔ سورہ رعد، آیت ۱۴
۲۔ توحید، ج ۱۱، ص ۴۳۴ و ۴۳۵
۳۔ کتاب العین، ج ۲، ص ۵۴۷

اَللّٰھُمَّ اِنّی اَخلَصْتُ بِانقِطاعی اِلیکَ ...وَ صَرَفتُ وَجھی عَمَّن یَحْتاجُ الی رَفْدِکَ وَ قَلَبْتُ مَسْئالَتی عَمَّن لَم یَسْتَغنِ عَن فَضْلِکَ وَ رَایتُ اَنَّ طَلَبَ المُحْتاجِ اِلی المُحتاجِ سَفھٌ مِن رایِہ وَ ضَلَّۃٌ مِن عَقلِہِ۔ ترجمہ: خدایا! مکمل اخلاص کے ساتھ تیری طرف آرہا ہوں ... میں نے اپنا رخ ان تمام لوگوں سے موڑ لیا ہے جو خود ہی تیری عطا کے محتاج ہیں اور اپنے سوال کو ان کی طرف سے ہٹالیا ہے جو خود بھی تیرے فضل و کرم سے بے نیاز نہیں ہیں۔ اور میں نے اندازہ کرلیا کہ محتاج کا محتاج سے مانگنا فکری نادانی اور عقل کی گمراہی ہے۔[۱]

دعا کے اقسام

دعا کو مختلف بنیادوں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے:

لفظی اور غیر لفظی: دعا یا لفظی ہے یا غیر لفظی؛ دوسری عبارت میں یوں کہا جائے کہ یا قال کی زبان ہے یا حال کی زبان۔ لفظی دعا کا مطلب صاف ظاہر ہے۔ فقیر کا غنی کے سامنے دست سوال بلند کرنا زبان حال کا ایک نمونہ ہے اور اس کی تاثیر کے بارے میں کہا گیا ہے: لسان الحال افصح من لسان المقال۔

حقیقی دعا وہ ہے کہ سر کی زبان سے پہلے، دل کی زبان اور فطرت سے درخواست کرے۔ وہ دعا جو زبان ذات سے ہو مقبول اور مستجاب ہے اور سائل کے استحقاق کی بنیاد پر اس میں اضافہ ہوتا ہے۔ زبان قال اور گفتار کی دعا بھی، اس صورت میں مستجاب ہوگی جب استعداد کی زبان سے سازگار ہو اور دوسرے لفظوں میں گفتار اور حالت ایک دوسرے کی ضد نہ ہوں۔

اسی بنیاد پر، انسان کبھی کبھی بہت دعا کرتا ہے لیکن نتیجہ تک نہیں پہونچتا اور کبھی کبھی جب کہ وہ نتیجہ کے درپے نہیں ہے، اس کے باوجود وہ نتیجہ تک پہونچ جاتا ہے۔ انسان ہمیشہ محضر حق میں ہے۔ اگر اس کی خواہش، خداوند عالم کے ارادہ سے سازگار ہے تو دعا مستجاب ہے ورنہ نہیں ہے۔ ابن سینا کی تعبیر کے مطابق، دعا تبھی مستجاب ہوتی ہے جب وہ نظام احسن ہستی کے دائرہ میں ہو[۲]۔

۱۔ صحیفہ سجادیہ، دعا نمبر ۲۸، بند ۱

۲۔ منازل السائرین، صص ۸۱۔۸۲؛ آملی، سید حیدر، جامع الاسرار و منبع الانوار، صص ۱۷۴۔۱۷۵ و ۱۶، ج ۲، ص ۴۵

معیّن یا نا معیّن ہونا : دعا ممکن ہے ایک امر معیّن یا غیر معیّن کے لئے ہو[۱]۔دوسرے لفظوں میں، کبھی کبھی جو سائل قال، حال اور استعداد کی زبان میں درخواست کرتا ہے وہ بطور واضح معین ہے جیسے اللھم انی اسألك حبك و حب من یحبك و حب کل عمل یوصلنی الی قربك۔[۲]

اور کبھی کبھی مطلوب غیر معیّن اور الٰہی حکمت وصلاح پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ جیسے: رَبِّ إِنِّي لِمَا أَنزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ، ترجمہ: عرض کی پروردگار یقینا میں اس خیر کا محتاج ہوں جو تو میری طرف بھیج دے۔[۳]

دعا کرنے والوں کی قسمیں

سوال کے محرک کی بنیاد پر، درخواست دہندگان کو چند گروہ میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱. ایک گروہ کمال کو اس کے وقت سے پہلے طلب کرتا ہے۔اس کا محرک ،انسان کا طبعی استعجال ہے جسے خداوند عالم نے خُلِقَ الانسانَ مِن عَجَلَ [۴] کے ذریعہ بیان کیا ہے۔ معصومین علیہم السلام انسان کامل ہیں لہٰذا ان کی دعاؤں میں اس طرح کا محرّک نہیں پایا جاتا ہے:

حَبِّب اِلَینا مَا نَکرَہُ مِن قَضائِكَ وَ سَهِّل عَلَینا ما نَستَصعِبُ مِن حُکمِكَ وَ اَلهِمنَا الِانقیادَ لِمَا اَورَدتَ عَلَینا مِن مَشیَّتِكَ حَتّٰی لانُحب تاخیرَ ما عَجَّلتَ و لاتعجیلَ ما اَخَّرتَ۔ ترجمہ: ہم تیرے جس فیصلہ کو برا سمجھتے ہیں اسے محبوب بنادے اور جس حکم کو دشوار تصور کرتے ہیں اسے آسان بنادے۔ ہمیں اس مشیت کی اطاعت کا الہام عطا فرما جو تو نے ہم پر وارد کی ہے تاکہ جو چیز جلدی سامنے آجائے ہم اس کی تاخیر کے خواہان نہ ہوں اور جو چیز دیر میں آئے اس کی عجلت کے طلبگار نہ ہوں[۵]۔

۱۔ انصاری، خواجہ عبداللہ، منازل السائرین، ص ۴۷

۲۔ طباطبائی، سید محمد حسین، المیزان فی تفسیر القرآن، ص ۲۰۷

۳۔ سورہ قصص، آیت ۲۴

۴۔ سورہ انبیاء، آیت ۳۷

۵۔ صحیفہ سجادیہ، دعا نمبر ۳۳

۲. دوسرا گروہ جانتا ہے کہ ارادۂ خداوندی نے، بندوں کے خواہشوں تک پہونچنے کو ان کی درخواستوں سے وابستہ کر رکھا ہے۔ یہی علم ،ان کے طلب حاجت کا محرک ہے۔

۳. تیسرا گروہ اہل حضور کا گروہ ہے۔ یہ خدا کے عبد محض اور عبودیت میں کامل ہیں۔ یہ لوگ اللہ کی بارگاہ میں مستقل حاضری کی وجہ سے اپنے ظرف اور تجلیات الٰہی کو اچھی طرح جانتے ہیں اور ان کے ظرف کی بنیاد پر ان کی تجلیات میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس بناپر ان کی دعاؤں کا محرک صرف و صرف امر خداوند کا امتثال ہے جو ارشاد فرماتا ہے: وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ۔ ترجمہ: اور تمہارے پروردگار کا ارشاد ہے کہ مجھ سے دعا کرو میں قبول کروں گا۔[1]

دوسرے گروہ کی دعائیں حقیقت میں اس بات کے مد نظر ہوتی ہیں کہ خداوند متعال جواد ہےاور فیض حاصل کرنے کی ایک شرط دعا ہے۔ یہ لوگ اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ دعا کرنے والا کوئی نہ کوئی فیض ضرور حاصل کرے گا، اگرچہ اپنے خاص مقصد تک نہ پہونچے۔ روایتوں میں آیا ہے کہ جب بھی دعا کرو، ہاتھوں کو چہرے پر مس کرلو[2] اور یہ اسی معنی کی طرف اشارہ ہے کہ اپنے فیض کے حاصل ہونے سے مطمئن رہواوراسے اپنی پلکوں پر رکھو۔ البتہ یہ گروہ نہ مکنونات علم الٰہی سے آگاہ ہے اور نہ فیض حق کے حاصل ہونے کے سلسلہ میں اپنی صلاحیت سے واقف ہے۔ان کی دعائیں اس وجہ سے ہوتی ہیں کہ ایک تو وہ فیض حاصل کرتے ہیں اور دوسری طرف، یہی فیض دوسری بشارتوں کا پیش خیمہ ہے۔

تیسرے گروہ (اہل حضور) کے افراد اپنی ظرفیت اور حالات کو پہچانتے ہیں اور اسی کی مناسبت سے درخواست کرتے ہیں۔ کچھ لوگ اپنی دعا کی قبولیت کے ذریعہ اپنی ظرفیت کو پہچانتے ہیں اور کچھ لوگ جو معرفت کے بلندتر درجات تک پہنچ چکے ہیں، وہ اپنی ظرفیت کے ذریعہ یہ سمجھ جاتے ہیں کہ ان کو کون سا فیض حاصل ہوسکتا ہے۔

۱۔ سورہ غافر، آیت ۶۰

۲۔ بحار الانوار، ج ۲، ص ۳۴۲

اگر ان مقربان خدا کی حالت لفظی سوال کے مناسب ہوتی ہے تو عبودیت کے عنوان سے، درخواست کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت ایوب نے اس وقت امتحان کو ختم کرنے کے لئے خداوند عالم سے درخواست کی جب ان کی حالت اس کی متقاضی تھی۔[۱] اسی وجہ سے حضرت امام سجادؑ فرماتے ہیں:

وَاَنایاالهی عَبدُكَ الَّذی اَمَرتَهُ بِالدُعاءِ فَقَالَ لَبَّیكَ و سَعدَیكَ۔ ترجمہ: خدایا! میں تیرا وہ بندہ ہوں جسے تو نے دعا کرنے کا حکم دیا ہے، اب لبیک کہہ کر حاضر ہو گیا ہوں[۲]۔

اَللّٰهُمَّ فَها اَنَا ذا قَد جِئتُكَ مُطیعاً لِامرِكَ فیما اَمَرتَ بِهِ مِنَ الدُعاءِ مُتَنَجِّزاً وَعدَكَ فیما وَعَدتَ بِهِ مِنَ الاِجابَةِ اِذ تَقُولُ اُدعونی اَستَجِب لَكُم۔ ترجمہ: اب میں تیرے سامنے اس امر کی اطاعت کرتے ہوئے حاضر ہوا ہوں کہ تو نے دعا کا حکم دیا ہے اور اس وعدہ کی وفا کا طلبگار ہوں جو تو نے دعاؤں کی قبولیت کے بارے میں کیا ہے اور فرمایا ہے کہ تم دعا کرو میں قبول کروں گا[۳]۔

دعا، توحید تک پہونچنے کا راستہ

اب تک ہم نے توحید اور دعا کے بیچ گہرے رابطہ کے بارے میں جانا اور یہ معلوم ہو گیا کہ معصومینؑ کی ماثورہ دعائیں خصوصاً صحیفہ سجادیہ سے تمسک، توحید عملی اور نظری تک پہونچنے کے لئے بہترین ذریعہ، توحید کی بلندیوں تک پہونچنے کے لئے مناسب ترین راستہ اور توحید کے جلوؤں کے مشاہدہ کا بہترین موقع ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ دعا در اصل بہترین عمل اور رحمت حق کو طلب کرنے کا بہترین وسیلہ ہے۔

قُل ما یَعبَوا بکم ربّی لولا دعاءکم۔ اہلبیت علیہم السلام خود حالت دعا میں توحید کی بلندیوں پر، توحید کے عالی ترین جلوہ مشاہدہ کر رہے تھے اور دعا کی زبان میں صعود اور مشاہدہ کے راستے بشریت کے لئے کھول دئے۔

۱۔ منازل السائرین، ص ۷۴۔۷۹
۲۔ صحیفہ سجادیہ، دعا نمبر ۱۶، بند ۱۳
۳۔ ایضاً، دعا نمبر ۳۱، بند ۱۱

دعا کی حقیقت

حضرت امام سجادؑ ماہ رمضان کے وداع کے وقت بارگاہ ربّ العزت میں اس طرح عرض کرتے ہیں:

وَ قُلتَ اُدعُونی اَستَجِب لَکُم اِنَّ الَّذینَ یَستَکبِرُونَ عَن عِبَادَتی سَیَدخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرینَ۔ ترجمہ: اور یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ مجھ سے دعا کرو میں قبول کروں گا اور جو لوگ میری عبادت سے استکبار کرتے ہیں وہ عنقریب ذلت کے ساتھ جہنم میں داخل ہونگیں[۱]۔

اس وحیانی تعلیم سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا، عبادت کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہے، اور نبی مکرم اسلامؐ کے قول کے مطابق دعا تمام عبادات کا مغز ہے۔ الدُّعاءُ مُخُّ العبادَةِ[۲]۔ عبادت موحدین کے لئے توحید کی جلوہ گاہ ہے اور دعا کے محتوا اور اسلوب سے صرف نظر کرتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ دعا توحید عملی کا ایک اہم اور مکمل نمونہ ہے۔

اسلوب دعا:

جیسا کہ پہلے اشارہ ہو چکا ہے، دعا حضرت حق تعالیٰ کی عنایت حاصل کرنے کا وسیلہ ہے۔ اس مقصد کا حصول چار طریقوں سے ممکن ہے: (۱) توحید کا اقرار، (۲) درخواست پیش کرنا، (۳) مناجات (رازدارانہ طریقہ سے عرض نیاز)، (۴) زیارت۔

توحید کا اقرار: ائمہ طاہرین علیہم السلام سے منقول زیادہ تر دعاؤں میں صرف محبوب کو پکارا جاتا ہے۔ آپ حضرات نے اس قسم کی دعاؤں میں، خداوند عالم کو مختلف ناموں سے پکارا ہے، کیونکہ خود اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے:

وَ لِلّٰهِ الاسماءُ الحُسنی فَادعُوهُ بِها۔ ترجمہ: اور اللہ ہی کے لئے بہترین نام ہیں لہٰذا اسے ان ہی کے ذریعہ پکارو[۳]۔

۱۔ صحیفہ سجادیہ، دعا نمبر ۴۵، بند ۱۵

۲۔ المبداء والمعاد، ج ۹۳، ص ۳۰۰

۳۔ سورہ اعراف، آیت ۱۸۰

دعاؤں کے اس حصّہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے اور دعا اور مدعو کے صحیح معنی پر توجہ کرنے پر دریافت کیا جاسکتا ہے کہ ائمہ طاہرین علیہم السلام نے اللہ تعالی کے تمام اسما اور شؤون کے سلسلہ میں توحید کا اقرار کیا ہے۔ اس طرح کی دعاوں کا بہترین نمونہ، دعائے سحر ہے جس میں فقط خدا کو پکارا جاتا ہے اور کوئی درخواست اس میں نہیں ہے۔

اللّٰهُمَّ اِنّی اسأَلُكَ بِبَهائِكَ كُلِّها۔[۱]

یہ دعا حقیقت میں توحید کا اقرار ہے۔

متکلمین اور فلسفیوں نے توحید کو نظری اور عملی دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ توحید نظری کی کئی قسمیں ہیں۔ (۱) توحید ذات (۲) توحید اسما و صفات اور توحید افعال۔ توحید عملی کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ (۱) عبادت میں توحید (۲) حمد اور دعا میں توحید۔

توحید نظری :

الف) **توحید ذات**: توحید ذات کا مطلب یہ ہے کہ ذات حق ہر قسم کے بیرونی، یا وہمی اور عقلی تقسیم و ترکیب سے مبرا ہے۔ یہ معنی قرآن کریم کے معارف کا ایک حصّہ ہے:

لَیسَ كَمِثلِهِ شیءٌ۔ ترجمہ: اس کا جیسا کوئی نہیں ہے[۲]۔

یہ موضوع معصومین علیہم السلام کی دعاوں میں بھی مشہود ہے:

اِنَّكَ الواحِدُ الاحدُ الصَّمَدُ الَّذی لَم تَلِد وَ لَم تُولَد وَ لَم یَكُن لَكَ كُفُواً اَحَدٌ۔ ترجمہ: تو خدائے واحد یکتا و بے نیاز ہے جس کا نہ کوئی بیٹا ہے اور نہ باپ اور نہ تیرا کوئی ہمسر ہے[۳]۔

۱۔ المیزان فی تفسیر القران، ص ۳۰۳

۲۔ سورہ شوری، آیت ۱۱

۳۔ صحیفہ سجادیہ، دعا نمبر ۳۵، بند ۵

اَللّٰھُمَّ لَکَ الحمدُ..رَبِّ الاربَابِ وَ اِلَہَ کُلِّ مَالوہ ..لَیسَ کَمِثلِہِ شَیءٌ۔ترجمہ:خدایا ساری حمد تیرے لئے ہے....پالنے والوں کا پالنے والا، معبودوں کا معبود... تیرے جیسا کوئی نہیں ہے۔[۱]

(ب): **توحید اسماء وصفات** : قرآن،توحید اسمائے الٰہی[۲] کی بنیاد پر الٰہی اوصاف کو خدامیں منحصر جانتاہےاور یہ بتاتا ہے کہ دوسرے لوگ نہ صرف یہ کہ مستقل طور پر ان اوصاف کے حامل نہیں ہیں بلکہ بالتبع اور بالعرض بھی اس سے بے نصیب ہیں۔دوسرے لوگ فقط اپنی ذاتی صلاحیت کی بنیاد پر اوصاف الٰہی کا مظہر اور آئینہ ہیں۔

سَبِّحِ اسمَ رَبِّکَ الاَعلیٰ[۳] سے مراد یہ ہے کہ نام خدا اس بات سے منزہ (پاک) ہے کہ اس کے ساتھ دوسروں کا نام لایا جائے یا دوسرا کوئی اس صفت سے موصوف ہو۔اس کی ذات اس سے برتر ہے کہ بنائے ہوئے خداؤں کے مانند اسے پکارا جائے۔صحیفہ سجادیہ میں بھی ہم پڑھتے ہیں:

تَعالی ذکرُكَ عَنِ المَذکُورین وَ تَقَدَّسَت اَسماؤُكَ عَنِ المَنسوبینَ۔
ترجمہ: تیرا ذکر تمام قابل ذکر افراد سے زیادہ بلندتر ہے اور تیرے نام تمام نام آور لوگوں سے زیادہ مقدس ہیں۔[۴]

توجہ رکھنی چاہئے کہ اسمااور صفاتِ خداوند عالم سب برابر نہیں ہیں۔بعض خدا کی تسبیح اور تقدیس میں محو ہیں اور بعض اس کے حسن اور کمال کی حکایت کرتے ہیں جو صفات سلبیہ اور صفات ثبوتیہ کے نام

۱۔ صحیفہ سجادیہ،دعانمبر ۴۷،بند ۲
۲۔خداشناسی کے مبحث میں اسم سے مراد وہی اسماء الحسنٰی ہے جس کا ذکر قرآن میں بھی ہوا ہے۔ وللّٰہ اَسمَاءُ الحسنیٰ فادعوہ بہا (سورہ اعراف،آیت ۱۸۰)۔اسماء حسنیٰ کے مظاہر کو بھی اسماء حسنیٰ کہتے ہیں جیساکہ معصومین علیہم السلام کے لئے منقول ہے کہ نَحنُ وَاللہ الاسماء الحسنیٰ(بحار الانوار،ج۱،ص ۱۴۳)۔وصف سے مراد بھی خود کمال اور صفت ہے۔قرآن مجید میں توحید اسماء کا ذکر مختلف آیتوں میں ہوا ہے: اِنَّہُ ھُوَ الْعَزِیزُ الْحَکِیم(سورہ دخان، آیت ۴۲)۔ھوَالْاَوَّلُ والاخِرُ وَالظَّاھِرُ والْبَاطِنُ (سورہ حدید،آیت ۳)
۳۔ سورہ اعلی،آیت ۱
۴۔ صحیفہ سجادیہ،دعا نمبر ۳۹،بند ۱۴

سے معروف ہیں[۱]۔ دوسری طرف بعض صفات کا مضمون ذات ہے اور بعض صفات کا مضمون فعل ہے[۲]۔ معمولاً دعاوں میں خداوند عالم کی صفات، ثبوتیہ یا سلبیہ کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ جیسا کہ حضرت امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:

واللهُ نورٌ لاظَلامَ فيه وَ حَيٌّ لا موتَ لَهُ وَ عالِمٌ لاجَهلَ فيه وَ صَمَدٌ لا مدخلَ فيه۔ ترجمہ: خدا ایسا نور ہے جس میں تاریکی نہیں ہے، ایسا زندہ ہے جسے موت نہیں ہے، ایسا عالم ہے جس میں جہل نہیں ہے۔۔۔[۳]

اور صحیفہ سجادیہ میں ہم پڑھتے ہیں:

اَنتَ الذی لا یَحویكَ مَكانٌ وَ لم یَقُم لِسُلطانِكَ سُلطانٌ وَ لَم یُعیِكَ بُرهانٌ وَ لا بَیانٌ۔ ترجمہ: تو ہی وہ ہے جس پر کوئی مکان حاوی نہیں اور اس کی سلطنت کے مقابلہ میں کوئی سلطنت و اقتدار نہیں ہے اور کسی بیان و برہان کے مسئلہ میں عاجز نہیں ہے[۴]۔

۱۔ وہ صفات جو کہ خدا کے لامحدود کمالات کی حکایت کرتے ہیں۔ صفات ثبوتی ہیں۔ جسے کبھی صفت جمال اور کبھی صفات کمال کمال میں کہتے ہیں۔ وہ صفت جو نقص اور عیب کی حکایت کرتی ہیں اور حق تعالیٰ کی ذات اس سے پاک و پاکیزہ ہے وہ سب صفات سلبیہ ہیں کہ کبھی کبھی انہیں صفات جلالی کہا جاتا ہے۔ (کتاب العین، ج ۲، ص ۲۵۳۔۲۵۵)

۲۔ صفت ذات، ایسی صفت ہے جس کی منشا کسی غیر کی دخالت کے بغیر فقط ذات خدا ہوتی ہے۔ مثلاً لم یزل قادراً بذاته ولا مقدور، یہ اشارہ ہے کہ خدا قادر ہے؛ چاہے خارج میں کوئی مقدور ہو یا نہ ہو۔ مذہب امامیہ کے نقطہ نظر سے صفت ذات، عین ذات ہے اور جس طرح کوئی ذات خدا تک نہیں پہنچ سکتا اسی طرح کنہ صفات تک بھی نہیں پہونچ سکتا۔ جو صفت خدائے سبحان کے فعل سے نکلتی ہے اسے صفت فعل کہتے ہیں۔ خدا کی صفات فعلی اوصاف کمالی ہیں جو خدا اور اس کی مخلوقات کے بیچ تعلق کو ظاہر کرتی ہیں، جیسے خالق، مدبّر اور رازق۔ چونکہ صفات ذاتی عین ذات ہیں، اس بنا پر خداوند متعال کو ان کے مقابل متصف نہیں کی جاسکتا، لیکن صفات فعلی خدا کے مقام فعل سے انتزاع ہوتی ہیں، اس لئے خدا کو ان کے مقابل صفات سے بھی متصف کیا جاسکتا ہے۔ جیسے رضا اور غضب: "لقد رَضِیَ اللّٰه عَنِ الْمُومِنِین" (سورہ فتح، آیت ۱۸)۔ باؤ بِغَضَبٍ مِنَ اللّٰهِ (سورہ بقرۃ، آیت ۶۱)۔

۳۔ سیری در تربیت اسلامی، ص ۱۴۰، باب ۱۱، ح ۴

۴۔ صحیفہ سجادیہ، دعا نمبر ۴۷، بند ۱۶

سُبحانَكَ لاتُحَسُّ وَ لا تُجَسُّ وَلاتُمَسُّ وَ لاتُكادُ وَ لاتُماطُ و لاتُنازَعُ وَ لاتُجارى وَ لاتُمارى وَ لاتُخادَعُ وَ لاتُماكَرُ۔ ترجمہ: تو پاک و بے نیاز ہے جو نہ احساس میں آتا ہے نہ چھوا جاسکتا ہے نہ ٹٹولا جاسکتا ہے نہ اس پر کوی حیلہ چل سکتا ہے، نہ اسے راستے سے ہٹایا جاسکتا ہے نہ اس سے جھگڑا کیا جاسکتا ہے، نہ اس کا مقابلہ ہوسکتا ہے نہ اس سے بحث ہوسکتی ہے نہ اسے دھوکہ دیا جاسکتا ہے نہ اس سے کوئی مکاری چل سکتی ہے[۱]۔

قرآن کریم میں صفت ذات خداوند عالم کے عنوان سے بحث حیات کا مرکزی عنصر، ،توحید حیات کا اثبات ہے نہ کہ اس کے اصل کا اثبات [۲]۔ حضرت امام سجادؑ نے اس حقیقت کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

اَو كَيفَ يَستَطيعُ ان يَهرُبَ مِنكَ مَن لا حَياةَ لهُ اِلّا بِرِزقِكَ۔ ترجمہ: وہ تجھ سے بھاگ کر کہاں جاسکتا ہے جو تیرے رزق کے بغیر زندہ بھی نہیں رہ سکتا ہے؟۔[۳]

وَ اَنتَ حَيٌّ صَمَدٌ۔ ترجمہ: اور تو زندہ جاوید اور مرجع حاجات ہے[۴]۔

اللہ تعالی کی صفت علم کے بارے میں بھی، قرآن کریم کا اصلی محور اللہ تعالی کے عالمیت کی توحید ہے۔اس معنی میں کہ عالمِ حقیقی فقط خداوند عالم ہے وَاللَّـهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۔[۵] ترجمہ: خداسب

۱۔ صحیفہ سجادیہ، دعا نمبر ۴۷، بند ۲۷

۲۔ قرآن کی آیتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا حیات رکھتا ہے اور زندہ کرتا ہے، دوسرے حیات رکھتے ہیں اور فی الجملہ زندہ کرتے ہیں، لیکن اللہ لا الہ الا ھو الحی القیوم(آیۃ الکرسی)اور لاالہ الا ھو یُحیی و یُمیت (سورہ اعراف، آیت ۱۵۸) جیسی آیتوں سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید حیات اور احیا کو خدائے سبحان میں منحصر جانتا ہے۔ اس کی عقلی دلیل یہ ہے کہ حیات، خدا کی صفاتِ ذاتی میں سے ہے اور مثل خود ذات، مطلق اور لامحدود ہے۔ اس لئے دوسروں کے لئے جائے حیات باقی نہیں رہتی اس نظریہ کے ساتھ "اِنَّكَ مَيِّتٌ وَ اِنَّهُم مَيِّتُونَ " (سورہ زمر، آیت ۳۰)کا مطلب یہ ہے کہ تو،اور دوسرے حیات واقعی نہیں رکھتے،بلکہ انکی حیات،خدا کی حیات واقعی کی آئینہ دار (مظہر) ہے، اورایک طرح سے فقط خدا، حیّ مطلق ہے۔ (کتاب العین، ج ۲، ص ۳۱۶۔۳۱۷)

۳۔ صحیفہ سجادیہ، دعا نمبر ۵۲، بندا

۴۔ ایضاً، دعا نمبر ۴۷، آیت ۲۸

۵۔ سورہ بقرہ، آیت ۲۱۶

جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ہو اور جو کچھ دوسرے لوگ جانتے ہیں وہ اللہ تعالی کے اذن سے اور اس کی تبعیت میں ہے[۱]۔ وَ مَا اُوتیتُم مِنَ العلمِ اِلَّا قَلیلاً۔ ترجمہ: اور تمہیں بہت تھوڑا سا علم دیا گیا ہے[۲]۔

عَلَّمَ الانسانَ مَا لَم یَعلم۔ ترجمہ: انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہیں جانتا تھا[۳]۔

حضرت امام زین العابدینؑ گرفتاری اور بلا کے وقت اس طرح درگاہ خداوندی میں مناجات کرتے ہیں:

کَم نَهيٍ لَكَ قَد اَتَيناهُ وَاَمرٍ قَد وَقَفتَنا عَلَيهِ فَتَعَدّيناهُ وَ سَيِّئَةٍ اكتَسَبناها وَ خَطيئةٍ ارتَكَبناها كُنتَ المُطَّلِعَ عَلَيها دُونَ النّاظِرين۔ ترجمہ: کتنی ہی چیزیں ہیں جن سے تو نے منع کیا اور ہم نے انجام دیا اور کتنے ہی اوامر ہیں جن کا ہمیں علم ہوا لیکن ہم بڑھ گئے اور برائیوں کو حاصل کیا خطاؤں کا ارتکاب کیا اور تو ہی تمام دیکھنے والوں سے ہٹ کر دیکھتا رہا[۴]۔

آنحضرتؑ دوسری جگہ اقرار کرتے ہیں:

وَ اَنتَ اللهُ لا اِلهَ الا اَنتَ الرَّحمنُ الرَّحيمُ العليمُ الحكيمُ۔ ترجمہ: تیرے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے کہ تو رحمٰن و رحیم و علیم و حکیم ہے[۵]۔

دعائے عرفہ میں علم اہل بیت کے اعتراف کے ضمن میں، ان علوم کو الٰہی علوم بتایا گیا ہے:

رَبِّ صَلِّ عَلى اَطائبِ اهلِ بَيتِهِ الَّذينَ اختَرتَهُم لِاَمرِكَ وَ جَعَلتَهُم خَزَنةَ عِلمِكَ۔ اہل بیت علیہم السلام انسان کامل اور خلیفہ خدا ہیں اور اسی وجہ سے مکمل علم الٰہی انھیں حضرات کے پاس ہے۔ اس بات کو ماننا کہ اس علم کو خدا نے ان کے دلوں میں ڈال رکھا ہے، اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ دوسرے صاحبان علم و دانش بھی اپنے علم میں خدا کے مقروض ہیں۔

۱۔ سیری در تربیت اسلامی، صص ۳۲۹،۳۳۰
۲۔ سورہ اسرا، آیت ۸۵
۳۔ سورہ علق، آیت ۵
۴۔ صحیفہ سجادیہ، دعا نمبر ۳۴، بند ۲
۵۔ ایضاً، دعا نمبر ۴۷، بند ۶

توحید سمع و بصر کے سلسلہ میں لَیسَ کَمِثلِہِ شیءٌ وَ ھُوَ السمیعُ البَصیر جیسی آیتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تنہاخدا، سننے والااور دیکھنے والاہےاور دوسرے لوگ جو سننے اور دیکھنے کی قوت سے آراستہ ہیں، اس کے اوصاف کامظہر ہیں[۱]۔

حضرت سیدالساجدینؑ عرفہ کے روز اس طرح مناجات کرتے ہیں:

وَ اَنتَ اللّٰہُ لا الہ الّا انتَ السَمیعُ البَصیرُ۔ ترجمہ: تیرےعلاوہ کوئی خدا نہیں ہے کہ تو سننے والا اور جاننے والا ہے۔[۲]

طاقت[۳] میں توحید کے بارے میں یہ کہنا ضروری ہے کہ قدرت خداکا نامتناہی ہونا، اللہ تعالی کی ذات میں طاقت کے انحصار کی دلیل ہےاور دوسروں کی طاقتیں اللہ تعالی کی طاقت کا مظہر ہیں۔ جیسے: أَنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا ۔ ترجمہ: ساری قوت صرف اللہ کے لئے ہے[۴]۔

اس طرح کی آیتیں اللہ کی ذات میں قدرت کے انحصار کو ثابت کرتی ہیں جب کہ یہ آیت قیامت سے مربوط ہے، لیکن قیامت قدرت حق کے ظہور کا ظرف ہےنہ کہ اس کے حدوث کا[۵]۔

اکثر دعاوں میں ایسی عبارتیں ملتی ہیں جو قدرت میں توحید کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور کبھی کبھی خدا کی قدرت کے نامحدود ہونے کا بھی ذکر ملتا ہے۔ جیسے:

بِقُدرَتِہِ الَّتی لاتَعجِزُ عَن شَیءٍ وَ اِن عَظُمَ وَ لایَفُوتُھا شَیءٌ وَ اِن لَطُفَ ترجمہ: اپنی اس قدرت کی بناپر جو کسی شئے سے عاجز نہیں ہے، چاہے وہ کتنی ہی عظیم کیوں نہ ہو اور اس سے کوئی شئے چھپ نہیں سکتی چاہے وہ کتنی ہی لطیف و باریک کیوں نہ ہو۔[۶]

۱۔ کتاب العین، ج ۲، ص ۳۲۵

۲۔ صحیفہ سجادیہ، دعا نمبر ۴۷، بند ۷

۳۔ قدرت، جس کے معنی ہیں قوّت و توانائی، حکما کی اصطلاح میں انجام فعل کی قوت، مشیت کی صورت میں اور اس کا ترک عدم مشیت کی صورت میں ہے۔ فاعل کو "قادر" کہا جاسکتا ہے کہ اگر چاہے کام کو انجام دے اور اگر نہ چاہے تو اسے ترک کرسکتا ہو، (جوادی آملی، عبداللہ تفسیر موضوعی قرآن کریم، ص ۱۳۱)

۴۔ سورہ بقرہ، آیت ۱۶۵

۵۔ کتاب العین، ج ۲، ص ۳۵۹

۶۔ صحیفہ سجادیہ، دعا نمبر ۲، بند ۱

اِنَّ ذٰلِكَ لایَضیقُ عَلَیكَ فی وُسعِكَ وَ لایَتَكأَدُكَ فی قُدرَتِكَ اِنَّكَ عَلی كُلِّ شیءٍ قَدیرٌ ۔ ترجمہ: تیری وسعت میں یہ بات کوئی مشکل نہیں ہے اور تیری قدرت کے سامنے یہ مسئلہ کوئی دشوار نہیں ہے، بے شک تو ہر شئے پر قادر ہے۔[۱]

بِالقُدرَةِ الَّتی بِها تُحیی اَمواتَ العِبادِ وَ بِها تَنشُرُ مَیتَ البِلادِ۔ترجمہ: اپنی اس قدرت کے ذریعہ جس سے مردہ بندوں کو زندگی عنایت فرماتا ہے اور مردہ زمینوں میں زندگی دوڑاتا ہے۔[۲]

اس جملے میں زندہ کرنے کو اللہ تعالی کی قدرت کا گواہ بنا کر پیش کیا گیا ہے اور ہر چیز پر خدا کا کامل احاطہ اس کا لازمہ ہے۔ دعا کے بعض فقروں میں قدرت کو خداوند عالم کی ذات میں منحصر بتایا گیا ہے ۔ جیسے :

لَكَ یا اِلٰهی وَحدانِیَّةُ العَدَدِ وَ مَلَكَةُ القُدرَةِ الصَّمَدِ وَ فَضیلَةُ الحَولِ وَالقُوَّةِ وَ دَرَجةُ العُلُوِّ وَالرَّفعَةِ۔ ترجمہ: میرے مالک! عدد کی یکتائی بھی تیرے لئے ہے اور بے نیازی کی قدرت بھی تیری ہے۔ ساری قوت وطاقت اور درجات کی بلندی ورفعت سب تیرے لئے ہے۔[۳]

اس فقرہ میں جملہ کا اسمیہ ہونا اور جار ومجرور کا مقدم ہونا انحصار کو بیان کرتا ہے۔ بعض دعاؤں میں دوسروں کی طاقت کو اللہ تعالی کی طاقت کا مرہون منت بتایا گیا ہے:

اَللّٰهُمَّ وَ اِنَّكَ مِنَ الضَّعفِ خَلَقْتَنا وَ عَلَی الوَهنِ بَنَیتَنا وَ مِن ماءٍ مَهینٍ اِبتدأتَنا فَلا حَولَ لَنا اِلّا بِقُوَّتِكَ وَ لا قُوَّةَ لَنا اِلّا بِعَونِكَ۔ترجمہ:خدایا تو نے ہمیں انتہائی کمزوری کی حالت میں پیدا کیا ہے اور انتہائی ناتوانی پر ہماری بنیاد قائم کی ہے اور گندے پانی سے ہمارا آغاز کیا ہے ، تو اب تیری طاقت کے بغیر ہماری کوئی تدبیر نہیں ہے ، تیری مدد کے بغیر ہماری کوئی قوت نہیں ہے۔[۴]

۱۔ صحیفہ سجادیہ ، دعا نمبر ۱۶، بند ۳۴
۲۔ ایضاً، دعا نمبر ۴۸، بند ۱۳
۳۔ ایضاً، دعا نمبر ۲۸ ، بند ۱۰
۴۔ ایضاً، دعا نمبر ۹، بند ۵

یَا مَنِ استَسلَمَ کُلُّ شَیءٍ لقدرتہِ...یَا مَن انقادَ کُلُّ شیءٍ لِامرہِ...یا مَن بَلَغَت اِلی کُلِّ شیءٍ قدرَتہِ۔ ترجمہ: اے وہ ذات جس کی قدرت کے سامنے تمام اشیا تسلیم اور منقاد ہیں اور اس کی قدرت ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے[۱]۔

عزت[۲] خدائے سبحان کی صفت ذاتی ہے اور اپنی ذات کے مانند لا محدود ہے اور اگر کوئی حقیقی عزت سے معمور ہے تو وہ مظہر الٰہی کے عنوان سے ہوگا۔ حقیقت میں عزت وہ نفوذ ناپذیر حالت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالی کی حیات مرگ پذیر، اس کی قدرت عجز پذیر اور اس کا علم جہل و نسیان پذیر نہیں ہے[۳]۔ بہت سی دعاوں میں یہ بیان ہوا ہے کہ عزت مطلق، خدائے سبحان کے لئے مخصوص ہے:

۱۔ المیزان فی تفسیر القرآن، ص ۱۴۸

۲۔ عزّت، ایک نفوذ ناپذیر حالت ہے جو مغلوب ہونے سے روکتی ہے۔ سخت اور نفوذ ناپذیر زمین کو "ارض عَزاز" کہتے ہیں (حسن زادہ آملی، حسن، ممد الہمم فی شرح فصوص الحکم، ص: ۵۶۳، مادّہِ (ع ز ز) قرآن کریم کی تعلیمات کی بنیاد پر، عزّت کی دو قسمیں ہیں: عزت حقیقی اور عزت کاذب، عزت حقیقی کے مصادیق بہت ہیں جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے: تُعِزُّ مَن تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَن تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ۔ ترجمہ: جس کو چاہتا ہے عزّت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے۔ سارا خیر تیرے ہاتھ میں ہے۔ (سورہ آل عمران، آیت ۲۶)۔ اس طرح کی آیتیں ہمیں سمجھاتی ہیں کہ حقیقی عزت کا مخزن خداوند عالم ہے، اسی طرح ارشاد ہوتا ہے: وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلَٰكِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَا يَعْلَمُونَ۔ ترجمہ: ساری عزت اللہ، رسول اور صاحبان ایمان کے لئے ہے اور یہ منافقین یہ جانتے بھی نہیں ہیں۔ (سورہ منافقون، آیت ۸)۔ قرآن مجید جھوٹی عزت کو اس طرح بیان کرتا ہے: وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللَّهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهُ جَهَنَّمُ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ۔ ترجمہ: جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تقویٰ الٰہی اختیار کرو تو غرور گناہ کے آڑے آجاتا ہے ایسے لوگوں کے لئے جہنم کافی ہے جو بدترین ٹھکانا ہے۔ (سورہ بقرہ، آیت ۲۰۶)

وَاتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ آلِهَةً لِّيَكُونُوا لَهُمْ عِزًّا۔ ترجمہ: اور ان لوگوں نے خدا کو چھوڑ کر دوسرے خدا اختیار کرلئے ہیں تاکہ وہ ان کے لئے باعث عزّت بنیں۔ (سورہ مریم، آیت ۸۱)

عزّت کاذب کا خاتمہ قیامت میں عذاب ناگوار کی صورت میں ظاہر ہوگا اور خدا نے ایسے لوگوں کے لئے فرماتا ہے: ذُقْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْكَرِيمُ۔ ترجمہ: کہو کہ اب اپنے کئے کا مزہ چکھو کہ تم تو بڑے صاحب عزّت اور محترم کہے جاتے تھے۔ (سورہ دخان، آیت ۴۹)

۳۔ کتاب العین، ج ۲، صص ۳۶۸-۳۷۳

یا مَن لَهُ العِزَّةُ والجَمال۔ترجمہ: اے وہ ذات کہ عزت اور جمال مطلق،اس کے واسطے ہے۔[۱]

یا ذَاالعزَّةِ الدَّائِمةِ۔ترجمہ:اے ہمیشہ کی عزت رکھنے والے۔[۲]

عَزَّ سُلطانُكَ عِزّاً لاحَدَّ لَهُ بِأَوَّلِيَّة وَ لا مُنتَهى لَهُ بِآخِرِيَّة۔ترجمہ: تیری سلطنت اس قدر عزیز ہے کہ اس کی عزت کی نہ کوئی ابتدا ہے اور نہ انتہا۔[۳]

اسی طرح بیان ہوا ہے کہ دوسرے فقط عنایت حق کے پر تو میں حقیقی عزت تک پہونچنے والے ہیں ۔ والعَزيزَ مَن اَعَزَّتهُ عِبادَتُكَ[۴]۔ ترجمہ: عزیز وہی ہے جسے تیری عبادت صاحب عزت بنادے۔یعنی عزت کا معیار خدا کی عبادت ہے۔ جھوٹی عزت کے مصداق بھی، حضرت زین العابدینؑ کے کلام میں اس طرح بیان ہوئے ہیں:

فَكَم قَد رَاَيتُ يا اِلهي مِن اُناسٍ طَلَبوا العِزَّ بِغَيرِكَ فَذَلُّوا۔ترجمہ: میں نے بارہا دیکھا ہے کہ جن لوگوں نے تیرے غیر سے عزت کا تقاضا کیا ہے وہ ذلیل ہوئے ہیں۔[۵]

ج۔ **توحید افعالی**: توحید افعالی کا معنی یہ ہے کہ خداوند عالم کے علاوہ عالم میں کوئی بھی مستقل موثر نہیں ہے اور قیمومیت خلقت، مالکیت، ربوبیت، رزاقیت اور ولایت جو کہ ایک دوسرے پر مترتب ہے منحصراً،خدا کی طرف سے ہے[۶]۔ صفات فعل کی توحید میں بھی توحید ذات کی طرح مختلف قسمیں ہوتی ہیں اور دعاوں میں ان تمام اقسام کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

ا۔ **خالقیت میں توحید**: قرآن مجید کی مختلف آیات سے، توحید خالقیت اور خداوند عالم میں اس کا انحصار ثابت ہوتا ہے:

۱۔المیزان فی تفسیر القرآن، ص ۱۴۵
۲۔ایضاً، ص ۱۴۲
۳۔ صحیفہ سجادیہ، دعا نمبر ۳۲، بند ۴
۴۔ ایضاً، دعا نمبر ۳۵، بند ۴
۵۔ ایضاً، دعا نمبر ۲۸، بند ۶
۶۔کتاب العین، ج ۲، ص ۳۷۹

هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللَّـهِ يَرْزُقُكُم مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ۔ ترجمہ: کیا اس کے علاوہ بھی کوئی خالق ہے، وہی تمہیں آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے[۱]۔

قرآن یہ بیان کرتا ہے کہ دوسرے، حتّیٰ اگر خالق بھی ہوں تو بھی وہ حق کی خالقیت کے مظہر ہیں:

فَتَبَارَكَ اللَّـهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ۔ ترجمہ: وہ خدا جو سب سے بہتر خلق کرنے والا ہے[۲]۔

أَأَنتُمْ تَخْلُقُونَهُ أَمْ نَحْنُ الْخَالِقُونَ۔ ترجمہ: تم پیدا کرتے ہو یا ہم پیدا کرنے والے ہیں[۳]۔

حضرت امام سجادؑ عرفہ کے دن اپنی مناجات میں درگاہ پروردگار میں اس طرح عرض کرتے ہیں: اَللّٰهُمَّ لَكَ الحَمدُ بَديعَ السَّمواتِ وَالارضِ...وَ خالِقَ كُلِّ مَخلوقٍ۔ ترجمہ: خدایا! ساری حمد تیرے لئے ہے کہ تو آسمان وزمین کا موجد ہے ... مخلوقات کا خالق ہے[۴]۔

۲۔ مالکیت[۵] میں توحید: قرآن ایک طرف سے اصل وجود اور مالکیت حقیقی کو فقط خدا کے لئے ثابت کرتا ہے، اور دوسری طرف، اسے دوسروں سے سلب کرتا ہے؛ تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ۔ ترجمہ: بابرکت ہے وہ ذات جس کے ہاتھوں میں سارا ملک ہے[۶]۔

وَلَمْ يَكُن لَّهُ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ۔ ترجمہ: اور نہ کوئی اس کے ملک میں شریک ہے[۷]۔

وَالَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِهِ مَا يَمْلِكُونَ مِن قِطْمِيرٍ۔ ترجمہ: اور اس کے علاوہ تم

۱۔ سورہ فاطر، آیت ۳

۲۔ سورہ مومنون، آیت ۱۴

۳۔ سورہ واقعہ، آیت ۵۹

۴۔ صحیفہ سجادیہ، دعا نمبر ۴۷، بند ۲

۵۔ مالکیت کی دو قسم ہے: اعتباری اور حقیقی۔ قرآن کریم نے، انسانی زندگی نظام اور جامعہ بشری کے بقا کے لئے اس طرح کے اعتباری عنوان کو رسمیت دی لیکن حقیقی مالکیت، ایک امر تکوینی اور واقعی ہے؛ جیسے انسان کی مالکیت اپنے اعضا و جوارح پر۔ اس قسم کی مالکیت قرآن کی نظر میں صرف اللہ تعالی کے لئے مختص ہے: قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَمَّنْ يَمْلِكُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ (سورہ یونس، آیت ۳۱)۔

۶۔ سورہ ملک، آیت ۱

۷۔ سورہ اسرا، آیت ۱۱۱

جنہیں آواز دیتے ہو وہ خرمہ کی گٹھلی کے چھلکے کے برابر بھی اختیار کے مالک نہیں ہیں[۱]۔

پیغمبروں نے بھی، اس لئے کہ ایک گروہ، افراط کی وجہ سے مالکیت حقیقی کو ان سے نسبت نہ دے، مالکیت کو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات میں منحصر بتایا ہے:

قُل لَّا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا۔ ترجمہ: کہہ دیجئے کہ میں خود بھی اپنے نفس کے نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتا ہوں[۲]۔

حضرت امام سجادؑ نے اپنی دعاوں میں مختلف صورتوں میں توحید کی اس قسم کو بیان کیا ہے:

وَ مَضَت عَلی اِرادَتِكَ الاشیاءُ فَهِیَ بِمَشِیَّتِكَ دُونَ قَولِكَ مُؤتَمِرَةٌ وَ بِارادَتِكَ دُونَ نَهیِكَ مُنزَجِرَةٌ۔ ترجمہ: تیری ہی قوت سے فیصلے نافذ ہوگئے، اور تیرے ہی ارادے سے چیزیں چل رہی ہیں کہ وہ تیری مشیت کے بلا کہے پابند ہیں اور تیرے ارادے کے سامنے بغیر منع کئے ہوئے رکی ہوئی ہیں۔[۳]

اللّٰهُمَّ اِنَّكَ كَلَّفتَنی مِن نَفسی ما اَنتَ اَملَكُ بِهِ مِنّی۔ ترجمہ: خدایا! تو نے میرے نفس کو جن باتوں کا حکم دیا ہے ان کے بارے تیرا اختیار مجھ سے کہیں زیادہ ہے[۴]۔

۳۔ **ربوبیت میں توحید**: قرآن مجید کی نظر میں نظام تکوین اور تشریع کی ربوبیت خداوند عالم کی ذات میں منحصر ہے:

فَلِلَّهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمَاوَاتِ وَرَبِّ الْأَرْضِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔ ترجمہ: ساری حمد اسی خدا کے لئے ہے جو آسمان و زمین اور تمام عالمین کا پروردگار اور مالک ہے[۵]۔

وَالمُدَبِّراتِ اَمراً جیسی آیتیں جن میں امور کی تدبیر کو فرشتوں کی طرف نسبت دی گئی ہے، حقیقت میں انھیں مظہر تدبیر الٰہی کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ خود فرشتوں کی زبان میں فرماتا ہے:

۱۔ سورہ فاطر، آیت ۱۳

۲۔ سورہ اعراف، آیت ۱۸۸

۳۔ صحیفہ سجادیہ، دعا نمبر ۷، بند ۲ اور ۳

۴۔ ایضاً، دعا نمبر ۲۲، بند ۱

۵۔ سورہ جاثیہ، آیت ۳۶

وَمَا نَتَنَزَّلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ لَهُ مَا بَيْنَ أَيْدِينَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذَٰلِكَ۔ ترجمہ: اور اے پیغمبر ہم فرشتے آپ کے پروردگار کے حکم کے بغیر نازل نہیں ہوتے ہیں ہمارے سامنے یا پس پشت یا اس کے درمیان جو کچھ ہے سب اس کے اختیار میں ہے[1]۔

حضرت امام زین العابدینؑ کی مناجات میں ہم پڑھتے ہیں:

اللّٰهُمَّ لَكَ الحمدُ... رَبِّ الارباب۔ ترجمہ: پروردگارا تیرا شکر ہے، پالنے والوں کا پالنے والا[2]۔

حضرت امام سجادؑ، نئے مہینہ کا چاند دیکھتے وقت فرماتے تھے:

فَاسألُ اللهَ رَبِّي وَ رَبُّكَ۔ ترجمہ: اب میں اسی خدا سے سوال کر رہا ہوں جو تیرا بھی رب ہے اور میرا بھی رب ہے[3]۔

سؤال مَن لا رَبَّ لَهُ غَيرك۔ ترجمہ: اس کی درخواست ہے جو تیرے علاوہ کسی اور صاحب اختیار کو نہیں جانتا۔

۴۔ **رازقیت میں توحید**: قرآن کریم کے نقطہ نظر سے رازق فقط خداوند عالم ہے:

إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ۔ ترجمہ: بیشک رزق دینے والا، صاحبِ قوت اور زبردست صرف اللہ ہے[4]۔

اللَّهُ الَّذِي خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ۔ ترجمہ: اللہ ہی وہ ہے جس نے تم سب کو خلق کیا ہے پھر روزی دی ہے[5]۔

بعض آیتوں میں رازقیت کی نسبت دوسروں سے دی گئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے لوگ اس صفت الٰہی کے مظہر ہیں:

۱۔ سورہ مریم، آیت ۶۴
۲۔ صحیفہ سجادیہ، دعا نمبر ۴۷، بند ۲
۳۔ ایضاً، دعا نمبر ۴۳، بند ۴
۴۔ سورہ ذاریات، آیت ۵۸
۵۔ سورہ روم، آیت ۴۰

وَارْزُقُوهُمْ فِيهَا وَاكْسُوهُمْ۔ ترجمہ: اس میں ان کے کھانے کپڑے کا انتظام کردو[۱]۔

آخر میں خدا بہترین رازق اور تمام مخلوقات کے رزق کا ذمہ دار ہے:

وَاللَّـهُ خَيْرُ الرَّازِقِينَ۔ ترجمہ: اور وہ بہترین رزق دینے والا ہے[۲]۔

وَمَا مِن دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّـهِ رِزْقُهَا۔ ترجمہ: اور زمین پر چلنے والی کوئی مخلوق ایسی نہیں ہے جس کا رزق خدا کے ذمہ نہ ہو[۳]۔

اس قسم کی توحید، فراوانی کے ساتھ دعاوں میں جلوہ ریز ہے، مثلاً:

وَ جَعَلَ لِكُلِّ رُوحٍ مِنهُم قُوتاً مَعلوماً مَقسوماً مِن رِزقِهِ لا يَنقُصُ مَن زادَهُ ناقِصٌ وَلا يَزيدُ مَن نَقَصَ مِنهُم زائِدٌ۔ ترجمہ: ہر روح کے لئے ایک غذا مقرر کردی ہے جس کی کا کام بھی اپنے ہاتھوں میں رکھا ہے نہ کوئی کم کرنے والا اسے کم کرسکتا ہے اور نہ کوئی بڑھانے والا اسے بڑھا سکتا ہے[۴]۔

وَ اَجرِ مِن اَسبابِ الحَلالِ اَرزاقی۔ ترجمہ: اور اپنے لطف و رزق کو جاری فرمادے۔[۵]

ارشاد رب العزت ہوتا ہے:

وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ ﴿٢٢﴾ فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَا أَنَّكُمْ تَنطِقُونَ۔ ترجمہ: اور آسمان میں تمہارا رزق ہے اور جن باتوں کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے سب کچھ موجود ہے۔ آسمان و زمین کے مالک کی قسم یہ قرآن بالکل برحق ہے جس طرح تم خود باتیں کر رہے ہو۔[۶]

۱۔ سورہ نساء، آیت ۵
۲۔ سورہ جمعہ، آیت ۱۱
۳۔ سورہ ہود آیت ۶
۴۔ صحیفہ سجادیہ، دعا نمبر ۱، بند ۵
۵۔ ایضاً، دعا نمبر ۳۰، بند ۳
۶۔ سورہ ذاریات، آیت ۲۲۔۲۳

حضرت امام سجاد انؑ دو آیتوں کے ضمن میں ،پروردگار کی درگاہ میں اس طرح عرض کرتے ہیں:

وَاجعَل ما صَرَّحتَ بِهِ مِن عِدَتِكَ فی وَحیِكَ وَ اَتبَعتَهُ مِن قَسَمِكَ فی كِتابِكَ قاطعاً لِاهتِمامِنا بِالرِّزقِ الَّذی تَكَفَّلتَ بِهِ وَ حَسماً لِلاِشتِغالِ بِما ضَمِنتَ الكِفایةَ لَهُ۔ ترجمہ: اور جو تو نے اپنی وحی میں صریحی وعدہ کیا ہے اور اپنی کتاب میں اس کے بارے میں قسم کھائی ہے، اسے رزق کے تمام افکار کو قطع کرنے کا وسیلہ بنادے کہ تو نے اس کی کفالت کی ہے اور ان چیزوں میں مشغول ہونے سے بچالے جن کے لئے کافی ہونے کا تو خود ذمہ دار ہے۔[۱]

آن حضرت زندگی میں استعمال رزق کے طریقہ کو بھی خدا کے ہاتھ میں جانتے ہیں:

اللَّهُمَّ صَلِّ عَلی مُحَمَدٍ وَ آلِهِ وَ احجُبنی عَنِ السَّرفِ وَالاِزدیادِ وَ قَوِّمنی بِالبَذلِ وَ الاِقتِصادِ وَ عَلِّمنی حُسنَ التَّقدیرِ وَ اقبِضنی بِلُطفِكَ عَنِ التَّبذیرِ۔ ترجمہ: خدایا! محمد وآل محمد پر رحمت نازل فرما اور مجھے فضول خرچی اور زیادتی مصارف سے بچالے اور میانہ روی اور عطایا کے ذریعہ مجھے سیدھے راستے پر لگادے، مجھے صحیح اندازوں کی تعلیم دیدے۔[۲]

اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَی مُحَمدٍ وَ آلِه وَ اكفِنی مَؤونةَ الاِكتِسابِ وَ ارزُقنی مِن غَیرِ احتِسابٍ فَلا اَشتَغِلَ عَن عِبادَتِكَ بِالطَّلَبِ وَ لا اَحتَمِلَ اِصرَ تَبِعاتِ المَكسَبِ[۳]۔

ترجمہ: خدایا! محمد وآل محمد پر رحمت نازل فرما اور مجھے کرب معیشت کی زحمت سے بچالے اور رزق بے حساب عنایت فرمادے کہ میں طلب معاش میں تیری عبادت سے غافل نہ ہو جاؤں اور مجھے کسب معاش کی زحمتوں کا بوجھ نہ اٹھانا پڑے۔

۱۔ صحیفہ سجادیہ، دعا نمبر ۲۹، بند ۳
۲۔ ایضاً، دعا نمبر ۳۰، بند ۳
۳۔ ایضاً، دعا نمبر ۲۰، بند ۲۴

۵۔**ولایت میں توحید** : ولایت کے معنی سرپرستی اور تدبیر امور کے ہیں اور تکوینی اور تشریعی دونوں صورتوں میں یہ حق تعالیٰ کے صفات فعلی میں سے ہے اور قرآنی تعلیمات کی بنیاد پر، حقیقتاً خداوند متعال کی ذات سے مخصوص ہے۔ دوسرے لوگ علم، طاقت یا ذاتی مالکیت کے نہ ہونے کی وجہ سے اس ولایت میں حصہ دار نہیں ہیں:

أَمِ اتَّخَذُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ فَاللَّـهُ هُوَ الْوَلِيُّ ۔ ترجمہ: کیا ان لوگوں نے اس کو چھوڑ کر اپنے لئے سرپرست بنائے ہیں جب کہ وہی سب کا سرپرست ہے[۱]۔

وَمَا لَكُم مِّن دُونِ اللَّـهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ۔ ترجمہ: اور تمہارے لئے اس کے علاوہ کوئی سرپرست اور مددگار بھی نہیں ہے[۲]۔

البتہ قرآن کریم نے ولایت کی دو اور قسموں کے بارے میں بھی گفتگو کی ہے۔

اول: ولایت رسول خداؐ اور ائمہ طاہرینؑ:

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّـهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ ۔ ترجمہ: ایمان والو بس تمہارا ولی اللہ ہے اور اس کا رسول اور وہ صاحبانِ ایمان جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکات دیتے ہیں[۳]۔

دوم ولایت طاغوت و شیاطین:

وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَوْلِيَاؤُهُمُ الطَّاغُوتُ۔ ترجمہ: اور کفار کے ولی طاغوت ہیں۔[۴]

إِنَّا جَعَلْنَا الشَّيَاطِينَ أَوْلِيَاءَ لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ ۔ ترجمہ: بیشک ہم نے شیاطین کو بے ایمان انسانوں کا دوست بنادیا ہے[۵]۔

۱۔ سورہ شوریٰ، آیت ۹

۲۔ سورہ شوریٰ، آیت ۳۱

۳۔ سورہ مائدہ، آیت ۵۵

۴۔ سورہ بقرہ، آیت ۲۵۷

۵۔ سورہ اعراف، آیت ۲۷

لیکن ان دونوں میں سے کوئی بھی ولایت؛ ولایت خدا سے علاحدہ نہیں ہے کیونکہ اولاً انسان کامل بھی استقلال کا حامل نہیں ہے اسی لئے انبیااور اولیا مظہر ولایت الٰہی ہیں،اور ثانیاً کفار پر شیطان کی ولایت بھی ایک قسم کا عذاب اور سزا ہے اور تکوینی طور پر شیطان ان لوگوں کا ولی ہے جو اللہ تعالی کی ولایت کے بجائے دوسروں کی ولایت کو قبول کرتے ہیں۔[۱] اس لئے یہ ولایت بھی خدا سے منسوب ہے اور خود مستقل نہیں ہے۔

اس قسم کی توحید بھی دعاوں موجود ہے۔ صحیفہِ سجادیہ میں آیا ہے: اللَّهُمَّ صَلِّ عَلى مُحَمَّدٍ وَ آلِه...وَ سُمنی حُسنَ الوِلايَةِ۔ ترجمہ: خدایا، ! محمد وآل محمد پر رحمت نازل فرما ...اور مجھ پر بہترین سرپرستی کا نشان لگادے[۲]۔

توحید عملی کا اقرار:

توحید عملی یعنی انسان توحید کی بنیاد پر زندگی گزارے اور کفر آمیز اور شرک آلود راستہ نہ اپنائے۔ توحید عملی توحید کا سب سے اہم حصہ ہے جس پر قرآن مجید نے بار بار تاکید کی ہے:

وَقَضىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ۔ ترجمہ: اور آپ کے پروردگار کا فیصلہ ہے کہ تم سب اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرنا۔[۳]

وَاعْبُدُوا اللَّـهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا۔ ترجمہ: اور اللہ کی عبادت کرو اور کسی شے کو اس کا شریک نہ بناؤ[۴]۔

توحید عملی عالم تشریع کے علاوہ عالم تکوین پر بھی حاکم ہے:

إِن كُلُّ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ إِلَّا آتِي الرَّحْمَـٰنِ عَبْدًا۔ ترجمہ: زمین وآسمان میں کوئی ایسا نہیں ہے جو اس کی بارگاہ میں بندہ بن کر حاضر ہونے والا نہ ہو[۵]۔

حضرت امام سجادؑ اس حقیقت کو اس طرح بیان فرماتے ہیں:

۱۔ کتاب العین، ج ۲، صص ۴۳۲۔۴۳۵

۲۔ صحیفہ سجادیہ، دعا نمبر ۲۰، بند ۲۲

۳۔ سورہ اسرا، آیت ۲۳

۴۔ سورہ نساء، آیت ۳۶

۵۔ سورہ مریم، آیت ۹۳

سُبحانَكَ خَضَعَ لَكَ مَن جَرى فى عِلمِكَ وَ خَشَعَ لِعَظَمَتِكَ ما دونَ عَرشِكَ وَ انقادَ لِلتَّسليمِ لَكَ كُلُّ خَلقِكَ۔ ترجمہ: تو پاک و بے نیاز ہے، جو بھی تیرے حدود علم میں ہے وہ تیرے سامنے سرنگون ہے اور جو بھی تیرے عرش کے نیچے ہے وہ تیری بارگاہ میں سر تسلیم خم کئے ہوتا ہے اور تمام مخلوقات تیرے سامنے سراپا تسلیم ہے[۱]۔

توحید نظری کی طرح توحید عملی کے بھی مختلف پہلو ہوتے ہیں جن کا تذکرہ معصومین علیہ السلام کی دعاوں میں خصوصاً صحیفہ سجادیہ میں ملتا ہے۔

۱۔ **عبادت میں توحید**: عبادت یعنی ایک معبود کے سامنے اس کی ربوبیت اور الوہیت پر اعتقاد رکھتے ہوئے، جسمانی اور قلبی خضوع و خشوع کے ساتھ سر جھکانا جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی ضرورت اور فقر کو سمجھ رہا ہے[۲]۔

عبادت اللہ تعالی سے مخصوص ہے اور اس کے علاوہ کوئی نہ تو مستقل طور پر اور نہ ہی اللہ تعالی کے مظہر کے عنوان سے معبود نہیں ہے، وہ صرف بندہ ہے، حتّٰی رسول اکرمؐ بھی صرف خدا کے بندہ ہیں: اشهد انّ مُحَمَّداً عَبدُهُ۔

وَاسْأَلْ مَنْ أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رُّسُلِنَا أَجَعَلْنَا مِن دُونِ الرَّحْمَـٰنِ آلِهَةً يُعْبَدُونَ ۔ ترجمہ: اور آپ ان رسولوں سے سوال کریں جنہیں آپ سے پہلے بھیجا گیا ہے کیا ہم نے رحمٰن کے علاوہ بھی خدا قرار دیئے ہیں جن کی پرستش کی جائے[۳]۔

امام زین العابدینؑ اللہ تعالی سے درخواست کرتے ہیں کہ ان کی بندگی غرور و تکبر کے بغیر ہو:

وَ عَبِّدنى لَكَ وَ لاتُفسِد عِبادَتى بِالعُجبِ۔ ترجمہ: ہمیں عبادت میں مصروف کردے لیکن ہماری عبادت کو خود پسندی سے برباد نہ ہونے دینا[۴]۔

۱۔ صحیفہ سجادیہ، دعا نمبر ۴۷، بند ۲۶
۲۔ کتاب العین، ج ۲، ص ۵۱۶
۳۔ سورہ زخرف، آیت ۴۵
۴۔ صحیفہ سجادیہ، دعا نمبر ۲۰، بند ۳

عبادت کا بلند و برتر معنی بھی آنحضرت کے کلام سے واضح ہے:

اِلٰهی اَصبَحتُ وَ اَمسَیتُ عَبداً داخراً لَکَ، لا اَملِکُ لِنَفسی نَفعاً وَ لاضَراً اِلّا بِکَ. اَشهدُ بِذلکَ عَلی نَفسی وَاَعتَرِفُ بِضَعفِ قُوَّتی وَ قِلَّةِ حِیلَتی فَانجز لی ما وَعَدتَنی وَ تَمِّم لی ما آتَیتَنی فَاِنّی عَبدُکَ المِسکینُ المُستکینُ الضَّعیفُ الضَّریرُ الحقیرُ المهینُ الفقیرُ الخائفُ المُستجیرُ۔

ترجمہ: خدایا! میری صبح و شام اس عالم میں ہے کہ میں تیرا بندہ ذلیل ہوں، میرے اختیار میں نہ فائدہ ہے اور نہ نقصان، میں خود اپنے خلاف گواہی دے رہا ہوں اور اپنی کمزوری کا معترف ہوں کہ میرے پاس کوئی راہ تدبیر نہیں ہے لہٰذا تو خود ہی اپنے وعدوں کو پورا کردے اور اپنی دی ہوئی نعمتوں کو پورا کردے کہ میں تیرا بندہ مسکین و ذلیل و ضعیف و ناتوان و حقیر و فقیر و خوفزدہ و بے نوا اور طالب پناہ ہوں [۱]۔

امامؑ نے اس دعا میں ایک بندہ حقیقی کے اوصاف اور اس کے ایمان کو بیان فرمایا ہے اور ایمان و بصیرت کے استحکام کی دعا فرمائی ہے کیونکہ بصیرت، حقیقی عبادت کی بنیاد ہے۔

وَاَحکِمْ فِی عِبَادَتِکَ بَصِیرَتِی۔ ترجمہ: اور میری بصیرت کو، اپنی بندگی میں محکم فرما [۲]۔

قرآن کریم نے عبادت میں توحید کو مختلف دلیلوں سے ثابت کیا ہے اور وہ سب مختلف طریقوں سے دعاوں میں متجلی ہیں، جیسے برہانِ الوہیت یعنی اللہ ایسی ذات ہے جو اپنے افعال میں مطلق طور پر مستقل ہے۔ اسی لئے کسی شخص یا چیز کے سامنے اس کی الوہیت پر اعتقاد کے بغیر خضوع و خشوع کرنا عبادت نہیں ہے۔ [۳] اور اسی بنیاد پر کیونکہ خدا کے علاوہ کوئی ذات مستقل نہیں ہے لہٰذا ان کا معبود ہونا بھی باطل ہے۔

وَمَن یَدْعُ مَعَ اللَّـهِ إِلَـٰهًا آخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهُ۔ ترجمہ: اور جو اللہ کے ساتھ کسی اور خدا کو پکارے گا جس کے لئے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے [۴]۔

۱۔ صحیفہ سجادیہ، دعا نمبر ۲۱، بند ۷
۲۔ ایضاً، دعا نمبر ۳۱، بند ۱۳
۳۔ کتاب العین، ج ۲، ص ۵۲۴
۴۔ سورہ مومنون، آیت ۱۱۷

ائمہّ طاہرین کی زیادہ تر مناجاتیں لفظ "الٰہی" سے شروع ہوتی ہیں جو ہمارے دعوے کی دلیل ہے۔ اسی طرح صحیفہ سجادیہ میں آیا ہے: اللّٰھُمَّ لَکَ الحمدُ... اِلٰہَ کُلِ مِالُوہٍ۔ ترجمہ: بارالٰہا، تیرا شکر... اے ہر معبود کے معبود[1]۔

اس کلام میں امامؑ اشارہ کرتے ہیں کہ ہر شخص یا ہر چیز جو کہ دوسروں کا الٰہ واقع ہوا ہے وہ واقعی الٰہ نہیں ہے، بلکہ سبھی کا الٰہ تنہا خدا ہے۔

توحید عبادت میں قرآن کی دوسری دلیل، موت و حیات پر خداوند عالم کی مالکیت ہے:

فَلَا أَعْبُدُ الَّذِينَ تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّـهِ وَلَـٰكِنْ أَعْبُدُ اللَّـهَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُمْ۔

ترجمہ: میں ان کی پرستش نہیں کر سکتا جنہیں تم لوگ خدا کو چھوڑ کر پوج رہے ہو۔ میں تو صرف اس خدا کی عبادت کرتا ہوں جو تم سب کو موت دینے والا ہے[2]۔

حضرت امام زین العابدینؑ کی مناجات میں اس دلیل کا انعکاس موجود ہے:

سُبحانَکَ قَضیتَ عَلی جَمیعِ خَلقِکَ المَوتَ مَن وَحَّدَکَ وَ مَن کَفَرَ بِکَ وَ کُلٌّ ذائِقُ المَوتِ و کُلٌّ صائِرٌ اِلَیکَ۔ ترجمہ: تو پاک و بے نیاز ہے تو نے تمام مخلوقات کے لئے موت کا فیصلہ کر دیا ہے چاہے وہ توحید پرست یا کافر، سب موت کا مزہ چکھنے والے ہیں اور سب تیری طرف آنے والے ہیں[3]۔

حضرت امام سجادؑ نہ صرف عطائے حیات اور موت کو دست قدرت الٰہی میں بتاتے ہیں، بلکہ اس کی نوعیت کو بھی اس کی جانب سے جانتے ہیں، البتہ فرد کی ذاتی صلاحیتیں اس پر اثرانداز ہوتی ہیں:

فَأَحینی حَیاۃً طَیِّبۃً تَنتَظِمُ بِما اُریدَ وَ تَبلُغُ ما اُحِبُّ مِن حَیثُ لا اتی ما تَکرَہُ وَ لا اَرتَکِبُ ما نَھَیتَ عَنہُ وض اَمِتنی میتۃَ مَن یَسعی نُورُہُ بَینَ یَدیہِ وَ عَن یَمینہِ۔

ترجمہ: مجھے ایسی پاکیزہ زندگی عطا فرمادے جو میرے مقصد سے ہم آہنگ ہو اور مجھے میری

۱۔ صحیفہ سجادیہ، دعا نمبر ۴۷، بند ۲
۲۔ سورہ یونس، آیت ۱۰۴
۳۔ صحیفہ سجادیہ، دعا نمبر ۵۲، بند ۵

محبوب منزل تک پہنچادے جہاں میں کوئی ایسا کام نہ کروں جو تجھے ناپسند ہو اور مجھے اس مومن کی موت عطا فرما جس کا نور اس کے سامنے اور داہنے چل رہا ہو[۱]۔

نفع اور نقصان کا خداوند عالم کے ارادہ اور قدرت کے احاطہ میں محدود ہونا، توحید عبادت کی تیسری دلیل ہے:

وَلَا تَدْعُ مِن دُونِ اللَّـهِ مَا لَا يَنفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ فَإِن فَعَلْتَ فَإِنَّكَ إِذًا مِّنَ الظَّالِمِينَ ۔ ترجمہ: اور خدا کے علاوہ کسی ایسے کو آواز نہ دیں جو نہ فائدہ پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان ورنہ ایسا کریں گے تو آپ کا شمار بھی ظالمین میں ہو جائے گا[۲]۔

حضرت امام زین العابدینؑ نے اس معنی کو بڑے خوبصورت انداز میں بیان فرمایا ہے:

وَ قَد نَزَلَ بی یا رَبِّ ما قَد تَکاَّدَنی ثِقلُهُ وَ اَلَمَّ بی ما قد بَهَظَنی حَملُهُ و بِقُدرَتِكَ اَورَدتَهُ عَلَیَّ وَ بِسُلطنِكَ وَجَّهتَهُ اِلَیَّ فَلا مُصدِرِ لِما اَورَدتَ وَ لا صارِفَ لَما وَجَّهتَ و لا فاتِحَ لِما اَغلَقتَ و لا مُغلِقَ لِما فَتَحتَ۔ ترجمہ: جس کے بوجھ نے مجھے تھکا دیا ہے اور وہ آفت آپڑی ہے جس کی سنگینی نے مجھے عاجز کر دیا ہے تو نے ہی اسے اپنی قدرت سے وارد کیا ہے۔اور تو نے ہی اپنی طاقت سے اس کا رخ میری طرف موڑ دیا ہے اور اب وارد ہو جانے والے نکالنے والا اور آنے والے کو موڑنے والا اور بند دروازوں کو کھولنے والا اور کھلے راستوں کو بند کرنے والا اور... تیرے علاوہ کوئی نہیں ہے۔[۳]

امامؑ اس کی وجہ اس طرح بیان فرماتے ہیں:

فَهِیَ بِمَشیَّتِكَ دُونَ قَولِكَ مَؤتَمِرَةٌ وَ بِارادَتِكَ دُونَ نَهیكَ مُنزَجِرَةٌ۔ ترجمہ: اور تیرے ہی ارادہ سے تمام چیزیں چل رہی ہیں کہ وہ تیری مشیت کی بلا کہے پابند ہیں اور تیرے ارادے کے سامنے بغیر منع کئے ہوئے رکی ہوئی ہیں[۴]۔

۱۔ صحیفہ سجادیہ، دعا نمبر ۴۷، بند ۱۱

۲۔ سورہ یونس، آیت ۱۰۶

۳۔ صحیفہ سجادیہ، دعا نمبر ۷، بند ۵۔۷

۴۔ ایضاً، دعا نمبر ۷، بند ۳

اِنَّكَ المَنّانُ بِجَسِيمِ المِنَنِ الوَهَّابُ لِعَظِيمِ النِّعَمِ....المُحسِنُ المُجمِلُ ذُو الطّولِ۔ ترجمہ: بے شک بڑی نعمتوں سے احسان کرنے والا اور عظیم احسانات کا عطا کرنے والا ہے... تو احسان کرنے والا، نیکیاں عطا کرنے والا اور صاحب جود و کرم ہے[۱]۔

مِنَّتُكَ اِبتداءٌ۔ ترجمہ: اس کا احسان ابتدائی ہوتا ہے[۲]۔

حمد میں توحید، توحید عملی کا دوسرا جلوہ ہے۔اصطلاح میں حمد، اختیاری طور پر انجام دئے گئے نیک کاموں کی تعریف کو کہتے ہیں، چاہے اس کمال سے دوسروں کو فائدہ پہونچے یا نہ پہونچے،اگر بالذات اور بالاستقلال کی قید کو نظر میں رکھا جائے تو اس کا انحصار خدا کے لئے ثابت ہو جاتا ہے اور عبادی ہونے کا عنوان حاصل کر لیتا ہے۔ جیسے دعا اگر درخواست کرنا قید ذاتی کے ساتھ ہو اور مستقل ہو تو رنگ عبادت بھی حاصل کر لیتی ہے اور مخصوص خدا بھی ہو جاتی ہے[۳]۔

فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمَاوَاتِ وَرَبِّ الْأَرْضِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔ ترجمہ: ساری حمد اسی خدا کے لئے ہے جو آسمان و زمین اور تمام عالمین کا پروردگار اور مالک ہے[۴]۔

معصومینؑ کی دعاوں میں اس توحید کا زیادہ اقرار اور اعتراف ہوا ہے جیسے: اِلٰهی اَحمَدُكَ وَ انتَ لِلحَمدِ اهلٌ۔ ترجمہ: خدایا تیری حمد کرتا ہوں، کیونکہ فقط تو حمد کے لایق ہے[۵]۔

یہ وہی توحید ربُّ الارباب ہے۔امام سجادؑ صحیفہ سجادیہ کی پہلی دعا میں ضرورت حمد کے بارے دلایل کے ساتھ تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔اسی طرح دعائے عرفہ کے ایک حصّہ میں، حمد کے طریقہ اور اس کی وجہ بیان کی گئی ہے۔

۱۔ صحیفہ سجادیہ ، دعا نمبر ۳۶، بند ۷

۲۔ ایضاً ، دعا نمبر ۴۵، بند ۴

۳۔ کتاب العین، ج ۲، ص ۵۳۶

۴۔ سورہ جاثیہ، آیت ۳۶

۵۔ صحیفہ سجادیہ، دعا نمبر ۵۱، بند ۱

دعا میں توحید

دعا میں توحید، توحید علمی کا دوسرا جلوہ ہے ۔ حقیقی دعا، دعا کرنے والے کی حاجت اور اس کے مستقل نہ ہونے کی حکایت کرتی ہے۔ سوال اس وقت حقیقی ہے جب مسئول یعنی جس سے سوال کیا جارہا ہے مستقل اور غنی ہو۔ توحید کے دلایل کی بنیاد پر وہ مستقل مسئول فقط "خدائے سبحان" ہے۔ اسی بنیاد پر، قرآن کی نظر میں حق تعالیٰ کو خلوص نیت کے ساتھ پکارنے اور توحید کی بنیاد پر دعا میں معنی و مفہوم پیدا ہوتا ہے اور استجابت کی منزل سامنے آتی ہے :

أَمَّن يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوءَ ۔ ترجمہ : بھلا وہ کون ہے جو مضطر کی فریاد کو سنتا ہے جب وہ اس کو آواز دیتا ہے اور اس کی مصیبت کو دور کر دیتا ہے[1]۔

درخواست کے طریقہ پر دعا

اہل بیتؑ کی ماثورہ دعاوں کا ایک حصہ تقاضا اور التجا کی صورت میں ہے۔ ان دعاوں میں حضرت حق سے مختلف درخواستیں بیان ہوئیں ہیں۔ اس طرح کی دعاوں کے نمونے دعائے کمیل، عرفہ کے دن امام حسینؑ اور امام سجادؑ کی دعا، دعائے ابو حمزہ ثمالی اور صحیفہ سجادیہ کی متعدد دعائیں، جیسے، طلب باران کی دعا، گرفتاری سے نکلنے کے لئے دعا اور دعای مکارم الاخلاق وغیرہ ہیں۔

اس طرح کی دعا میں داعی اپنی توحید کو ظاہر کرتا ہے۔ دعا کرنے والا خداوند عالم سے درخواست کے ساتھ ،اس واقعیت کو بھی اجاگر کرتا ہے کہ وہ فقط خداوند عالم کو رازق، خالق، مالک ، قادر اور تمام اسمائے حسنیٰ کا مالک جانتا ہے اور اسی کو آواز دیتا ہے اور اپنی حاجت کو اس سے طلب کرتا ہے۔ یہ سارے سوال، باالواسطہ طور پر ، توحید کے متعدد مراتب کا اقرار ہیں، کیونکہ جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، خداوند عالم ہر صفت میں یکتا ہے اور دوسرے حق تعالیٰ کی صفات کے فقط مظہر بن سکتے ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ صحیفہ سجادیہ کی بہت ساری دعاؤں میں جن میں امام نے اللہ تعالی سے کوئی درخواست کی ہے، حمد، تسبیح اور توحید حق سے مختص ہے۔ گویا وہ تقاضہ ایک بہانہ تھا تاکہ امامؑ کو توحید حق اور اس کی مناجات میں غرق کردے۔

۱۔ سورہ نمل، آیت ۶۲

مناجات کی روش سے دعا

دعاوں کا تیسرا حصّہ، ربُّ الارباب سے راز و نیاز کی صورت میں ہے۔ دعاوں کی اس روش میں ائمہ طاہرینؑ نے معبود یگانہ سے راز و نیاز اور معاشقہ کے باب کھولے ہیں۔آپ نے اس مقام پر خود کو فقیر مطلق اور حق تعالیٰ کو تنہا غنی مطلق اور بالذات پایا ہے۔اور اسی لئے درگاہ حق تعالیٰ میں، اپنی طلب کو پیش کرنے کے بہانہ راز و نیاز کرتے ہیں۔آپ حضراتؑ يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّـهِ ۖ وَاللَّـهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ[1] کے آخری زینہ تک پہونچ چکے ہیں اور اسی نہج پر خدا سے راز و نیاز کرتے ہیں :

اَنا الفقیر فی غنای فکیف لا اکون فقیراً فی فقری۔ ترجمہ :۔خدایا میں اپنی تونگری میں فقیر ہوں تو کس طرح اپنی فقر کی حالت میں فقیر نہ رہوں؟[2]

یہ بیان توحید کا آخری درجہ اور ایک موحّد کا بالاترین مرتبہ ہے۔ صحیفہ سجادیہ میں امام سجادؑ، خداوند عالم کی بارگاہ میں اس طرح راز و نیاز کرتے ہیں :

یَا کَهفِی حینَ تُعیینی المَذاهِبُ وَ یا مُقیلی عَثرَتی فَلَولا سَترُكَ عَورَتی لَكُنتُ مِنَ المَفضُوحینَ وَ یا مُؤیِّدی بِالنَّصرِ فَلولا نَصرُكَ اِیّایَ لَكُنتُ مِنَ المغُلوبینَ وَیا مَن وَضَعَت لَهُ المُلُوكُ نیرَ المَذَلَّةِ علی اَعناقِها فَهُم مِن سَطَواتِهِ خائِفونَ و یا اَهلَ التَّقوی و یا مَن لهُ الاسماءُ الحُسنی۔ترجمہ :اے وہ پروردگار جو اس وقت پناہگاہ بنتا ہے جب سارے راستے عاجز کردیتے ہیں اور اے میری لغزشوں کے سنبھالا دینے والے ! اگر تیری پردہ پوشی نہ ہوتی تو میں رسوا ہو جانے والوں میں شمار ہو جاتا، اور اے اپنی نصرت سے میری تائید کرنے والے ! اگر تیری نصرت نہ ہوتی تو میں مغلوبوں میں شمار ہو جاتا اور اے وہ پروردگار جس کی بارگاہ میں بادشاہوں نے ذلت کا جوا اپنے کاندھے پر رکھا لیا ہے اور اب اس کی ہیبت سے خوفزدہ ہیں ۔اے وہ جو تقوی کے قابل ہے اور جس کے اسماء انتہائی حسین ہیں [3]۔

۱۔ سورہ فاطر، آیت ۱۵
۲۔ المیزان فی تفسیر القرآن، ص ۴۴۹
۳۔ صحیفہ سجادیہ، دعا نمبر ۵۱، بند ۷

حضرت امام سجادؑ کی مناجات خمسہ عشر اس طرح کی دعا کی بہترین مثال ہے۔

زیارت کے طریقہ سے دعا

دعاوں کی دوسری قسم زیارت ہے۔ زیارت بھی ایک طرح سے خدا سے ارتباط کا ذریعہ ہے، کیونکہ اہلبیت علیہم السلام بطور کامل حق تعالیٰ کا مظہر ہیں اور در حقیقت ان کے ذریعہ ارادہ الٰہی جاری ہوتا ہے۔ یہ بات معصومین علیہم السلام کی ماثورہ دعاوں میں وضاحت کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر، روزِ عید غدیر، زیارت امیر المومنینؑ میں آنحضرت کو عین اللہ، وجہ اللہ اور اذن اللہ کے طور پر تعارف کرایا گیا ہے۔ زیارتِ رجبیہ میں خاندان عصمت وطہارت کے اوصاف کثرت سے بیان ہوئے ہیں:

بِکُم یُجبَرُ المَهیضُ و یُشفی المریض۔ ترجمہ: آپ کے وسیلہ سے ٹوٹا ہوا متحد اور بیمار شفا پاجاتا ہے۔

زیارت جامعہ کبیرہ میں بھی اس سلسلہ میں فکر انگیز فقرات ملتے ہیں، اس زیارت میں ائمہ معصومینؑ کو ان اوصاف سے پکارا گیا ہے: معدن الرحمة، خزّان العلم، اولی الامر، خیرة الله، حجّة الله، صراط، نور اور برهان خداوندمتعال، الادلّاءِ عَلی صراطه وغیرہ۔

یہاں تک کہ ارشاد ہوتا ہے:

ایاب الخلقِ اِلَیکُم وحِسَابُهُم عَلَیکُم، اَشرَقَتِ الاَرضِ بِنُورِکُم اور مَنْ اَرادالله بدابِکُمْ؛ جو بھی خدا چاہتا ہے آپؑ سے شروع کرتا ہے۔ حقیقت میں زیارت بھی ایک توحیدی راستہ ہے۔

حضرت امام زین العابدینؑ، خداوند عالم سے اس طرح سے درخواست کرتے ہیں:

اللهم و امنُن عَلیَّ بِالحج و العُمرة و زیارة قبرِ رَسولِكَ۔ ترجمہ: خدایا میرے اوپر احسان کر تاکہ حج اور عمرہ بجالاوں اور تیرے رسولؐ اور ان کے اہل بیت علیہم السلام کی زیارت کرسکوں[۱]۔

آنحضرتؑ، اسی طرح ماہ مبارک کے استقبال اور وداع کے لئے جو کہ خداوند عالم کا مہینہ ہے، گویا زیارت نامہ پڑھ رہے ہوں اور اس بابرکت ایام سے گفتگو کر رہے ہوں کیونکہ ماہ رمضان کو خداوند عالم تک پہونچنے والے راستوں میں سے ایک راستہ مانتے ہیں۔

۱۔ صحیفہ سجادیہ، دعا نمبر ۲۳، بند ۴

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِی جَعَلَ مِنْ تِلْكَ السَّبِیلِ شَهْرَهُ شَهْرَ رَمَضَانَ[۱]

منابع و مآخذ

- قرآن کریم، ترجمہ فولادوند، محمد مہدی، دار القرآن الکریم، تہران
- نہج البلاغہ، ترجمہ دشتی، محمد، انتشارات بضعۃ الرسول، قم، ۱۳۷۹
- صحیفہ سجادیہ، (بی تا)، ترجمہ غرویان، محسن، نشر معارف، قم
- آمدی، عبد الواحد بن محمد، شرح غرر الحکیم ودرر الکلم، مترجم رسول محلاتی، سید ہاشم، دفتر نشر فرہنگ اسلامی تہران، ۱۳۷۷
- آملی، سید حیدر، جامع الاسرار ومنبع الانوار، تصحیح ہنری کوربو، عثمان یحیٰ، شرکت انتشارات علمی فرہنگی، تہران، ۱۳۴۷
- ابن منظور، جمال الدین ابو الفضل، لسان العرب، الطبعۃ الاولیٰ، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۶ق
- الراغب الاصفہانی، مفردات الفاظ قرآن، تحقیق صفوان عدنان داوودی، دار القلم، دمشق، ۱۴۱۶ق
- الفراہیدی، خلیل بن احمد، کتاب العین، تحقیق مہدی المخزونی وابراہیم السامرایی، البطعہ الاولیٰ، انتشارات اسوہ، قم، ۱۴۱۴ق
- انصاری، خواجہ عبد اللہ، منازل السائرین، شرح عبد الرزاق کاشانی، انتشارات الزہرا، تہران، ۱۳۷۹
- جعفری، محمد تقی، نیایش امام حسینؑ در صحرای عرفات، مؤسسہ نشر کرامت، تہران، ۱۳۷۶
- جوادی آملی، عبد اللہ (بی تا) حماسہ وعرفان، مرکز نشر اسراء، قم
- جوادی آملی، عبد اللہ، تفسیر موضوعی قرآن کریم، مرکز نشر اسراء، قم، ۱۳۷۷
- حسن زادہ آملی، حسن، ممد الہمم فی شرح فصوص الحکم، سازمان چاپ وانتشارات، تہران، ۱۳۷۸
- خمینی، روح اللہ، شرح دعای سحر، نہضت زنان مسلمان، تہران، ۱۳۵۹
- دلشاد تہرانی مصطفیٰ، سیری در تربیت اسلامی، موسسہ نشر وتحقیقات ذکر، تہران، ۱۳۷۷
- شیخ صدوق، توحید، مکتبہ الصدوق، تہران، ۱۳۹۱ق
- صدر المتألہین شیرازی (ملا صدرا) محمد، المبدا والمعاد، دار الہدی، بیروت، ۱۴۲۰ق

۱۔ صحیفہ سجادیہ، دعا نمبر ۴۴، بند ۳

❖ طباطبائی، سید محمد حسین، المیزان فی تفسیر القرآن، ترجمہ موسوی ہمدانی، سید محمد باقر، دفتر انتشارات اسلامی، تہران، ۱۳۷۷
❖ طریحی، فخر الدین، مجمع البحرین، مکتب المرتضویہ، تہران، ۱۳۴۲
❖ قمی، حاج شیخ عباس، مفاتیح الجنان، ترجمہ موسوی کلانتری، انتشارات پیام آزادی، تہران، ۱۳۷۴
❖ کلینی، محمد بن یعقوب، الکافی، دار الکتب الاسلامیہ، تہران، ۱۳۶۵
❖ مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار الجامعۃ لدرر اخبار الائمہ الاطہار، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۰۳ق

صحیفۂ سجادیہ میں معرفت انسان

مؤلف: عبدالحمید فرزانہ
مترجم: مولانا شیخ ممتاز علی

انسان وخدا کے عاشقانہ رابطہ کی بے حد حسین تصویر کشی کرنے والی کتاب ہونے کے ساتھ ساتھ صحیفۂ سجادیہ سیاسی، اجتماعی، اخلاقی، نفسیاتی، فلسفی، علمی اور اقتصادی موضوعات کی بھی حامل ہے۔اس مقالہ میں صحیفۂ سجادیہ کی روشنی میں انسان کی معرفت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ہم نے سب سے پہلے انسانی معرفت کا امام سید سجادؑ کے نکتۂ نظر سے ایک کلی جائزہ لیا ہے پھر انسان کے مثبت، منفی صفات، قوی اور ضعیف پہلو اور صعود وسقوط کے عوامل بیان کئے گئے ہیں، آخر میں ایک آئیڈیل انسان کی خصوصیات کو بتایا گیا ہے جو خدا کے محبوب اور کامل انسان کی تصویر ہے جسے بنانا اور پیش کرنا تمام انبیاء اور ائمہ معصومین علیہم السلام کا مقصد تھا۔

پیغمبروں اور اولیائے الٰہی کی دعاؤں میں بندہ اور معبود کے عاشقانہ رابطہ کی تجلی کے علاوہ بہت سے سبق آموز اور معرفت سے لبریز دوسرے نکات بھی موجود ہیں۔اپنے تاریخی حالات اور اپنے زمانہ کے سیاسی گھٹن کی بناپر صحیفۂ سجادیہ کی دعائیں اپنے مختلف پہلوؤں کی وجہ سے منحصر بہ فرد ہیں کیوں کہ آپ کو دینی معارف کی تبلیغ کا مناسب موقع میسر نہیں تھا۔ظالم وجابر حاکم کے خوف سے نہ صرف یہ کہ لوگ آپ کی تعلیمات سیکھنے کے لئے آمادہ نہیں تھے بلکہ آپ سے کسی طرح کا بھی رابطہ رکھنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اس وجہ سے آپ نے سیاسی، اجتماعی تعلیمات اور تمام دینی معارف کو دعاؤں کی زبان میں اپنے معبود سے راز ونیاز کے پیرایہ میں بیان کردیا۔

اس مقالہ میں چوتھے امامؑ کے نکتۂ نظر سے انسان کی معرفت کو دعاؤں کی عبارتوں میں تلاش کرکے پیش کیا گیا ہے۔اصل موضوع پیش کرنے سے پہلے ہم اسلام کی نظر میں انسان کی کلی معرفت کو پیش کرتے ہیں۔

انسان کی تخلیق کے سلسلہ میں قرآنی آیتوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انسان کے اندر دو پہلو پائے جاتے ہیں۔ ایک حصہ اس کے مادی وجود سے متعلق ہے: "ہم نے تمہیں لسدار مٹی سے پیدا کیا" ۔[۱] دوسرا حصہ معنوی اور روحانی پہلو ہے۔ قرآن کے مطابق اللہ تبارک وتعالیٰ نے ابو البشر کے اندر اپنی روح پھونک کر اسے انسانی حیات کا لبادہ عطا کیا:

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ ﴿۲۸﴾ فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ۔ ترجمہ: اور اس وقت کو یاد کرو کہ جب تمہارے پروردگار نے ملائکہ سے کہا تھا کہ میں سیاہی مائل نرم کھنکھناتی ہوئی مٹی سے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں۔ پھر جب مکمل کرلوں اور اس میں اپنی روح حیات پھونک دوں تو سب کے سب سجدہ میں گر پڑنا۔[۲]

اسلامی نقطہ نظر سے انسان اپنی ساخت کے اعتبار سے اچھا اور برا بننے کی صلاحیت رکھتا ہے اور وہ خدا کے دئے ہوئے اختیار کی بناپر حیوانیت یا الوہیت کا راستہ منتخب کرسکتا ہے:

وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا ﴿۷﴾ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ﴿۸﴾ قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا ﴿۹﴾ وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا۔ ترجمہ: اور نفس کی قسم اور جس نے اسے درست کیا ہے۔ پھر بدی اور تقویٰ کی ہدایت دی ہے۔ بے شک وہ کامیاب ہوگیا جس نے نفس کو پاکیزہ بنالیا۔ اور وہ نامراد ہوگیا جس نے اسے آلودہ کردیا ہے۔[۳]

اسلام کی نگاہ میں انسان ایک ایسا موجود ہے جس میں غریزہ بھی ہے اور فطرت بھی۔ اگر غریزہ غالب آتا ہے تو وہ حیوانیت اور بدبختی سے دچار ہوتا ہے اور اگر فطرت غالب آتی ہے تو وہ قرب الٰہی کی منزل تک پہونچ جاتا ہے۔

۱۔ إِنَّا خَلَقْنَاهُم مِّن طِينٍ لَّازِبٍ (سورہ صافات، آیت ۱۱)
۲۔ سورہ حجر، آیات ۲۸، ۲۹
۳۔ سورہ شمس، آیات ۷-۱۰

صحیفۂ سجادیہ میں انسان

انسان کی پیدائش اور اس کی ساخت

اگر انسان کی خواہشوں، اخلاق و رفتار اور قوت وضعف کو اچھی طرح پہچاننا چاہیں تو ابتدا میں انسان کی پیدائش اور اس کے اندر ودیعت رکھی گئی چیزوں پر غور کرنا ہوگا جس کی بنیاد پر خدا نے اسے ذمہ دار بنایا ہے۔

انسان کا آغاز وانجام : صحیفۂ سجادیہ کی مختلف دعاؤں کی بنیاد پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان ایک غیر ازلی مخلوق ہے اور وہ کسی حادثہ کی پیداوار نہیں ہے یا کسی ناخواستہ حرکت کی بناپر عالم وجود میں نہیں آیا ہے بلکہ اسے کسی مقصد کے لئے خلق کیا گیا ہے۔

حضرت امام زین العابدینؑ خداوند عالم کی حمد و ثنا کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اِبتَدَعَ بِقُدرَتِهِ الخَلقَ اِبتداعاً و اختَرَعَهُم عَلی مَشِیَّتِهِ اِختراعاً۔ ترجمہ: اس نے اپنی مخلوقات کو اپنی قدرت کے ذریعہ بلا کسی نمونہ کے ایجاد کیا۔[1]

وَ انتَ اللهُ لا الهَ اِلاّ انتَ الاوَّلُ قبلَ کُلِّ اَحَدٍ و الاخِرُ بعدَ کُلِّ عَدَد۔ ترجمہ: تو ہی خدا ہے تیرے سوا کوئی خدا نہیں ہے، ہر ایک سے پہلے تو اول اور آغاز ہے اور ہر چیز کے بعد تو آخر اور مرجع ہے۔[2]

امامؑ کی نظر میں خدا ہر چیز سے پہلے اور مقدم ہے اور انہیں موجودات میں سے ایک موجود انسان بھی ہے۔ بشر ممکن الوجود ہے جس کا آغاز بھی ہے اور انجام بھی ہے۔

انسانی اخلاق اور برتاؤ کی صلاحیت : امام سید سجادؑ کی نظر میں ہدایت وگمراہی اور شکر وکفر کا منشاء اس کا وجودی ساخت ہے، جیسا کہ قرآن مجید بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ انسان کمال تک پہونچے اور خدا کا بندہ بننے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے اور وہ حیوانیت اور اس سے پست مقام تک بھی پہونچ سکتا ہے:

۱۔ صحیفہ سجادیہ، دعاء ۱، بند ۳

۲۔ ایضاً، دعاء ۴۷، بند ۹

ثُمَّ سَلَكَ بِهِم طَرِيقَ إِرادَتِهِ وَ بَعَثَهُم فِي سَبِيلِ مُحَبَّتِهِ ترجمہ: اس نے (موجودات کو پیدا کیا) پھر سب کو اپنے ارادہ کے راستہ پر لگادیا اور اپنی محبت کی راہ پر چلنے کے لئے آمادہ کردیا۔[1]

اس بناپر خدااور پاکیزگی کی طرف میلان کا جذبہ انسان کے اندر موجود ہے۔ اب انسان اپنی عقل اور ارادہ کی بناپر اپنی فطری کشش کا مثبت جواب دے پھر حیوانی پہلو کے تحت دوسرا راستہ اختیار کرے۔ وہی راستہ جس کی شر سے سید سجادؑ خدا سے پناہ کے طلبگار ہیں۔[2]

انسان کے امتیازات

صحیفۂ سجادیہ کی بہت سی دعاؤں میں انسانی نیک صفات اور مثبت خصوصیتیں بیان ہوئی ہیں۔ ان میں سے یہاں بعض کا ذکر کیا جائے گا:

خداپسندی: اگر انسان اپنے اندرونی تاثرات سے محفوظ رہے تو فطری طور پر خدائے یکتا کی طرف اس کا جھکاؤ ہوگا۔ امام سید سجادؑ نے مختلف مواقع پر دعا کی زبان میں انسان کے اس میلان کا ذکر کیا ہے۔ کبھی پروردگار کی حمد و ثنا کی زبان میں خالق ہستی کے لئے اس کے سوز و گداز کا ذکر ہے تو کبھی خواہش اور درخواست کی صورت میں اس حقیقت کو بہترین الفاظ کے لباس میں سجا کر پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً صحیفۂ سجادیہ کی پہلی دعا میں اول اولین اور آخر آخرین کے پیرایہ میں حمد و ثنائے پرودگار کرتے ہوئے آپ نے ارشاد فرمایا کہ یہ وہ خدا ہے جس نے مخلوقات کو اپنی قدرت و مشیت سے پیدا کیا پھر اس نے انسان کو اپنی راہ اور اپنے ارادہ پر رواں کردیا اور انہیں اپنی محبت کے راستہ پر ابھارا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ اس نے خدا دوست اور خدا کو تلاش کرنے والی فطرت پر انسان کو پیدا کیا۔

خدا کی سب سے برتر مخلوق: قرآن مجید میں انسانوں کو خلیفۃ اللہ[3] کے عنوان سے خدا کی سب سے برتر مخلوق کے طور پر یاد کیا گیا ہے اور پروردگار نے اس کی پیدائش پر اپنے آپ کو بابرکت بنایا ہے[4]۔ امام زین العابدینؑ نے بھی

۱۔ صحیفہ سجادیہ، دعا ۱، بند ۴
۲۔ الٰہی قمشہ ای، ترجمہ صحیفہ سجادیہ، ص ۵۷۲
۳۔ سورہ بقرہ، آیت ۳۰
۴۔ سورہ مومنون، آیت ۱۴

خدا کی حمد و ثنا کے ضمن میں تمام مخلوقات پر انسان کی برتری کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

"اس خدا کی تعریف ہے جس نے خلقت کی اچھائیوں کو ہمارے لئے منتخب کیا اور پاکیزہ روزی عطا کی اور تمام مخلوقات پر ہمیں تسلط اور توانائی عطا کی"۔[۱]

مادہ سے بلند: امام سجادؑ نے مختلف دعاؤں میں خدائے منان سے اپنے لئے جو حاجتیں طلب کی ہیں اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انسان مادہ سے بلند ہے۔ جسمانی اور روحانی دونوں پہلو جب کمال تک پہونچ جائیں تب انسان اپنے مخصوص کمال تک پہونچ سکتا ہے۔ انسان کی معنوی ضرورتیں اس کی مادی ضرورتوں سے زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔ مثلاً امامؑ صحیفۂ سجادیہ میں ایک مقام پر اللہ تعالی سے درخواست کرتے ہیں کہ پست دنیا سے دلبستگی کو ان کے دل سے نکال دے جو خالق سے وصل ہونے میں مانع ہے[۲]۔ آپ فرماتے ہیں کہ پروردگار! محمد وآل محمد پر درود بھیج اور ہمارے دل کو اپنی محبت اور اپنی دوستی کے لئے خالی کردے اور اپنی یاد میں مشغول کردے۔[۳]

دنیاوی اور اخروی حیات کا مالک: امام زین العابدینؑ قرآن کی تاسی میں انسان کو ایسا موجود سمجھتے ہیں جس کی زندگی صرف عالم مادہ اور حیات دنیوی تک محدود نہیں ہے بلکہ موت قیامت کے جاوداں مقام تک پہونچنے کے لئے ایک پل ہے۔ صحیفہ سجادیہ میں مختلف مقامات پر امامؑ نے اس کی تصویر کشی کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ ایک نیک انسان کو اس دنیا کے علاوہ دوسری دنیا کی حیات جاودانی کی فکر لاحق ہوتی ہے۔ وہ اس سے ہرگز غافل نہیں ہوتا۔ "(پالنے والے) جس دن پر دے اٹھ جائیں گے (یعنی قیامت میں) اس دن مجھے ہلاک نہ کرنا"۔

حضرتؑ اس خواہش کے فوراً بعد اپنی دنیاوی ضرورتوں کو بیان کرتے ہیں اور دنیاوی محتاجی کو دور کرنے کی درخواست پیش کرتے ہیں:

۱۔ صحیفہ سجادیہ، دعا ۱، بند ۱۷

۲۔ ایضاً، دعا، ۷ ۴، بند ۱۰۹

۳۔ ایضاً، دعا، ۲۱، بند ۱۰

"مخلوقات سے بے نیازی، بری باتوں سے پاک دامنی، زندگی میں آسائش، بے خوفی، تندرستی، رزق میں وسعت، اطمینان اور آسودگی اور بدی و ابتلاء سے دوری عنایت فرما"۔[۱]

صاحب اختیار و ارادہ: قرآن مجید کے نقطہ نظر سے انسان فاعل مختار ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے اس کے لئے سبیل ہدایت پیدا کر دی ہے، اب وہ شکر بجالائے یا کفران نعمت کرے۔[۲] امامؑ بھی انسان کو صاحب اختیار بتاتے ہیں۔ آپ کی نظر میں بھی انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

"خدایا میں تیرا وہ بندہ ہوں جسے تو نے پیدائش سے پہلے اور پیدائش کے بعد نعمتیں دیں اور ان لوگوں میں قرار دیا جنہیں تو نے اپنے دین (اسلام) کی طرف ہدایت کی اور اپنے حق کو انجام دینے کی توفیق عطا کی۔ اسے اپنے ریسمان میں جکڑ کر اسے اپنے گروہ میں قرار دیا۔ اپنے دوستوں کی دوستی اور اپنے دشمنوں کی دشمنی کی طرف رہبری کی۔ پھر تو نے اسے حکم دیا لیکن اس نے فرماں برداری نہیں کی اور اسے منع کیا لیکن وہ باز نہیں آیا۔ تو نے معصیت اور نافرمانی سے روکا مگر اس نے تیرے فرمان کے خلاف کام کیا اور جس سے منع کیا تھا اسی کا مرتکب ہو گیا"۔[۳]

دعاؤں کے پیرایہ میں امام زین العابدینؑ کی جو عبارتیں ملتی ہیں ان میں انسان کو اسی حد تک فاعل مختار بتایا گیا ہے کہ وہ امر و نہی اور ہدایت کے بعد بھی مخالفت کر کے گناہ کا راستہ اختیار کر سکتا ہے۔

انسان اپنے اعمال کا اسیر ہے: امام زین العابدینؑ ترپن نمبر کی دعا میں آثار گناہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑی صراحت سے فرماتے ہیں کہ بشر اپنے اعمال کے نتائج میں جکڑا ہوا ہے۔ وہ اپنی سعادت اور شقاوت خود معین کرتا ہے۔ دوسری جگہ انسان کی پشیمانی کو اپنی زبان سے بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"خدایا! میں افراط اور اپنے حد سے تجاوز کی بنا پر تیری بارگاہ میں ذلیل و خوار ہوں۔ برے کردار و اعمال نے مجھے ہلاک کر دیا ہے"۔[۴]

۱۔ صحیفہ سجادیہ، دعا ۴۷، بند ۱۳۰
۲۔ سورہ انسان، آیت ۳
۳۔ صحیفہ سجادیہ، دعا ۴۷، بند ۶۷
۴۔ ایضاً، دعا ۵۲، بند ۷

انسان دوستی: انسان کی ایک مثبت خصوصیت اس کی انسان دوستی ہے جس کا سرچشمہ اس کی فطرت ہے۔ صحیفۂ سجادیہ کے مختلف حصوں میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔ مثلاً ۳۹ ویں دعا میں لوگوں سے سچی دوستی کی بہترین روش کو دعا کی زبان میں بیان کیا گیا ہے۔

اس طرح ماہ مبارک رمضان آنے سے پہلے آپ نے خداوند عالم سے خدمت خلق کی توفیق طلب کی ہے جس میں عوام الناس سے دوستی کا پہلو مضمر ہے۔ آپ ارشاد فرماتے ہیں:

"مجھے اس مہینہ میں توفیق عنایت فرما کہ میں اپنوں کے ساتھ نیکی کر سکوں اور ہمسایہ کے ساتھ احسان اور بخشش کر سکوں۔ ہمارے پاس مظالم اور ظلم وستم کے ذریعہ جو سرمایہ آیا ہے اسے زکات کے ذریعہ خالص کرنے کی توفیق دے"۔[۱]

اس دعا میں امام زین العابدینؑ نے انسان دوستی کے مراتب اور اس پر عمل کرنے کے مختلف طریقوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

صحیفہ سجادیہ میں انسان کی منفی خصوصیات

امام سید سجادؑ نے رازونیاز کے پیرایہ میں انسان کی کمیوں اور منفی خصوصیتوں کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے اور یہ بتایا ہے کہ یہ خصوصیات انسان کے ضعیف پہلو ہیں۔ ہم یہاں پر بعض خصوصیات کی طرف اشارہ کریں گے:

اپنی ذات کا اسیر: حیوانی خواہشوں اور ہوائے نفس کا غلبہ اور اپنے ہی دام میں اسیر ہو جانا، انسان کا ایک کمزور پہلو ہے۔ قرآن کی تعبیر کے مطابق انسان کا نفس ہمیشہ اسے بدی اور کجی کی طرف لے جاتا ہے، مگر یہ کہ پروردگار کا رحم وکرم شامل حال ہو۔[۲]

امام سجادؑ نے مختلف جگہوں پر انسان کی اس کمزوری کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ ہوائے نفس کا اسیر انسان خود اپنی ذات کا اسیر ہو جاتا ہے۔ مثلاً آپ نے ایک دعا میں نفس کے شر سے اللہ کی پناہ مانگی ہے کیونکہ نفس ہمیشہ برائیوں کی طرف کھینچتا چلا جاتا ہے۔ دوسری جگہ آپؑ خدا کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں:

۱۔ صحیفہ سجادیہ، دعا ۴۴، ص ۱۰

۲۔ سورہ یوسف، آیت ۵۳

"خدایا میں تیرا بندہ ہوں جسے تو نے پیدا کرنے سے پہلے اور پیدا کرنے کے بعد نعمتوں سے نوازا۔ پھر تو نے اسے حکم دیا لیکن اس نے نافرمانی کی۔ تو نے اسے منع کیا لیکن وہ باز نہیں آیا۔ وہ تیری نافرمانی کا مرتکب ہوا۔ یہ تجھ سے دشمنی اور سرکشی کی بنا پر نہیں تھا بلکہ جس کا حکم دیا تھا اور جس سے روکا اور ڈرایا تھا، ہوائے نفس نے ان چیزوں کی طرف بلایا۔"[۱]

حسد اور تنگ نظری: انسان کا ایک کمزور پہلو یہ بھی ہے کہ وہ دوسروں کی کامیابی کو برداشت نہیں کرتا۔ امامؑ نے اس بات پر خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے ان کی ذات پر اپنی عطاؤں کو حاسدوں سے مخفی رکھا۔ دوسری جگہ آپؑ اللہ تعالی سے درخواست کرتے ہیں کہ مجھے اس سے نہ آزمانا جو دوسروں کو دیا ہے اور انہیں اس سے نہ آزمانا جو مجھ کو نہ دے کر انہیں دے دیا ہے کہ میں تیری مخلوقات سے حسد کروں۔[۲]

ایک مقام پر آپ حسد کو شیطانی عمل قرار دیتے ہیں جسے خدا کی عظمت اور قوت پر غور و فکر کے ذریعہ دور کیا جاسکتا ہے:

"شیطان جھوٹ، گمان اور حسد کو دلوں میں ڈالتا ہے، خدایا تو اسے اپنی عظمت اور توانائی کی یاد اور دشمن پر عاقبت اندیشی میں بدل دے"۔[۳]

بے صبری: گناہ، بلا، فقر، لذت اور اطاعت خدا کے موقع پر انسان کی بے صبری اس کی ایک منفی خصوصیت ہے وہ دیر پا حلال پر کم مدت والے حرام کو ترجیح دیتا ہے جسے قرآن میں "عجلہ" جلد بازی[۴] سے تعبیر کیا گیا ہے۔

امام زین العابدینؑ نے بھی انسان کے اس ضعیف پہلو کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ انسان بردباری اور صبر کے معاملہ میں کمزور ہے:

"بارالہا! حرص، غضب، حسد اور صبر و شکیبائی میں کمزوری سے تجھ سے پناہ چاہتا ہوں"۔[۵]

۱۔ صحیفہ سجادیہ، دعا ۴۷، بند ۶۷۔۶۸

۲۔ ایضاً، دعا ۳۵، بند ۲ و ۳

۳۔ ایضاً، دعا ۲۰، بند ۱۳

۴۔ سورہ اسراء، آیت ۱۱

۵۔ صحیفہ سجادیہ، دعا ۸، بند ۱

"پالنے والے! رنج پر توانائی، ابتلاء پر صبر اور درویشی پر قدرت نہیں ہے"۔[۱]

اس دعا میں بھی انسان کی بے صبری اور عدم برد باری کا تذکرہ ہے اور امام نے اس دعا میں اس کمی کو دور کرنے کے لئے اس سے مدد مانگی ہے۔

شہوات کے مد مقابل کمزوری: قرآن کریم نے جہاں انسان کو سب سے اعلیٰ مخلوق بتایا ہے وہیں اس کی کمزوری کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے خلق الانسان ضعیفاً (انسان ضعیف پیدا کیا گیا ہے)۔[۲] مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی شہوانی قوت کے سامنے کمزور ہے۔ امام زین العابدینؑ نے اس کمزوری کا بار بار ذکر کیا ہے اور اس کے مقابلہ کے لئے اللہ تعالی سے مدد مانگی ہے:

"اور جب ہمارے دل میں دو ارادے پیدا ہوں، ایک تجھے راضی کرنے والا اور دوسرا ناراض کرنے والا ہو تو ہمیں ادھر موڑ دینا جس میں تیری رضا ہو اور ان معاملات میں ہمارے نفس کو آزاد نہ چھوڑ دینا کہ تیری توفیق کے بغیر ہمیشہ باطل ہی کو اختیار کرے گا اور اس کا کام ہی برائیوں کا حکم دینا ہے جب تک تیرا رحم و کرم شامل حال نہ ہو جائے۔"[۳]

"پالنے والے یہ سچ ہے کہ تو نے ہمیں ضعیف پیدا کیا ہے اور ہماری بنیاد کمزوری پر رکھی ہے"۔[۴]

"پالنے والے میں صبح وشام اس حالت میں کرتا ہوں کہ تیرا ذلیل وخوار بندہ ہوں، تیری مدد کے بغیر میں سود وزیاں پر طاقت نہیں رکھتا۔ جو بات میں نے کہی ہے اس پر میں گواہ ہوں اور اپنی بیچارگی کا اقرار کرتا ہوں"۔[۵]

خواہشوں کا غلام: آرزو، ہمت، توانائی اور انسانی امکانات میں اگر ہم آہنگی ہو جائے تو تحریک اور تبدیلی پیدا ہوتی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ بشر کی بہت سی آرزوئیں دنیوی اور حاصل نہ ہونے والی ہیں اور

۱۔ صحیفہ سجادیہ، دعا ۲۲، بند ۲
۲۔ سورہ نساء، آیت ۲۷
۳۔ صحیفہ سجادیہ، دعا ۹، بند ۳ و ۴
۴۔ ایضاً، دعا ۹، بند ۵
۵۔ ایضاً، دعا ۲۱، بند ۷

اس کی توانائی اور خواہشوں میں ہم آہنگی نہیں ہے اسی وجہ سے وہ کامیاب نہیں ہے یہاں تک کہ وہ اپنی زندگی میں ناامیدی کا شکار ہو کر مواقع کو کھو دیتا ہے۔

امام زین العابدینؑ نے چند مقامات پر اس کمزوری کی طرف نے اشارہ فرمایا ہے:

"میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں اے میرے مولا، اے میرے آقا، یہ اس کی درخواست ہے جو درازی آرزو کی بناپر بے معنی کاموں میں مشغول ہو گیا ہے۔"[۱]

"میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں اور یہ اس کی درخواست ہے آرزوئیں جس پر غالب آ گئی ہیں اور جو خواہش نفس میں گرفتار ہو گیا ہے"۔[۲]

غرور اور خود فریبی: انسان کی ایک کمزوری خود فریبی ہے۔ اس کی طرف امامؑ نے اپنی دعا کی زبان میں اشارہ کیا ہے۔ مثلاً بیسویں دعا میں آپ نے خود فریبی کو عبادتوں کو برباد کر دینے والا قرار دیا ہے اور خدا سے مدد طلب کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"ہمیں صاحب عزت و کرامت قرار دے اور کبر و سربلندی (اور خود فریبی) میں مبتلا نہ کر تو اپنی بندگی کے لئے ہمیں رام کر دے اور ہماری عبادت کو خود فریبی سے تباہ نہ کر"۔[۳]

دوسری دعا میں خدا سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں:

"خدایا! محمد وآل محمد پر درود بھیج اور لوگوں کے درمیان مجھے کسی درجہ اور مقام سے سرفراز نہ فرما مگر یہ کہ میرے نفس کے نزدیک اتنا ہی اسے پست کر دے اور میرے لئے آشکارا ارجمندی عطا نہ کر مگر یہ کہ مجھے میری نظر میں اتنا ہی ذلیل و خوار کر دے"۔[۴]

دام غفلت: سورہ اعراف کی آیت نمبر ۱۷۹ میں غفلت اور غافلین کی بڑی اچھی تصویر کشی کی گئی ہے:

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ ۖ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ۔ ترجمہ: اور

۱۔ صحیفہ سجادیہ، دعا ۵۲، بند ۸

۲۔ ایضاً، دعا ۵۲، بند ۹

۳۔ ایضاً، دعا ۲۰، بند ۴

۴۔ ایضاً، دعا ۲۰، بند ۳

یقینا ہم نے انسان و جنات کی ایک کثیر تعداد کو گویا جہنم کے لئے پیدا کیا ہے کہ ان کے پاس دل ہیں مگر سمجھتے نہیں ہیں اور آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں ہیں اور کان ہیں مگر سنتے نہیں ہیں - یہ چوپایوں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں اور یہی لوگ اصل میں غافل ہیں۔

مختلف موارد میں امام سجادؑ نے غفلت کو گمراہی اور گناہ کا سبب قرار دیا ہے۔ آپ ارشاد فرماتے ہیں:

"اگر تو مجھ پر عذاب کرے گا تو میں نے یقیناً اپنے اوپر ظلم کیا ہے اور خطا، تقصیر اور غلطی کا راستہ اختیار کیا ہے اور میں نے اپنے حصہ سے غفلت کی ہے اور اگر تو میرے گناہوں کو بخش دے تو، تو سب سے بڑا مہربان ہے۔"[۱]

دوسرے مقام پر آپ بیان فرماتے ہیں کہ غفلت انسان کو مقصد تخلیق سے دور کر دیتی ہے یعنی تدریجی ترقی کی راہ پر چلنے، حضرت حق کی بندگی اور اپنی ذمہ داریوں پر عمل کرنے سے دور کر دیتی ہے: "جو چیز ہم سے طلب کی جارہی ہے اس سے ہماری غفلت پر وائے ہو"[۲]۔

ناشکری اور کفران نعمت: انسان کی ایک منفی صفت ناشکری اور کفران نعمت ہے۔ خدا نے قرآن مجید میں پندرہ سے زیادہ مقامات پر اس کمی کا ذکر کرتے ہوئے بہت سے نمونے پیش کئے ہیں:

إِنَّ الْإِنسَانَ لَكَفُورٌ۔ ترجمہ: انسان بڑا انکار کرنے والا اور ناشکرا ہے۔[۳]

مختلف مقامات پر امام چہارم نے انسان کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ انسان اپنے ہم نوع افراد کی نیکی اور خداوند عالم کی نعمتوں کے سلسلہ میں بہت ناشکری اور ناقدری کرتا ہے:

"ساری حمد اس اللہ کے لئے ہے جو اپنی نعمتوں اور متواتر رحمتوں پر شکریہ ادا کرنے کی معرفت کو اپنے بندوں سے روک لیتا تو سب اس کے احسانات میں تصرف کرتے اور کوئی حمد نہ کرتا۔ سب اس کے وسیع رزق کو حاصل کرتے اور کوئی شکریہ ادا نہ کرتا"۔[۴]

۱۔ صحیفہ سجادیہ، ص ۳۵۵
۲۔ ایضاً، دعا ۵۳
۳۔ سورہ حج، آیت ۶۶
۴۔ صحیفہ سجادیہ، دعا ۱، بند ۸

اسی دعاء کے اگلے فقرے میں آپ اس عیب کی عجیب تعبیر پیش فرماتے ہیں: "اگر ایسا ہو جاتا تو انسانیت کی حدوں سے نکل کر جانوروں کی منزل میں آجاتے"۔ [۱]

صحیفۂ سجادیہ میں انسان کامل

اسلام کی نظر میں انسان کامل یا آئیڈیل انسان وہ ہوتا ہے جس کے اندر نہ صرف یہ کہ کسی طرح کی اخلاقی کمی نہیں ہوتی بلکہ تمام انسانی فضائل ہم آہنگ طریقہ سے اس کے اندر موجود ہوتے ہیں۔ اس مقام پر سید سجادؑ کی زبان سے انسان کامل کی بنیادی خصوصیتیں ملاحظہ فرمائیں۔

انسان کامل کی ایمانی خصوصیتیں

انسان کی معنویت کا ایک بنیادی عنصر ایمان ہے جس کے بغیر بشر ناقص اور غیر متوازن ہوتا ہے اور اس کی روحانی سلامتی پر آنچ آتی ہے۔ انسان کے طبیعی میلان کے برخلاف، مذہبی ایمان صرف تکالیف کے مجموعہ کو ہی معین نہیں کرتا بلکہ اس کی نظر میں دنیا کا چہرہ بدل دیتا ہے اور دنیا کی ساخت میں محسوس عناصر پر کچھ عناصر کا اضافہ کرتا ہے۔ خشک، بے روح اور مادی دنیا کو ایک ایسی دنیا میں تبدیل کر دیتا ہے جو جاندار اور آگاہ ہے۔ مذہبی ایمان دنیا اور خلقت کے بارے میں انسان کے تصورات کو بدل دیتا ہے۔ قرآن بھی کہتا ہے:

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا۔ ترجمہ: آپ اپنے رخ کو دین کی طرف رکھیں اور باطل سے کنارہ کش رہیں کہ یہ دین وہ فطرت الٰہی ہے جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ [۲]

توحید پر ایمان: امام زین العابدینؑ کی نظر میں خدا پر ایمان، توحید خالص پر عقیدہ اور ہر طرح کے شرک والحاد سے انسان کامل کا پاک ہونا ضروری ہے۔ اس راستہ میں جسے توفیق مل جائے اسے حضرت حق سبحانہ کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ امام سجادؑ نے اپنی تمام دعاؤں میں انسان کامل کی اس خصوصیت کا ذکر فرمایا ہے۔ مثلاً آپ فرماتے ہیں:

۱۔ صحیفہ سجادیہ، دعا۱، بند ۹

۲۔ سورہ روم، آیت ۳۰

"اس خدا کی تعریف جس نے ہمیں اپنی معرفت عطا کی اور جس نے ہمیں اپنی پہچان دی۔ اور اپنے لامتناہی علم ربوبیت کا دروازہ ہم پر کھولا اور اپنے لطف و کرم سے توحید کے مقام رفیع کی طرف ہماری رہنمائی کی اور شرک، الحاد اور اپنے امر میں شک وتردید سے دور رکھا۔"[1]

عدالت پر ایمان: دین مبین اسلام کی ایک اصل عدالت ہے جسے امام سجادؑ نے اپنی دعاؤں میں چند مقامات پر بیان کیا ہے تاکہ انسان کامل کے صحیح ادراک کا راستہ ہموار ہوسکے۔ آپ نے ہر جگہ اس بات پر زور دیا ہے کہ ہر چیز خدا کے ہاتھ میں ہے اور اس کے ارادہ کی محتاج ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

"مجھے معلوم ہے کہ تیرے حکم وفرمان میں ظلم نہیں ہے اور گناہ کے سلسلہ میں تیرے انتقام میں جلدی نہیں ہے۔ جلدی تو بس وہی کرتا ہے جسے وقت کے فوت ہو جانے کا خوف ہوتا ہے اور ضعیف و ناتواں کو ظلم وستم کی ضرورت پڑتی ہے، میرے خدا تو ظلم اور جلد بازی سے بری ہے۔ تو بزرگ اور برتر ہے۔"[2]

امامؑ نے خدا کی عدالت کی دلیل بھی بیان کردی ہے کہ چونکہ خدا ضعیف نہیں ہے اس بناپر اسے ظلم اور بے انصافی کی ضرورت نہیں ہے۔ اس طرح یا اعدل العادلین[3] یا لااخشی الا عدلہ جیسے جملے اس کی عدالت پر دلالت کرتے ہیں۔

حضرت محمدؐ کی نبوت پر ایمان: ایک انسان کامل کے لئے انبیائے الٰہی خصوصاً حضرت ختمی مرتبتؐ کی نبوت پر عقیدہ رکھنا ضروری ہے۔ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام نے اپنی بہت ساری دعاؤں میں انبیاء کی معرفت و رسالت ختمی مرتبت پر ایمان رکھنے کو انسان کی زندگی کی بڑی قدرت و منزلت والی شئے قرار دی ہے:

۱۔ صحیفہ سجادیہ، ص ۳۰
۲۔ ایضاً، دعا ۴۸، بند ۱۰
۳۔ ایضاً، دعا ۴۵، بند ۵۴

"پروردگارا! رسول اکرمؐ پر درود کے بعد تیرے عرش عظیم کے حاملین پر درود ہو، وہ تیری تسبیح اور تنزیہ سے نہیں تھکتے... نیز جبرئیل پر درود ہو جو تیرے وحی کے امین ہیں، جو آسمان کے فرشتوں کے سردار ہیں"۔[۱]

اس طرح حضرتؑ نے دوسری دعا میں انسانی زندگی میں نبوت کے اثرات اور اس کی اہمیت کو واضح طور پر بیان کیا ہے اور امت اسلام کے لئے اسے ایک مخصوص نعمت قرار دیا ہے اور اسے خدائی احسان کے عنوان سے یاد کیا ہے:

"اس خدا کا شکر ہے جس نے پیغمبرؐ کے ذریعہ ہم پر احسان فرمایا، ایسا احسان جس سے گذشتہ امتیں اور ماضی کے انسان بے بہرہ تھے"۔[۲]

اسی طرح اس دعا کے دوسرے حصہ میں بیان ہوتا ہے:

"پروردگار حضرت محمد مصطفیٰ پر درود بھیج کہ وہ تیرے وحی کے امین ہیں اور تمام مخلوق سے زیادہ صاحب شرف اور عظمت ہیں۔ وہ امام و پیشوائے رحمت و فیض ہیں وسیلہ اور قائد خیر عالم اور مفتاح برکات ہیں"۔[۳]

ان دونوں دعاؤں میں حضرت امام زین العابدین علیہ السلام نے دعا کی زبان میں پیغمبر اکرمؐ کا مرتبہ اور آپ کی رسالت کا ذکر ایسے حسین انداز میں کیا ہے کہ پڑھنے والا نبوت پر ایمان کی اہمیت کو اچھی طرح جان جائے گا اور دین اسلام کی اس اصل سے کما حقہ واقف ہو جائے گا۔ اکثر دعاؤں کے آغاز میں اور آخر میں درود وسلام کا ذکر، پیغمبرؐ کی نبوت اور خاتمیت پر ایمان کی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے جس کے بغیر انسان کا انسان کامل بننا بے معنی ہے۔

امامت پر ایمان: خدا کا مومنین سے پیغمبر اور اولی الامر[۴] کی اطاعت کا مطالبہ، پیغمبرؐ اکرم کے ذریعے اپنے ماننے والوں کو قرآن و عترت سے تمسک کی دعوت[۵]، مکتب نبوی کے تعلیم یافتہ مفسرین قرآن کی عقلی

۱۔ صحیفہ سجادیہ، دعا ۳، بند ۱ سے ۶

۲۔ ایضاً، دعا ۲، بند ۱

۳۔ ایضاً، دعا ص ۴۵

۴۔ سورہ نساء، آیت ۵۹

۵۔ حکیمی، محمد رضا، الحیاۃ، جلد ۲، ص ۱۹

ضرورت جو قرآن کی تشریح کے ساتھ ساتھ امت کی ہدایت بھی کر سکیں، ان سب باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کامل کا ائمہ اطہار پر راسخ عقیدہ رکھنا ضروری ہے ورنہ انسان کامل کی ایمانی بنیادی شرط ہی ختم ہو جائے گی۔

امام علی بن الحسین علیہ السلام بڑے دشوار زمانہ اور شدید تقیہ کے دور میں مخفی طور پر امامت کے عہدہ پر فائز ہوئے[۱] اور اپنی مخصوص روش کے مطابق تنہائی میں راز و نیاز کے پیرایہ میں مسئلہ امامت اور ایمان کو مختلف انداز سے بیان کیا۔ امامت پر یقین رکھنے والے انسان کامل کی نشاندہی آپ اس طرح فرماتے ہیں:

"پالنے والے! پیغمبر کے ان طیب و طاہر اہلبیت پر رحمت نازل فرما جنہیں تو نے اپنے امر کے لئے منتخب کیا ہے اور اپنے علم کا خزانہ دار، اپنے دین کا محافظ، اپنی زمین کا خلیفہ اور اپنے بندوں پر اپنی حجت قرار دیا ہے اور انہیں اپنے ارادہ سے ہر رجس و آلودگی سے اس طرح پاک کیا ہے جو پاکیزگی کا حق ہے اور پھر انہیں اپنی بارگاہ کے لئے وسیلہ اور اپنی جنت کا راستہ بنا دیا ہے"۔[۲]

"پالنے والے! ہمیں اہل توحید، اہل ایمان، اپنے پیغمبروں اور ان پیشواؤں کے لئے اہل تصدیق واعتراف قرار دے جن کی اطاعت کو تو نے واجب کی ہے.. اے ہر مخلوق کے پروردگار"۔[۳]

قیامت پر ایمان: دینی انسان شناسی کہ نقطہ نظر سے بشر کی زندگی دنیا اور مادی حیات تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ اپنی با مقصد اور ذمہ دارانہ زندگی کا کچھ حصہ اس دنیا میں طئے کرتا ہے اور دوسرا حصہ مرنے کے بعد کی دنیا میں گذارتا ہے۔

قیامت، حساب، ثواب اور عقاب کے عقیدہ پر مبنی ایمان کا حاصل ہونا انسان کامل کی اہم خصوصیت ہے۔ امام زین العابدین علیہ السلام نے صحیفۂ سجادیہ میں اسے مختلف طریقوں سے پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ قیامت پر مضبوط عقیدہ انسان کامل کے لئے ضروری ہے:

۱۔ دیلمی اوآذربایجانی، اخلاق اسلامی، ص ۱۶۸

۲۔ صحیفہ سجادیہ، دعا ۴۷، بند ۵۶

۳۔ ایضاً، دعا ۴۸، بند ۱۲

۱۔ آخرت بقا کا گھر ہے: "خدایا تو نے مجھ جیسے افراد کی گناہ کو اس دنیا میں عفو، درگذر، احسان اور اپنی نیکی کے ذریعہ چھپادیا ہے اور مجھے رسوا نہیں کیا ہے لہٰذا دار بقاء میں بھی سب کے سامنے... اپنی پناہ میں رکھ"۔[۱]

۲۔ قیامت کا دن ایک دوسرے سے ملاقات کا دن ہے: "اے میرے پروردگار تو میرے ساتھ وہ سلوک کر کہ وعدہ گاہ آنے تک (روز قیامت تک جب جسم میں روح ڈالی جائے گی یا جب اہل آسمان اہل زمین کے ساتھ یا ظالم مظلوم کے ساتھ یا دوسرے وہ تمام افراد ایک ساتھ ہوں گے جو خدا کے علم میں ہیں) ہماری قبر آرام کی جگہ بنی رہے"۔[۲]

۳۔ روز قیامت حساب اور کتاب، رسوائی، حسرت اور پشیمانی کا دن ہے: امام سید سجادؑ کی دعا ہے کہ قیامت کے دن گناہوں کی بناپر رسوائی کا منہ نہ دیکھنا پڑے۔ آپ نے مختلف دعاؤں میں اللہ سے یہ درخواست کی ہے:

> "قیامت کے دن جب بہت سارے گروہ جمع ہوں تو اس وقت تباہ کرنے والے گناہوں کی بناپر ہمیں ذلیل نہ کرنا... جس دن ظالموں کے چہرے سیاہ (افسردہ) ہو یعنی افسردگی اور پشیمانی کے دن تو ہمارے چہروں کو نورانی قرار دے"۔[۳]
>
> "پالنے والے جس دن پردے (حقیقتوں سے) اٹھ جائیں (اور ہر چیز اپنی اصلی حالت میں نمودار ہو جائے) ہمیں ہلاک نہ کرنا"۔[۴]

انسان کامل کی اخلاقی خصوصیتیں

قرآن اور دینی پیشواؤں کی تعلیمات میں ایمان اور عمل کو اتنی اہمیت حاصل ہے کہ بہت ساری آیتوں اور حدیثوں میں ان کا ذکر ایک ساتھ ہوا ہے۔ اسی وجہ سے ایک آئیڈیل اور کامل انسان صرف ایمان کے اعتبار سے دوسروں سے آگے نہیں ہوتا بلکہ اپنے کردار و اخلاق کے لحاظ سے بھی سب سے بہتر ہوتا ہے۔ ہم یہاں پر صحیفۂ سجادیہ میں بیان کئے گئے انسان کامل کی اخلاقی خصوصیات پر ایک نظر ڈالیں گے:

۱۔ صحیفہ سجادیہ، دعا ۳۲، بند ۲۱ سے ۳۱ تک
۲۔ ایضاً، دعا ۴۲، بند ۳
۳۔ ایضاً، دعا ۴۲، بند ۱۴ و ۱۶
۴۔ ایضاً، دعا ۴۷

خدا کی بندگی: توحید خالص دو چیزوں میں خلاصہ ہوتی ہے ۔ایک تو ذات، صفات اور افعال خدا کی وحدانیت پر قلبی ایمان اور دوسرے اس ایمان کا نتیجہ یعنی مکمل طور پر اسی ذات سے وابستہ اور نیاز مند رہنا اور عملی طور پر اسی کی بندگی کرنا۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کی تصریح صحیفۂ سجادیہ میں متعدد مقامات پر کی گئی ہے۔ امامؑ ارشاد فرماتے ہیں:

"میں تیرا ہی بندہ ہوں اور تیرے ہی قبضہ میں ہوں میری پریشانی تیرے ہاتھوں میں ہے اور تیرے امر کے آگے میری کوئی بات نہیں چل سکتی ہے۔ تیرا حکم میرے بارے میں نافذ ہے اور تیرا فیصلہ میرے بارے میں عین عدل ہے۔ میرے پاس تیری سلطنت سے نکل جانے کی قوت نہیں ہے اور میں تیری قدرت سے تجاوز کرنے کا دم نہیں رکھتا ہوں اور تیری محبت کو اپنی طرف جھکا سکتا ہوں اور نہ تیری رضا تک جا سکتا ہوں اور تیری اطاعت اور تیری فضل و رحمت کے بغیر تیری نعمتوں کو حاصل بھی نہیں کر سکتا ہوں"۔[۱]

شوق دیدار خدا: فطری طور پر انسان کمال کی تلاش میں رہتا ہے اور خدا کی خوشنودی اور اس کی رضامندی کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا، اسی وجہ سے ضرورتیں پوری ہونے کے بعد بھی انسان احساس نیاز اور عدم خوشنودی کرتا ہے۔ امام زین العابدینؑ نے اپنی دعاؤں میں مختلف انداز سے اسے بیان کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

"تیری بارگاہ کے علاوہ کسی اور جگہ جانے والا ناکام پلٹتا ہے اور تیرے آستانہ کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے کسی دوسری طرف متوجہ ہونے والے ضائع اور برباد اور خیر و سعادت سے محروم ہیں، سوائے ان افراد کے جو تیرے فضل و احسان کی تلاش میں ہیں"۔[۲]

دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں:

"پالنے والے اپنی خوشنودی تک پہونچنے کے راستہ کو میرے لئے آسان کردے اور میرے کردار کو نیک بنادے"۔[۳]

۱۔ صحیفہ سجادیہ، دعا۲۱، بند ۵و۶

۲۔ایضاً، دعا۴۶، بند ۱۳

۳۔ایضاً، دعا۲۰، بند ۲۶

خدا کی دوستی: خدا کا دوست بن جانا اور اس کے اولیاء کے زمرہ میں شامل ہو جانا انسان کی خاصیت ہے۔ امام چہارم علیہ السلام نے بار بار اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

"(پروردگار) مجھے اپنے دوستوں میں قرار دے اور تیرے دوست (دنیا میں) کسی طرح کا رنج و غم نہیں رکھتے"۔[۱]

چوالیسویں دعا میں امام علیہ السلام نے ماہ مبارک رمضان اور اس مہینہ میں عبادت کرنے والوں کی قسم دیکر فرمایا ہے کہ مجھے اپنے دوستوں کے زمرہ میں قرار دے کیوں کہ خدا کے دوستوں کا بڑا مرتبہ ہے اور اس نے انہیں خاص کرامتوں سے نوازا ہے۔

خدا کی خاطر دوستی اور دشمنی: امام زین العابدینؑ کو نہ تو امام حسینؑ کی طرح موقع ملا کہ آپ دشمن سے روبرو ہو کر دین کا دفاع فرماتے، نہ آپ کے پوتے امام جعفر صادقؑ کے زمانہ کی طرح کوئی گنجائش پیدا ہوئی کہ آپ اعلانیہ اسلام کی تعلیمات کو نشر فرماتے، لہٰذا آپ نے دعا کے پیرایہ میں اس خدمت کو انجام دینے کا بیڑا اٹھایا۔[۲] آپ نے اس اہم اصل یعنی تولا اور تبرا جیسے حساس سیاسی اور سماجی مسئلہ کو راز و نیاز کے قالب میں ڈھال کر پیش فرمایا اور بتادیا کہ خدا کی خاطر دوستی اور دشمنی ایک مومن اور کامل انسان کی پہچان ہے:

"خدایا! میں تیرا وہ بندہ ہوں جسے پیدائش سے پہلے اور اس کے بعد تونے اپنی نعمتوں سے نوازا... اپنے دوستوں کی دوستی اور اپنے دشمنوں کی دشمنی کی طرف رہبری کی"۔[۳]

"ماہ رمضان میں تونے ہمیں توفیق عطا کی کہ ہم اپنے قرابت داروں پر بخشش اور ان کے ساتھ نیکی کریں اور جس نے دشمنی کا مظاہرہ کیا اس سے ہم صلح و آشتی سے پیش آئیں مگر یہ کہ جس نے تیری راہ میں تیری خاطر ان سے دشمنی کی ہو کیوں کہ وہ ایسا دشمن ہے جسے ہم دوست نہیں رکھتے اور وہ اس گروہ میں ہے جس سے ہم دل سے دوستی نہیں کر سکتے"۔[۴]

۱۔ ترجمہ صحیفہ سجادیہ، ص ۵۸۲
۲۔ مطہری، مرتضی، سیری در سیرہ ائمہ، ص ۱۱۳
۳۔ صحیفہ سجادیہ، دعا ۴۷، بند ۶۷
۴۔ ترجمہ صحیفہ سجادیہ، ص ۱۰

حزب خدا میں رہنا: راہ حق کے تمام راہ رو ایک مقصد یعنی خدا کی بندگی اور اس کی رضامندی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم ان کو حزب اللہ کہہ سکتے ہیں اور اس گروہ میں شامل ہونا انسان کامل کی ایک اہم خصوصیت ہے۔:

أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔ ترجمہ: اور آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کا گروہ ہی نجات پانے والا ہے۔[۱]

فَإِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ۔ ترجمہ: اللہ کی ہی جماعت غالب آنے والی ہے۔[۲]

سید سجاد علیہ السلام نے اس بات کو مختلف انداز سے بیان فرمایا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ایک نیک انسان یقیناً حزب اللہ کے زمرہ میں آتا ہے:

"بارالٰہی! مجھے سپاہ خدا میں قرار دے کہ تیری سپاہ ہمیشہ غالب اور فاتح ہے اور مجھے اپنے حزب میں قرار دے کہ تیرا حزب ہمیشہ کامیاب ہے"۔[۳]

دنیا اور آخرت کی آبادی: چوتھے امامؑ کے مطابق انسان کامل وہ ہے جو اپنی دنیا اور آخرت دونوں کو قانون الٰہی کے مطابق آباد کرے۔ اسی وجہ سے آپ فرماتے ہیں:

"جو اپنی دنیا کو آخرت کی وجہ سے اور آخرت کو دنیا کے سبب چھوڑ دے وہ ہم سے نہیں ہے"۔[۴]

امام زین العابدین علیہ السلام نے صحیفۂ سجادیہ کی بہت ساری دعاؤں میں فرمایا ہے:

"جو میری دنیا و آخرت دونوں کے لئے مناسب ہو اسے عطا فرما۔"[۵]

"اور دن کو تقدیر الٰہی (خورشید تاباں کے چراغ) سے روشن فرمایا تاکہ طلب رزق اور تحصیل معاش میں تیری مخلوقات تیرے فضل و کرم کے ساتھ کوشش کریں اور تجھ سے روزی طلب کریں اور زمین پر سیر کریں، دنیا کی وقتی لذت طلب کریں اور کام کے ذریعہ

۱۔ سورہ مجادلہ، آیت ۲۲

۲۔ سورہ مائدہ، آیت ۵۶

۳۔ ترجمہ صحیفہ سجادیہ، ص ۵۸۲

۴۔ دشتی، محمد، ترجمہ نہج البلاغہ، ص ۴۹

۵۔ صحیفہ سجادیہ، دعا ۲۵، بند ۹

آخرت کی لذت کا ادراک کریں کہ خدا نے لوگوں کے حال کی اصلاح کے لئے دنیا اور آخرت کے کاموں کو باہم مربوط کر رکھا ہے (اور اس نے اپنے بندوں سے دنیا وآخرت دونوں کے کاموں کو طلب کیا ہے"۔[۱]

کرامت وعزت انسانی کی حفاظت: اپنے آپ کی پہچان اور اس بات کی معرفت کہ انسان ایک برتر مخلوق ہے اور اس کے اندر بڑا قیمتی گوہر پوشیدہ ہے کے باعث اس کے اندر حب ذات پیدا ہوتی ہے جو انسان کو اپنی غیرت، کرامت اور عزت نفس کی حفاظت کی دعوت دیتی ہے اور اعلیٰ اقدار کی طرف بڑھاتی ہے۔[۲]

امام سید سجادؑ جنہوں نے خود درسگاہ قرآن اور نہج البلاغہ سے فیض حاصل کیا ہے، دعاؤں کی زبان میں یہ بتاتے ہیں کہ ایک کامل اور مکمل انسان ہمیشہ اپنے گوہر عزت و کرامت کی حفاظت کرتا ہے اور اسے کسی بھی قیمت پر مادیت کے بازار میں فروخت نہیں کرتا۔ آپ فرماتے ہیں:

"پس محمد وآل محمد پر درود بھیج اور اپنی قدرت وتوانائی سے اپنے بندوں کو (نقصان) سے دور رکھ اور اپنی بخشش سے دوسروں سے بے نیاز بنادے"۔[۳]

"مجھے اپنی بارگاہ میں ذلیل وخوار اور اپنی مخلوق کے سامنے عزیز وارجمند قرار دے۔ جب میں تیرے ساتھ خلوت میں رہوں تو انکساری کے ساتھ رہوں اور اپنے بندوں کے درمیان بلند مرتبہ اور سرفراز بنا جو شخص مجھ سے بے نیاز ہے تو مجھے اس سے بے نیاز بنا"۔[۴]

دوسری جگہ مرقوم ہے کہ پروردگار! اپنی نہ ختم ہونے والی عزت سے ہمیں عزت اور ارجمندی عطا کر۔

معاشرتی ذمہ داری کا احساس: صحیفۂ کاملہ کا آئیڈیل انسان صرف اپنے لئے زندہ نہیں رہتا بلکہ وہ عوام اور معاشرہ کی ذمہ داریوں کا احساس کرتا ہے۔ جس طرح قرآن امت پیغمبرؐ کی برتری کا راز ان کے درمیان

۱۔ ترجمہ صحیفہ سجادیہ، ص ۸۲
۲۔ عاملی، حسن، وسائل الشیعہ، ص ۱۸۱
۳۔ شیروانی، علی، سرشت انسان، ص ۵۳۳
۴۔ سرشت انسان، ص ۳۵۲

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں مضمر بتاتا ہے، اسی طرح جناب سید سجاد علیہ السلام نے بھی اپنی دعاؤں میں اس موضوع کو بیان فرمایا ہے:

"خدایا! محمد وآل محمد پر درود بھیج اور نیکی کرنے، بدی سے دور رہنے، نعمتوں کا شکر ادا کرنے، سنتوں (واجب و مستحب) کی پیروی کرنے، بدعتوں کے ترک کرنے، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اصول وفروع اسلام کی حفاظت کرنے، باطل اور نادرست باتوں کی مذمت کرنے، حق کی مدد اور عزت کرنے، گمراہوں کو راستہ دکھانے، کمزوروں کی مدد کرنے اور مظلوموں کی فریادرسی کرنے کی اس شب وروز اور تمام روز وشب میں توفیق عنایت فرما"۔[1]

امام زین العابدینؑ دوسروں کے مسئلہ میں اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے کے لئے خدا سے رہنمائی کی درخواست کرتے ہیں تاکہ آپ کو حسن ارشاد یعنی دوسروں کی رہنمائی کرنے کی اچھی نعمت عطا ہو۔[2]

حق کی رعایت: انسان کی ایک خصوصیت حق کی رعایت اور اس کا دفاع بھی ہے۔ انسان کامل کی یہ وہ خصوصیت ہے جس پر امام زین العابدین علیہ السلام نے صحیفۂ سجادیہ کی دعاؤں میں توجہ دی ہے:

"پالنے والے! نیکیوں کے انجام دینے اور برائیوں سے دور رہنے، باطل کی مذمت کرنے اور اسے ذلیل سمجھنے، حق کی مدد اور عزت کرنے، گمراہوں کو راستہ دکھانے، کمزور وناتواں کی مدد کرنے اور مظلوم کی فریاد کو پہونچنے کی توفیق عطا فرما"۔[3]

حق کے دفاع اور باطل سے مقابلہ کی اہمیت کے اعلان کے بعد امامؑ نے اس دعا میں یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ یہ باتیں وقتی نہیں ہیں بلکہ یہ ایسا فریضہ ہے جو ہمیشہ عائد ہوتا ہے اور اسلامی ثقافت کا حصہ ہے:

"پالنے والے محمد وآل محمدؐ پر درود بھیج اور مجھے صالحین کا انداز عطا فرما، متقین کی زینت کا لباس مرحمت فرما اور عدل وداد کی وسعت اور حق گوئی کے زیور سے مجھے زینت بخش"۔[4]

۱۔ صحیفہ سجادیہ، دعا ۶۰، بند ۱۸و۱۹

۲۔ ایضاً، دعا ۱۸، بند ۲۰

۳۔ ایضاً، دعا ۲۰، بند ۱۸

۴۔ ایضاً، دعا ۲۰، بند ۱۰

ظلم ستیزی : صحیفۂ سجادیہ کے آئیڈیل انسان کی خصوصیت ظلم ستیزی ہے، وہ نہ ظلم کرتا ہے اور نہ ظلم سہتا ہے، کیوں کہ قرآن کے مطابق ظلم کا ثمرہ اور ظالم کی طرف جھکاؤ کا نتیجہ جہنم اور آخرت کا عذاب ہے۔[۱] حضرت نے بارہا یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ اللہ آپ کو ظلم کرنے اور ظلم سہنے سے محفوظ رکھے :

"پالنے والے ! محمدؐ وآل محمدؐ پر درود بھیج اور مجھے اپنی پناہ ورحمت میں رکھ تاکہ میں ظلم کا شکار نہ بن جاؤں اور نہ دوسروں پر ظلم کروں حالانکہ تو مجھے ستم سے روکنے پر قادر ہے"۔[۲]

"ایک دوسری دعا میں آپ ارشاد فرماتے ہیں کہ مجھے ظالموں کا پشت پناہ اور مددگار نہ قرار دے اور کتاب خدا کے محو کرنے والوں کا معاون نہ بنا"۔[۳]

ایک مقام پر آپ بارگاہ احدیت میں معذرت طلب کرتے ہوئے بڑے ہی خاضعانہ انداز میں بیان فرماتے ہیں کہ پالنے والے ! میں اس مظلوم کے بارے میں معذرت خواہ ہوں جس پر میرے سامنے ظلم کیا گیا اور میں نے اس کی مدد نہ کی۔[۴]

شکر: قدر شناسی اور شکر گزاری بھی صحیفۂ سجادیہ کے آئیڈیل انسان کی ایک خصوصیت ہے۔ ان دعاؤں کے مجموعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ الٰہی نعمتوں کا شکر ادا کرنا بہت اہم فریضہ ہے جس سے ایک کامل اور مکمل انسان ہر گز چشم پوشی نہیں کرتا۔

ادائے شکر کو امام زین العابدین علیہ السلام نے اتنا اہم سمجھا ہے کہ آپ ناشکری کرنے والوں کو چوپایوں کے زمرہ میں شمار فرماتے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ پست جانتے ہیں کیوں کہ نعمتوں کا کفران اور ناقدری بے عقلی کی علامت ہے۔ دوسروں کی نیکیوں کے سلسلہ میں ناشکری سے امامؑ اللہ کی بارگاہ میں پناہ مانگتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ دوسروں کی نیکیوں کی قدر دانی کی بڑی اہمیت ہے :

"پالنے والے ! جس نے میرے ساتھ نیکی کی ہے اس کی ناشکری اور حرص وآز سے میں تیری پناہ چاہتا ہوں"۔[۵]

۱۔ سورہ ہود، آیت ۱۱۳

۲۔ صحیفہ سجادیہ، دعا ۲۰ ، بند ۱۴

۳۔ ولاتجعلنی للظالمین ظہیرا ولا لھم علی محو کتابک یدا و نصیراً (صحیفہ سجادیہ، دعا ۴۷ ، بند ۱۳۲)

۴۔ صحیفہ سجادیہ ، دعا ۳۸ ، بند ۱

۵۔ ایضاً، دعا ۳۸ ، بند ۳

"پالنے والے ! میں ان نیکیوں کے بارے میں معافی چاہتا ہوں جو مجھے عطا کی گئی اور میں ان کا شکریہ ادا نہیں کیا"۔[۱]

فروتنی : کبر اور نخوت سے دوری اور تواضع وفروتنی صحیفۂ سجادیہ کے کامل انسان کی خصوصیت ہے۔ اس خصوصیت کو بیان کرنے کے لئے امام زین العابدین علیہ السلام نے مختلف انداز اختیار کیا ہے۔ کبھی آپ پروردگار سے یہ فرماتے ہیں کہ وہ انہیں اس حال میں نہ چھوڑے کہ مال ودولت انہیں خود فریبی، طغیان اور بغاوت پر آمادہ کردے اور کبھی آپ نے غریبوں کی ہمنشینی کی شکل میں فروتنی کو طلب کیا ہے:

"پالنے والے ! فقراء اور درویشوں کے ساتھ ہمنشینی کو میرے لئے محبوب بنادے اور ان کی ہمنشینی پر صبر عنایت فرما"۔

کبھی آپ نے ہمسایوں کے ساتھ حسن سلوک کے قالب میں فروتنی کی درخواست کی ہے:

"خدایا ہمیں ہمسایوں کے ساتھ فروتنی اور نرمی کرنے کی توفیق عنایت فرما"۔[۲]

خدا سے آپ کی یہ درخواست کہ وہ انہیں تکبر میں مبتلا نہ کرے اور خود فریبی کی بناپر ان کی عبادتوں کو باطل نہ کرے اور فخر ومباہات سے بچائے، اس بات کی دلیل ہے کہ امام سجادؑ کی نظر میں انسان کامل کبر ونخوت سے دوری اختیار کرتا ہے اور فروتنی وتواضع کو پسند کرتا ہے۔

امامؑ کبر ونخوت اور خود فریبی سے دوری کو نہ صرف دوسروں کے ساتھ برتاؤ میں پسند کرتے ہیں بلکہ اسے انسان کی اندرنی حالت سمجھتے ہیں:

" پالنے والے ! محمد وآل محمد پر رحمت نازل فرما اور لوگوں کے نزدیک ہمارے کسی درجہ کو بلند نہ کرنا جب تک کہ خود ہمارے نزدیک ہمیں پست نہ بنادینا اور ظاہری طور پر عزت نہ دینا جب تک کہ نفس کے اندر احساس ذلت نہ پیدا ہوجائے "۔[۳]

۱۔ صحیفہ سجادیہ، دعا ۳۸، بند ۱

۲۔ ایضاً، دعا ۲۶، بند ۳

۳۔ ایضاً، دعا ۲۰، بند ۴

نتیجہ

دوسرے ائمہ کی طرح امام زین العابدین علیہ السلام بھی دین کی طرف ہدایت اور اچھے برے کی تبیین کے لئے ذمہ دار تھے لیکن آپ کا طریقہ کار دوسرے ائمہ سے ذرا مختلف ہے اور یہ فرق سیاسی حالات کی دین ہے۔ آپؑ نے دین کی تعلیم وتربیت کا جو طریقہ اختیار کیا وہ دعا کا طریقہ ہے۔ آپ نے اسی پیرایہ میں انسان کی ذمہ داریوں کو بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ انسان کامل وہی ہے جو مادی اور معنوی ضرورتوں کو منطقی بنیادوں پر پوری کرے، اپنی دنیا وآخرت دونوں کو آباد کرے اور ان دونوں کا لازمہ یہ ہے کہ خدا کی بندگی، عوام کی خدمت، ظلم سے مقابلہ اور مظلوم کا دفاع کرے، نیکیوں کا حکم دے، برائیوں سے روکے، حق کی طرف داری کرے اور اللہ والا بن کر خدا کی طرف رخ کرے۔

منابع و مآخذ

- الٰہی قمشہ ای، ترجمہ صحیفۂ سجادیہ، انتشارات اسلامی، تہران، ۱۳۸۷
- حکیمی، محمد رضا، الحیاۃ، ج ۲، دفتر نشر فرہنگ اسلامی، تہران، ۱۴۰۹ق
- دشتی، محمد، ترجمہ نہج البلاغہ، انتشارات نسیم حیات، قم، ۱۳۷۹
- دیلمی، اوآذر باہجانی، اخلاق اسلامی، نشر معارف، قم، ۱۳۸۰
- شیروانی، علی، سرشت انسان، انتشارات معارف، قم، ۱۳۷۶
- عاملی، حسن، وسائل الشیعہ، ج ۱۲ و ۱۱، تراث العربی، بیروت، ۱۳۷۰
- فیض الاسلام، علی نقی، ترجمہ صحیفہ کاملہ سجادیہ، تہران، ۱۳۷۵
- کاشف الغطاء م۔ح، این است آئین ما، ترجمہ مکارم شیرازی، مطبوعاتی ہدف، قم، ۱۳۷۴
- مسعودی، علی بن الحسین، اثبات الوصیۃ، مؤسسہ انصاریان، قم، ۱۴۱۷ق
- مطہری، مرتضیٰ، سیری در سیرہ ائمہ اطہار، انتشارات صدرا، تہران، ۱۳۷۶

سیرہ نبوی صحیفہ سجّادیہ کی روشنی میں

مؤلف: سید علی سجادی زادہ
مترجم: شبیہ عباس خان

صحیفہ سجادیہ وہ گران قدر میراث ہے جو سید ساجدینؑ سے ہم تک پہنچا ہے۔ اہل علم کی ہمیشہ سے یہ تمنا رہی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی شناخت اور آپ کی سیرت سے آشنائی، اہل بیتؑ کے کلام کے ذریعے ہی انجام پائے۔ امام سجادؑ کی نگاہ میں پیغمبر اکرمؐ بلند شخصیت کے مالک تھے اور خدا کے نزدیک آپ کا اعلیٰ مقام تھا اور آپ معبود کے منتخب بندہ تھے۔ امام سجادؑ آپ کو وحی کے امانت دار، امام رحمت، برکتوں کی کنجی، خیر کی طرف رہنمائی کرنے والے اور بشر کی ہدایت و نجات کا وسیلہ بتاتے ہیں۔

پیغمبر اکرمؐ کی سیرت کی طرف اشارہ کرتے وقت امام سجادؑ نے آپ کی عملی سیرت کے دو حصوں یعنی تبلیغی سیرت اور جنگی سیرت پر روشنی ڈالی ہے۔ پیغمبر اکرمؐ دین خدا کو اعزاز دلانے کے لئے خلوص دل سے اور اپنی پوری ہمت اور شہامت کو بروئے کار لاتے ہوئے اور مختلف مشکلات کو برداشت کرتے ہوئے، یہاں تک کہ اپنے آبائی اور محبوب شہر مکہ سے ہجرت فرما کر تبلیغ رسالت انجام دیتے رہے۔ جنگی سیرت میں بھی آپ نے خدا سے مدد کی درخواست کرتے ہوئے تھا جمی حکمت عملی سے کام لیا اور دشمنوں پر برسے۔ آپ کی زحمات کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ اپنے اعلیٰ اہداف تک پہنچے اور دشمنوں پر فتح حاصل کی اور بندگان خدا کے لئے امن قائم کرکے ان تک توحید کے کلمات کو پہنچایا۔ اللہ تعالی قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا۔ ترجمہ: مسلمانو! تم میں سے اس کے لئے رسول کی زندگی میں بہترین نمونہ عمل ہے، جو اللہ اور آخرت سے امیدیں وابستہ کئے ہوئے ہے اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرتا ہے[1]۔

۱۔ سورہ احزاب، آیت ۲۱

ہم ایسے دور میں زندگی گزار رہے ہیں جس میں عالم ہستی کی سب سے اہم ترین شخصیت یعنی حضرت محمدؐ کی سیرت کو پہچاننا سب سے زیادہ ضروری ہے اور اس بات کا بھی اقرار کرنا ہوگا کہ آپ کی شخصیت حتیٰ کہ مسلمانوں اور آپ کے مُریدوں کے درمیان بھی سب سے زیادہ مظلوم ہے۔ جی ہاں۔ یہ انسان کامل جس کو تمام بشریت کے لئے مثال اور آئیڈیل ہونا چاہئے، وہ عالم بشریت میں سب سے زیادہ مظلوم ہے۔اس صورت حال میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنی اس ذمہ داری کو محسوس کرتے ہیں اور آپ کی سیرت کو پہچاننے کے لئے مختلف وسائل اور منابع کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ بعض لوگ پیغمبر اکرمؐ کی شناخت اور آپ کی سیرت کو بہتر طریقے سے درک کرنے کے لئے قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں جو اپنے آپ میں بہت ہی پسندیدہ فعل ہے۔ اسی طرح بعض افراد سیرت اور تاریخ کی کتابیں جیسے کہ سیرہ ابن ہشام، طبقات ابن سعد، تاریخ یعقوبی، تاریخ طبری وغیرہ کا سہارا لیتے ہیں اور ان پر بھروسہ کرتے ہیں۔

اس درمیان سیرت رسولؐ کی شناخت کے لئے آپ کی اولاد اطہار اور اہل بیت معصومؑ کے کلام اور الفاظ کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ بالخصوص حضرت سیدالساجدین امام علی بن الحسینؑ کے کلمات اور آپ سے منسوب تحریر یعنی صحیفہ سجادیہ۔ مقالہ ہذا میں کوشش کی گئی ہے کہ صحیفہ سجادیہ کو مطالعہ کرتے ہوئے، امام سجادؑ کی زبان سے پیغمبر اکرمؐ کی سیرت کو سمجھا جائے۔

سیرت اور سیما کا لغوی مفہوم

بہتر ہوگا ابتدا میں ہی واضح کردیا جائے کہ سیما اور سیرت سے کیا مراد ہے۔ سیما لغت میں ہیئت، نشان، علامت، چہرہ اور صورت کے معنیٰ میں ہے۔[1] یہاں پر سیما سے مراد پیغمبر اکرمؐ کی خصوصیات اور فضائل کو بیان کرنا ہے۔ بندہ خدا ہونا، خدا کا نبی اور رسول ہونا، خاتم المرسلین اور خدا کا نمائندہ ہونا جیسے صفات کو بیان کرنا مقصود ہے نہ کہ آپ کے اخلاق اور ظاہری شکل و شمائل کو بیان کرنا۔ دوسرے الفاظ میں کہا جائے تو صحیفہ سجادیہ میں سیمائے پیغمبر اکرمؐ کے سلسلے میں گفتگو کے دوران آپ کی ان خصوصیات کی

۱۔ معین، محمد، فرہنگ فارسی، ج ۲

طرف اشارہ کیا جائے گا جنہیں خدا نے آپ کو عطا کی ہیں اگرچہ آپ کا کردار و صفات آپ کو منتخب ہونے کے لئے شائستہ بناتے ہیں۔

لغت میں سیرہ لفظ سیر کا اسم مصدر ہے۔ سیر کا مطلب زمین پر چلنا اور حرکت کرتے رہنا ہے اور سیرہ روش اور طریقہ کے معنیٰ میں ہے لیکن رفتہ رفتہ یہ لفظ اخلاق، شہرت، سرگزشت، تاریخ اور سوانح حیات کے معنیٰ میں بھی استعمال ہونے لگا۔ اس مقالہ میں لفظ سیرہ سے مراد ہے روش اور طریقہ، کام کرنے کا سلیقہ، پیش آنے کا انداز اور وہ منطق جس کو انسان اپنے اندر پیدا کرتا ہے تاکہ اپنے مقصد تک پہنچ سکے۔ لہٰذا اس بحث کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

الف) سیمائے پیغمبر اسلامؐ صحیفہ سجادیہ کی روشنی میں

ب) سیرت پیغمبر اسلامؐ صحیفہ سجادیہ کی روشنی میں

الف۔ سیمائے پیغمبر اسلامؐ صحیفہ سجادیہ کی روشنی میں

امام سجادؑ کا زمانہ: اسلام اور تشیع کی تاریخ کا سیاہ ترین دور ہے۔ فرزند رسولؐ کو سبھی جوانوں، بھائیوں اور اصحاب کے ساتھ قتل کر دیا گیا، عورتوں اور بیٹیوں کو اسیر بنایا گیا اور منبروں سے خاندان نبوت کے بزرگوں پر لعنت بھیجی گئی۔ امام حسینؑ کی شہادت کے بعد اسلامی معاشرے کے ہر فرد پر موت کا غبار بیٹھا ہوا تھا اور دل مردہ ہو چکے تھے۔ امام صادقؑ کی تعبیر اس بات کو اور بھی واضح کر دیتی ہے۔ آپ نے فرمایا:

ارتد الناس بعد قتل الحسين عليه السلام إلا ثلاثة: أبوخالد الكابلي، ويحيى بن أمالطويل وجبير بن مطعم۔ ترجمہ: امام حسینؑ کی شہادت کے بعد سارے لوگ مرتد ہو گئے سوائے ان تین لوگوں کے ابو خالد کابلی، یحی ابن امّ طویل و جبیر بن مطعم[۱]۔

بعض روایات میں جابر ابن عبداللہ انصاری کا نام بھی ملتا ہے لیکن امام سجادؑ کی کوششوں کے نتیجے میں لوگ آئین حق کی طرف دوبارہ لوٹے اور ان میں اضافہ ہوتا گیا۔

شاید کچھ لوگوں کے ذہن میں یہ غلط تصور پیدا ہو کہ واقعہ کربلا کے بعد اہل تشیع کے پیشوا اور اولاد امام حسینؑ نے سیاست سے علیحدگی اختیار کر لی تھی اور ارشاد و عبادت میں مشغول ہو گئے تھے اور دنیا سے منقطع

۱۔ طوسی، محمد بن حسن، اختیار معرفۃ الرجال، ص ۴۴

ہو کر زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یا یہ تصور کرتے ہوں کے اہل تشیع کی پیشوائی کرنے والے سبھی بہت مظلوم تھے اور ان کو ایسا لگتا ہو کہ یہ مظلوم پیشوار ہبری سے خود کو دور رکھنا چاہتے تھے اور امت کو بھی ان کا رہبری سے دور جانا قبول تھا اور اسی سبب ان کو زندگی میں طرح طرح کی سختیاں اور محرومیت نصیب ہوئیں۔ ایسے لوگ اپنے اس دعوے کے لئے امام سجادؑ کی زندگی کی تاریخ سے استناد کرتے ہیں لیکن یہ لوگ اس بات سے غافل ہیں کہ امام سجادؑ مکتب اسلام کو بچانے اور اس کو انحراف سے محفوظ رکھنے کی اپنی ذمہ داریوں سے بخوبی آگاہ تھے۔ آپ نے لازم تدابیر سے کام لیا تاکہ اصل اسلام پوری طرح محفوظ رہے۔ ایک طریقہ جو امام سجادؑ نے لوگوں کی ہدایت کے لئے اختیار کیا وہ دعا کا راستہ تھا۔ آپ نے دعاؤں کے مجموعہ کہ ذریعہ لوگوں کی رہنمائی کی اور خدا کی طرف ہدایت کے راستے کو ہموار کیا اور خاتم المرسلینؐ اور آپ کے اہل بیت اطہار کی سیما و سیرت کی طرف توجہ دلائی۔ رسول اکرمؐ اور آپ کے اہل بیت اطہار پر مختلف خوبصورت شکلوں میں صلوات بھیجنا بھی ایک طرح سے انسانوں کو اچھے نمونوں کی طرف متوجہ کرنا ہے اور یہ بتانا ہے کہ یہی افراد معاشرے کی اصلاح کر سکتے ہیں۔

امام سجادؑ نے اپنے خوبصورت اور مجذوبانہ بیانات میں پیغمبر اکرمؐ کی مقدس تصویر کو پیش کیا ہے اور حضورؐ کی پر جوش و خروش سیرت کو پہچنوایا ہے۔ امام سجادؑ امت کی ہدایت اور زعامت کرنے کے دعویداروں کو سکھا رہے ہیں کہ وہ پیغمبر اکرمؐ اور آپ کی آل اطہار سے پاکی، مہربانی، پیغامات کا درستی سے دریافت کرنے، مشکلات اور پریشانیوں کو برداشت کرنے اور حکمت عملی کا درس لیں۔

پیغمبر اکرمؐ کے چہرہ انور کی جو تصویر امام سجادؑ ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں وہ اس طرح ہے: پیغمبر اکرمؐ بارگاہ خداوندی میں اعلیٰ مقام اور درجہ کے مالک ہیں۔ آپ حبیب خدا، اس کے برگزیدہ بندہ، امانتدار وحی اور امام رحمت اور دلسوز پیشوا ہیں۔ آپ تمام فرشتوں اور انبیائے الٰہی کے سردار ہیں اور نیکیوں کے رہنما اور برکات کی کنجی ہیں۔ آپ خدا کی طرف رہنمائی کرنے والے اور ہدایت و نجات بشریت کا وسیلہ ہیں۔ پیغمبر اکرمؐ وہ ہیں جنہوں نے حق کو ادا کیا اور اپنے عہد پر وفا فرمایا، لہٰذا آپ پر مسلسل درود سلام بھیجنا چاہیے اور بارگاہ خدا میں آپ کے لیے اعلیٰ ترین مقام و درجات کی درخواست کرنی چاہئے۔ امام سجادؑ کی دعاؤں میں پیغمبر اکرمؐ کے سلسلے میں جو عنوانات ملتے ہیں وہ اس طرح ہیں:

امام رحمت اور امانت دار وحی:

پیغمبر اکرمؐ کی یہ خصوصیت صحیفہ سجادیہ کی دوسری دعا میں ملتی ہے۔ مکہ کے لوگ پیغمبر اسلامؐ کی امانتداری کے سبب آپ کو امین کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ خدائے رحمان نے بھی آپ کو اپنے وحی کا امین بنایا اور اپنے کلام اور قرآن کو آپ کے سپرد کیا:

اَللّٰهُمَّ فَصَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ اَمينِكَ عَلٰى وَحيِكَ وَ نَجيبِكَ مِن خَلقِكَ وَ صَفِيِّكَ مِن عِبادِكَ اِمامِ الرَّحمةِ وَ قَائِدَ الخَيرِ وَ مِفتاحِ البَرَكةِ۔ ترجمہ: خدایا رحمت نازل فرما حضرت محمدؐ پر جو تیری وحی کے امین، تیری مخلوقات میں منتخب، تیرے بندوں میں خالص و مخلص، تیری رحمت کے امام، تیرے خیر کے قائد اور برکت کی کلید تھے۔[1]

حبیب:

وَ اَسأَلُكَ اَللّٰهُمَّ بِاَنَّ لَكَ المُلكَ وَ الحَمدَ لا اِلٰهَ اِلّا اَنتَ اَن تُصَلِّيَ عَلٰى مُحَمَّدٍ عَبدِكَ وَ رَسُولِكَ وَ حَبيبِكَ وَ صِفوَتِكَ و خِيَرَتِكَ مِن خَلقِكَ۔ ترجمہ: اور خدایا میرا سوال اس بنیاد پر کہ سارا ملک تیرا ہے اور ساری حمد تیرے لئے ہے اور تیرے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے۔ حضرت محمد جو تیرے بندہ، رسول، محبوب، مصطفیٰ اور مخلوقات میں منتخب ہیں۔[2]

خاتم المرسلین:

صحیفہ سجادیہ کی سترہویں دعا میں امام سجادؑ پیغمبر اکرمؐ پر خاتم الانبیاء اور سید المرسلین کے عنوان سے درود و سلام بھیجتے ہیں اور اس کے بعد اپنے لئے اپنے چاہنے والوں کے لئے، اپنے بھائیوں کے لئے اور تمام مومنین و مومنات کے لئے شیطان کے جھوٹ، مکر، اور فریبوں سے پناہ کی دعا مانگتے ہیں۔

لغت میں خاتم اسے کہتے ہیں جس سے کسی چیز کو پورا اور مکمل کیا جاتا ہے۔ خط کے مکمل ہو جانے پہ اس پر جو مھر لگائی جاتی ہے اس کو خاتم بولتے ہے۔ پیغمبر اسلامؐ کے ذریعہ سلسلہ نبوت کا ختم ہونا مسلمانوں کے لئے روشن اور واضح امر ہے۔

۱۔ صحیفہ سجادیہ، دعا نمبر ۲، بند ۳

۲۔ ایضاً، دعا نمبر ۴۸، بند ۳

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ خَاتَمِ النَّبِیِینِ وَ سَیِّدِ المُرسِلِینَ ۔ترجمہ: خدایا رحمت نازل فرما حضرت محمدؐ پر جو خاتم النبیّین اور سید المرسلین ہیں۔[1]

خیرہ (منتخب)

امام سجادؑ نے صحیفہ سجادیہ کی متعدد دعاؤں میں پیغمبر اسلامؐ کے منتخب ہونے کی خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ امامؑ نے بعض مقامات پر حضورؐ کی اس خصوصیت کو "صفی" (دعا نمبر ۲)، "مصطفٰی" اور "صفوہ" (دعا نمبر ۴۷) جیسی تعابیر سے یاد کیا ہے۔ خدا کی طرف سے پیغمبر اسلامؐ کو منتخب کرنا اور آپ کو کمال نبوت سے فیضیاب کرنا در حقیقت آپ میں پائی جانے والی قابلیت، استعداد اور ظرفیتوں کی نشاندہی کرتی ہے۔ مولا علیؑ فرماتے ہیں:

كُلَّمَا نَسَخَ اللّٰه الْخَلْقَ فِرْقَتَيْنِ جَعَلَه فِي خَيْرِهِمَا ۔ ترجمہ: جب بھی پروردگار نے مخلوقات کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے تو پیغمبر اکرم (ص) کو بہترین حصہ ہی میں رکھا ہے۔[2]

امام سجادؑ ارشاد فرماتے ہیں:

وَ اَنَّ مُحَمَّداً عَبدُكَ وَ رَسُولُكَ وَ خِيَرَتُكَ مِن خَلقِكَ حَمَّلتَهُ رِسالَتَكَ فَاَدَّاها وَاَمَرتَهُ بِالنُّصحِ لِاُمَّتِهِ فَنَصَحَ لَها۔ ترجمہ: اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد تیرے بندہ، رسول، اور مخلوقات میں تیرے پسندیدہ ہیں، تو نے انہیں رسالت کا ذمہ دار بنایا تو انہوں نے پیغام کو پہنچادیا اور امت کو نصیحت کا حکم دیا تو نصیحت فرمادی۔[3]

۱۔ صحیفہ سجادیہ، دعا نمبر ۱۷، بند ۱۵
۲۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۲۱۴
۳۔ صحیفہ سجادیہ، دعا ۶، بند ۲۲

وَ صَلِّ عَلی خِیَرَتِکَ اَللّٰھُمَّ مِن خَلقِکَ مُحَمَّدٍ وَ عِترَتِہِ الصَّفوَۃِ من بِرِیَّتِکَ الطّاھِرینَ۔ ترجمہ: خدایا اپنی تمام مخلوقات میں پسندیدہ ترین فرد حضرت محمد اور ان کی پاکیزہ عترت پر صلوات کرنے والا بنادے۔[1]

رسول اور نبی

پیغمبر اسلامؐ رسول اور نبی ہیں اور اس بات کا تذکرہ صحیفہ سجادیہ میں بار بار ہوا ہے۔ (دعا نمبر ۲، ۴، ۶، ۴۲، ۴۵ اور ۵۴)۔ لفظ رسول رسل سے ماخوذ ہے اور اس کا مطلب ہے امتداد اور حرکت کرنا۔

وَالحَمدُ للّٰہِ الَّذی مَنَّ عَلَینا بِمُحَمَّدٍ نَبیِّہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَ آلِہِ دُونَ الاُمَمِ الماضِیَۃِ وَ القُرونِ السّالِفۃِ۔ ترجمہ: شکر ہے اس خدا کا جس نے ہم پر یہ احسان کیا کہ تمام گذشتہ امتوں اور ماضی کے زمانوں کو چھوڑ کر پیغمبر اسلام کو ہمارے درمیان بھیجا۔[2]

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلی مُحَمَّدٍ عَبدِکَ وَ رَسُولِکَ وَ اَھلِ بَیتِہِ الطاھِرینَ۔ ترجمہ: خدایا اپنے بندے اور رسول حضرت محمد پر رحمت نازل فرما اور ان کے اہل بیت طاہرین پر بھی۔[3]

اس کے علاوہ صحیفہ سجادیہ کے دوسرے مقامات پر بھی حضرت محمدؐ کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں جیسے کہ سید المرسلین (دعا ۶)، صفوہ (دعا ۴۸)، صفی (دعا ۲)، عبد (متعدد دعاؤں میں)، قائد خیر (دعا ۲)، المحمدیہ الرفیعہ (دعا ۴۸)، مصطفیٰ (دعا ۴۷)، مفتاح برکت (دعا ۲)، مقرب، ملھم، مکرم و منتخب (دعا ۴۷)، نبی (مختلف دعاؤں میں) اور نجیب (دعا ۲)۔

پیغمبر اکرمؐ کا بلند مرتبہ امام سجادؑ کی نظر میں

امام سجادؑ کی نگاہ میں پیغمبر اکرمؐ ایک بلند اور اعلیٰ مرتبہ کے مالک ہیں جن کے وسیلہ سے انسان قرب الٰہی کے مرتبہ تک پہنچ سکتا ہے اور خود کو دشمنوں کے شر اور ان کے مکر سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ امام سجادؑ

۱۔ صحیفہ سجادیہ، دعا ۴۴، بند ۵
۲۔ ایضاً، دعا نمبر ۲، بند ۱
۳۔ ایضاً، دعا ۴۴، بند ۱

صحیفہ سجادیہ کی انچاسویں دعا میں اللہ تعالی سے دشمنوں کے مکر وفریب کو دور کرنے اور ان کی طرف سے وارد ہونے والی سختیوں اور بلاؤں کو انہیں کی طرف لوٹانے کی درخواست کرتے ہیں اور اسی دعا کے اختتامی فقرات میں فرماتے ہیں:

اللّٰهُمَّ فَإِنِي اَتَقَرَّبُ اِلَيكَ بِالمُحَمَّدِيَّةِ الرَّفِيعَةِ وَ العَلَوِيةِ البَيضاءِ وَ اَتَوَجَّهُ اِلَيكَ بِهِمَا أن تُعيذَنِي مِن شَرِّ كَذا وَكَذا ۔ ترجمہ: اے میرے معبود! میں محمدؐ کی بلند پایہ منزلت اور علیؑ کے مرتبۂ روشن ودرخشاں کے واسطے سے تجھ سے تقرب کا خواستگار ہوں اور ان دونوں کے وسیلہ سے تیری طرف متوجہ ہوں تاکہ مجھے ان چیزوں کی برائی سے پناہ دے جن سے پناہ طلب کی جاتی ہے۔[1]

پیغمبر اکرمؐ پر امام سجادؑ کی مخصوص صلوات

حمد و ثنائے پروردگار اور خدا کی بارگاہ میں شکرانہ کے بعد امام سجادؑ نے سب سے زیادہ پیغمبر اکرمؐ اور آپ کے خاندان اطہار پر درود وسلام پر توجہ کی ہے۔ صحیفہ سجادیہ میں تقریبا ۲۲۰ مرتبہ پیغمبر اکرمؐ پر سلام و صلوات بھیجی گئی ہے۔ جیساکہ اس سے پہلے بھی ذکر کیا گیا کہ امام سجادؑ کا پیغمبر اکرمؐ پر صلوات پڑھنا انسانوں کو ان خوبصورت نمونے اور مثالی شخصیتوں کی طرف توجہ دلانا ہے جن سے معاشرے کی اصلاح میں مدد ہو سکتی ہے۔ استاد محمد رضا حکیمی کی تعبیر کے مطابق امام ذکر صلوات اور محمد وآل محمد پر درود کے مسلسل تکرار سے صالح نظام اور حکومت حق کو ذہنوں میں زندہ کرنا چاہتے ہیں اور حقیقی رہبران عدالت کو پہچنوانا چاہتے ہیں۔ آپ الٰہی مربی کی یاد کو زندہ کرکے صالح نظام کو پہچنوا رہے ہیں۔

امامؑ صحیفہ سجادیہ کی اکثر دعاؤں میں مختلف صورتوں سے رسول اکرمؐ پر درود بھیجتے ہیں۔ صلوات کی اہمیت کسی بھی مسلمان پر پوشیدہ نہیں ہے۔ خدا قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

۱۔ صحیفہ سجادیہ، دعا ۴۹، بند ۱۶

إِنَّ اللَّـهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۔ترجمہ: بیشک اللہ اور اس کے ملائکہ رسول پر صلوٰات بھیجتے ہیں تو اے صاحبانِ ایمان تم بھی ان پر صلوٰات بھیجتے رہو اور سلام کرتے رہو ۔[۱]

عربی ادب سے آشنائی رکھنے والے افراد بخوبی جانتے ہیں کہ فعل مضارع استمرار پر دلالت کرتا ہے، یعنی خدا اور فرشتگان الٰہی مسلسل نبی کریمؐ پر درود و سلام بھیج رہے ہیں اور اہل ایمان کو بھی حکم ہے کہ آپ پر درود بھیجتے رہیں۔

پیغمبر اکرمؐ اور آپ کے خاندان اطہار کے لئے خدا کی بارگاہ میں درود و سلام کی درخواست کرنا جہاں ایک طرف اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ہم نے رسول اللہؐ کی دعوت حق اور اماموں کی جانشینی کو قبول کیا ہے، وہیں دوسری جانب رسول اللہؐ اور آپ کے آل اطہار سے محبت کا بھی مظاہرہ ہے اور اسی طرح پیغمبر اسلامؐ اور معصوم اماموں سے تجدید بیعت کی بھی گواہی ہے۔امام صادقؑ رسول اکرمؐ پر صلوات بھیجنے کے فلسفے کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

جو بھی پیغمبر اکرمؐ پر درود بھیجتا ہے، اس کا مطلب وہ گواہی دے رہا ہے کہ خدا سے جو عہد اس نے کیا ہے، اس پر وہ وفادار رہے گا[۲]۔

شیخ کلینی نے اپنی کتاب اصول کافی میں ایک باب الصلاۃ علی النّبی محمّد و اھل بیتہ کے عنوان سے کھولا ہے جس میں ۲۱ حدیثیں صلوات کی اہمیت اور اس کے آثار کے بارے میں درج کی ہیں اور اسے خاص طور سے دعا کی اجابت کے لئے شرط بتایا ہے ۔

علامہ طباطبائی مذکورہ آیت کے ذیل میں اہل سنت کی ایک حدیث کا ذکر کرتے ہیں اور سیوطی کی ان ۱۸ احادیث کو بھی بیان کرتے ہیں جو آل محمد کے صلوات میں شریک ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ اس کے بعد تحریر کرتے ہیں: اس سلسلے میں شیعہ روایتیں حد احصاء سے بڑھ کر ہیں اور ان کو شمار کرنا ناممکن ہے[۳]۔

۱۔ سورہ احزاب، آیت ۵۶
۲۔ شیخ صدوق، محمد بن علی، معانی الاخبار، ص ۱۱۶
۳۔ طباطبائی، سید محمد حسین، المیزان، جلد ۱۶، ص ۳۴۴

بعض مقامات پر امام سجادؑ بہترین درود و سلام اور بے شمار گرانقدر تحائف رسول اکرمؐ کی خدمت میں پیش کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

اللّٰهُم صَلِّ عَلي مُحَمَّدٍ عَبدِكَ وَ رَسُولِكَ وَ آلِ مُحَمَّدٍ صَلوةً عَالِيةً عَلي الصَّلَوَاتِ مُشرِفَةً فَوقَ التَّحِياتِ صَلوةً لَا يَنتَهي اَمَدُهَا وَ لَا يَنقَطِعُ عَدَدُهَا كَاَتَمَّ مَا مَضي مِن صَلَواتِكَ عَلَي اَحَدٍ مِن اَولِيائِكَ۔ ترجمہ: خدایا! حضرت محمد پر رحمت نازل فرما جو تیرے بندہ اور رسول ہیں اور آل محمدؐ پر بھی وہ صلوات نازل فرما جو تمام صلواتوں سے بلند تر اور تمام تجلیات میں سب سے زیادہ نمایاں ہو۔ وہ صلوات جس کی مدت تمام نہ ہو اور جس کے عدد کا سلسلہ ختم نہ ہو۔ ایسی مکمل ترین صلوات جو تو نے ماضی میں کسی بھی ولی پر نازل کی ہے۔[1]

یا دعا نمبر ۱۳، بند ۲۴ میں فرماتے ہیں:

وَ صَلِّ عَلَي مُحَمَّدٍ وَ اَلِهَ صَلَاةً دَائِمَةً نَامِيةً لا اِنقِطاعَ لابَدِهَا وَ لا مُنتَهي لامَدِها وَ اجعَل ذَلِكَ عَوناً لِي وَ سَبَباً لِنَجاحِ طَلِبَتي إِنَّكَ وَاسِعٌ كَرِيمٌ۔ ترجمہ: اور محمد و آل محمد پر رحمت نازل فرما جو دائمی اور بڑھنے والی ہو اور جس کی ابدیت تمام نہ ہو اور اس کی مدت کی انتہا نہ ہو اور اسی صلوات کو میرے لئے مددگار اور میرے مقاصد کی کامیابی کا ذریعہ بنادے کہ تو صاحب وسعت اور کریم ہے۔

ان مقامات پر امامؑ نے ہمیشہ کی طرح بارگاہِ حق میں محمدؐ و آل محمدؐ کے لئے درود و سلام کی درخواست کرتے ہوئے، صلوات کے فلسفہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ حاجات کی قبولی میں صلوات کس قدر مددگار ہے۔ دعا نمبر ۳۲ بند ۳۴ جو کہ آپ کی نماز شب کے بعد کی دعا ہے، میں آپ فرماتے ہیں:

اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَ آلِهِ إذا ذُكِرَ الابرارُ وَ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَ آلِهَ مَا اختَلَفَ اللَّيلُ وَ النَّهارُ صَلوةً لَا يَنقَطِعُ مَدَدُهَا وَ لَا يُحصَي عَدَدُهَا صلاةً تَشحَنُ الهَواءَ وَ تَملَأُ الارضَ وَ السَّماءَ۔ ترجمہ: خدایا! محمد و آل محمد پر رحمت نازل فرما اس وقت جب نیک کرداروں کا ذکر کیا جائے اور محمد و آل محمد پر جب تک روز و شب کی آمد و رفت برقرار ہے ایسی

۱۔ صحیفہ سجادیہ، دعا نمبر ۴۷، بند ۱۸

رحمت نازل فرما جو منقطع نہ ہو اور جسے شمار نہ کیا جاسکے۔ ایسی رحمت جو فضا کو معمور کردے اور آسمان وزمین کو وسعتوں سے بھر دے۔

اس دعا میں امام سجادؑ خدا کی بارگاہ میں اس وقت تک محمدؐ وآل محمدؐ کے لئے درود وسلام کی درخواست کرتے ہیں جب تک نیکوکاروں کا ذکر ہو اور ان کو یاد کیا جائے، جب تک شب و روز کے آنے جانے کا سلسلہ قائم رہے، وہ بھی ایسا درود وسلام جن کو شمار کرنا ممکن نہ ہو، جو زمین وآسمانوں کو بھر دے اور اس طرح بھر دے کہ وہ خوشنود ہو جائیں اور خوشنودی کے بعد بھی درود وسلام کا سلسلہ نہ رکے۔

دعا نمبر ۴۴ میں امام سجادؑ خدا سے محمدؐ وآل محمدؐ کے لئے ہر وقت، ہر گھڑی اور ہر حال میں درود و صلوات کی درخواست فرماتے ہیں۔ امامؑ ایسی رحمت کی دعا فرماتے ہیں جو خدا نے کسی پر بھی نازل نہ کی ہو اور سب کی رحمتوں سے دوگنی چوگنی ہو، جس کو خدا کے علاوہ کوئی شمار نہ کرسکے:

اللهم صل على محمد و آله ، في كل وقت و كل اوان و على كل حال عدد ما صليت على من صليت عليه و اضعاف ذلك كله بالاضعاف التي لا يحصيها غيرك۔

دعا نمبر ۴۸ (روز جمعہ و عید الضحی کی دعا) کے اختتامی فقرات میں امام سجادؑ ان دو اسلامی اعیاد کے موقعہ پر مسلسل محمد وآل محمد پر درود و صلوات بھیجتے ہیں اور دعا کے بعد رسول خداؐ پر ایک ہزار مرتبہ درود بھیجتے ہیں اور دعا پڑھنے والے سے بھی چاہتے ہیں کہ وہ بھی اسی طرح دعا کرے:

ثُمَّ تَدْعُو بِمَا بَدَا لَكَ وَ تُصَلِّي عَلَى مُحَمَّدٍ وَ آلِهِ أَلْفَ مَرَّةٍ هَكَذَا كَانَ يَفْعَلُ عَلَيْهِ السَّلامُ۔

پیغمبر اکرمؐ امام رحمت

قرآن میں مختلف مقامات پر پیغمبر اکرمؐ کے امام رحمت ہونے کی بات ہوئی ہے اور امام سجادؑ کے صحیفہ سجادیہ میں بھی جگہ جگہ پر پیغمبر اسلامؐ کی اس اہم خصوصیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آپ کا لوگوں کے لئے رحمت ہونا ہی درحقیقت وہ خصوصیت تھی جس نے لوگوں کو آپ کی طرف مجذوب کیا۔ آپ کا وجود مقدس عالم بشریت کے لئے ہر زاویہ سے رحمت کا باعث تھا۔ آپ کا اپنے سرسخت اور کینہ پرور دشمنوں کے ساتھ رحیمانہ برتاؤ اور اپنی امت کے لئے آخرت میں شفاعت کی درخواست خود رحمت ہے۔ یہاں تک کہ آپ کی جنگ بھی جس کا مقصد بشریت کو فکری موانع سے نجات دلانا اور بتوں کے چنگل سے آزادی فراہم کرنا ہی، رحمت ہے۔

صحیفہ سجادیہ کی دوسری دعا میں اس خصوصیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ شارح صحیفہ سجادیہ سید علی خان مدنی اس بارے میں لکھتے ہیں:

امامؑ کا مطلب ہے پیشوا (وہ رہبر جس کی اقتدا کی جائے)، رحمت، مہربانی، خدا کی مخلوقات کے لئے ہمدردی اور ان کے حق میں محبت اور نیکی کرنا۔[1]

وہ آگے تحریر کرتے ہیں:

امام کے ساتھ رحمت کی اضافت یا تو لام اختصاص کے معنیٰ میں ہے یعنی رحمت کے لئے مخصوص امام یا یہ اضافت بیانی ہے یعنی رحمتوں سے بنا ہوا امام، لہٰذا ایک ایسا امام جس کا وجود رحمت ہے گویا وہ خود رحمت ہے۔ یہ آیہ شریفہ اسی طرف اشارہ کرتی ہے: وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔[2] حدیث میں وارد ہوا ہے: انما انا رحمة مهداة: میں مخلوقات کے لئے رحمت کی شکل میں تحفہ ہوں اور ایک دوسری حدیث میں ہے: جعلنی رسول الرحمة: خدا نے مجھے رسول رحمت قرار دیا ہے۔[3]

پیغمبر اسلامؐ عبدِ خدا

امام سجادؑ صحیفہ کی مختلف دعاؤں میں (دعا نمبر ۶، ۲۴، ۲۷، وغیرہ) رسول اللہ کے عبد خدا ہونے پر تاکید فرماتے ہیں۔ عبدِ خدا ہونے کا مقام آپ کے لئے باعث فخر تھا اور اسی لئے تواضع کے سبب آپ خود کو خدا کے بندوں میں سب سے زیادہ عبد مانتے تھے۔ علامہ مجلسی امام صادقؑ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک روز رسول خداؐ کا گذر ایک بدو و یا بدزبان عورت کے سامنے سے ہوا جو زمین پر بیٹھ کر کھانا کھانے میں مصروف تھی۔ اس عورت نے آپ سے کہا: اے محمد! خدا کی قسم تم بھی بندوں کی طرح کھاتے اور بیٹھتے ہو۔ رسول خداؐ نے جواب میں فرمایا: وَيحك! أيّ عبد أعبد منّي، کون بندہ ہے جس میں مجھ سے زیادہ خدا کی بندگی ہے۔

۱۔ حسینی مدنی، سید علی خان، ریاض السالکین، ص ۴۵۷

۲۔ سورہ انبیاء، آیت ۱۰۷

۳۔ مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار، جلد ۱۶، ص ۹۳ اور ۹۴

خدائے سبحان نے بھی سورہ اسراء میں پیغمبر اکرمؐ کو اسی عنوان سے یاد کیا ہے:

سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى الَّذِي بَارَكْنَا حَوْلَهُ لِنُرِيَهُ مِنْ آيَاتِنَا إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ۔ ترجمہ: پاک و پاکیزہ ہے وہ پروردگار جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا جس کے اطراف کو ہم نے بابرکت بنایا ہے تاکہ ہم اسے اپنی بعض نشانیاں دکھلائیں بیشک وہ پروردگار سب کی سننے والا اور سب کچھ دیکھنے والا ہے۔[1]

ابن فارس لفظ عبد کی اصل کے بارے میں لکھتے ہیں:

أصلان صحيحان و الاوّل يدلّ على لين و ذلّ والآخر على شدّة و غلظة۔

لفظ عبد کے دو اصل ہیں: ایک کا مطلب نرم اور خود کو چھوٹا کرنا ہے اور دوسرے کا مطلب شدّت وصلابت ہے۔[2]

پیغمبر اکرمؐ مقام بندگی نیز لوگوں کے حقوق کی رعایت کے سلسلہ میں بہت متواضع اور فروتن ہوا کرتے تھے۔اسی طرح حق کی پیروی کے موقع پر دشمنوں کے مقابلے میں سرسخت ہوا کرتے تھے اور کسی بھی طرح کا روحی اور روانی دباؤ ان پر اثرانداز نہیں ہوتا تھا۔

ب۔سیرت پیغمبر اسلامؐ صحیفہ سجادیہ کی روشنی میں

سیرہ نبویؐ کے مختلف زوایا ہیں لیکن امام سجادؑ کے کلام میں رسول اکرمؐ کی دو خاص اور تاثیر گزار سیرت دیکھنے کو ملتی ہے جن میں سے ایک آپ کی تبلیغی سیرت ہے اور دوسری آپ کی فوجی سیرت اور حکمت عملی۔

تبلیغی سیرت

امام سجادؑ نے مختلف مقامات پر پیغمبر اسلامؐ کی تبلیغی سیرت کے مختلف پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے جن کی ہم ایک ایک کرکے تجزیہ و تحلیل کریں گے۔

۱۔ سورہ اسراء، آیت ۱

۲۔ ابن فارس، احمد، معجم مقاییس اللغۃ، ذیل مادّۂ «عبد»

خلوص نیت اور مقدس ہدف: پیغمبر اکرمؐ اپنی رسالت اور اپنے ہدف پر یقین رکھتے تھے اور خدا کے احکام پر عمل کرنے کے دوران، آپ نے بہت سی مشکلات کو برداشت کیا۔ دین خدا کی تبلیغ میں آپ نے اعجاب انگیز استقامت کا مظاہرہ کیا۔ امام سجادؑ کے کلام کے مطابق آپ کا ہدف خدا کے دین کو اعزاز دلانا اور کفار کو حضرت حق کے مقابل میں مغلوب کرنا تھا۔

امام سجادؑ صحیفہ کی دوسری دعا میں پیغمبر اکرمؐ کے قیام کی تفصیل بیان کرتے ہوئے یہ بتاتے ہیں کہ کس طرح آپ نے حکم خدا کو انجام دینے کے لئے اپنے جسم کو معرض خطر میں ڈالا اور تبلیغ رسالت اور دعوت حق کی راہ میں مصائب برداشت کئے اور دیار غربت کی طرف ہجرت کی۔ امامؑ فرماتے ہیں:

وَ هَاجَرَ اِلى بِلادِ الغُربَةِ وَ مَحَلِّ النايِ عَن مَوطَنِ رَحلِهِ و مَوضِعِ رِجلِهِ وَ مَسقَطَ رَاسِهِ وَ مَانَسِ نَفسِهِ اِرادةً مِنهُ لِاعزازِ دِينِكَ وَ استِنصَاراً عَلي اَهلِ الكُفرِ بِكَ۔ ترجمہ: وطن سے ادھر ہجرت کی جو غربت کا شہر تھا اور اپنے کو ساز و سامان زندگی کی منزل سے دور رکھا اس جگہ سے دور جہاں پیر رکھے تھے اور جہاں دنیا میں آئے تھے اور جس جگہ سے نفس مانوس تھا۔ صرف اس لئے کہ وہ تیرے دین کا اعزاز چاہتے تھے اور اہل کفر کے مقابلہ کے لئے مددگاروں کی تلاش میں تھے۔

نصیحت اور خیر خواہی: امام سجادؑ نے صحیفہ سجادیہ کی مختلف دعاؤں میں پیغمبر اکرمؐ کی اس خصوصیت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ دوسری دعا میں آپ ارشاد فرماتے ہیں:

و شغلها بالنصح لاهل دعوتك۔ ترجمہ: اور اپنے نفس کو ان لوگوں کے پند و نصیحت کرنے میں مصروف رکھا جنہوں نے تیری دعوت کو قبول کیا۔

چھٹی دعا میں آپ ارشاد فرماتے ہیں:

و امرته بالنصح لامته فنصح لها ۔ ترجمہ: تو نے انہیں امت کو اپنا پیغام پہچانے اور پند و نصیحت کرنے کا حکم دیا تو انہوں نے نصیحت فرمائی۔

امامؑ بیالیسویں دعا میں ایک مقام پر فرماتے ہیں: و نصح لعبادك۔ ترجمہ: پیغمبر اکرمؐ نے خلوص کے ساتھ خدا کے بندوں کو پند و نصیحت فرمائی۔

دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے مخاطبین کبھی اہل دعوت، کبھی امت اور کبھی عباد کے الفظ سے تعبیر کئے گئے ہیں۔ ان الفاظ کے حقیقی معنی میں کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ خداسب کو سعادت کی طرف دعوت دیتا ہے۔ وَاللّٰهُ يَدْعُو إِلَىٰ دَارِ السَّلَامِ۔[1] اور آپ کی بعثت کے بعد سے روز قیامت تک سبھی افراد آپ کی امت (امت دعوت) شمار ہونگے۔ دنیا کے تمام لوگ خدا کے بندے ہیں اور پیغمبر اکرمؐ سب کو خالصانہ نصیحت فرماتے تھے اور ان کی بدسلوکیوں کو برداشت کرتے تھے۔

پیغام رسالت کا موضوع: پیغمبر اکرمؐ کی تبلیغ کا موضوع خدا کی رسالت، خدا کا حکم اور قرآن تھا۔ قرآن کا علم اور اعجاز پوری طرح سے آپ پر الہام ہوا تھا۔ امام سجادؑ بیالیسویں دعا (ختم قرآن کی دعا) میں فرماتے ہیں: و الهمته علم عجائبه مكملا ، بار الہا تو نے قرآن کے علم اور اس کے عجائب کو پوری طری سے اپنے حبیب کو القا فرمایا۔ اسی دعا میں امامؑ فرماتے ہیں: فصلّ على محمد الخطيب به ۔ ترجمہ: درود و سلام محمد پر جنہوں نے خطبہ پڑھا (اور لوگوں کو نصیحت فرمائی)۔

امام سجادؑ نے پیغمبر اسلامؐ کے لئے بہترین انعامات کی درخواست کرتے وقت بھی پیغام رسالت کے مواد کی طرف اشارہ فرماتے ہیں:

> اللّٰهُمَّ اجزِه بِمَا بَلَّغَ مِن رِسَالاتِكَ وَ اَدّي مِن اياتِكَ وَ نَصَحَ لِعِبَادِكَ وَ جَاهِدَ فِي سَبيلِكَ أفضَلَ مَا جَزَيتَ اَحَداً مِن مَّلائِكَتِكَ المُقَرّبينَ وَ أنبِيائِكَ المُرسِلينَ المُصطَفينَ۔ ترجمہ: خدایا! انہیں اپنے پیغامات کے پہنچانے، اپنی آیات کی تبلیغ کرنے اور اپنے بندوں کو نصیحت کرنے اور اپنی راہ میں جہاد کرنے کا وہ اجر عطا فرما جو ان تمام جزاؤں سے بالاتر ہو جو تو نے ملائکہ مقربین یا انبیا مرسلین مصطفین کو عطا فرمائی ہے۔[2]

دین کے حوالے سے لکھنے اور بولنے والوں کے لئے پیغمبر اکرمؐ کا طریقہ ایک دلچسپ سبق اور مناسب نمونہ کار ہے کہ وہ بھی اپنی تبلیغ اور پیغام کو پہچانے کے لئے قرآن کو اپنا معیار قرار دیں۔

۱۔ سورہ یونس، آیت ۲۵

۲۔ صحیفہ سجادیہ، دعا نمبر ۴۲، بند ۲۲

تبلیغ کرنے کا طریقہ: اللہ تعالی نے جس طرح سے پیغمبر اکرمؐ کو حکم دیا تھا، آپ نے اسی طرح سے پیام الہی کو روشن و واضح طریقے سے لوگوں تک پہنچایا:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ ۔ ترجمہ: پس آپ اس بات کا واضح اعلان کردیں جس کا حکم دیا گیا ہے اور مشرکین سے کنارہ کش ہو جائیں۔[1]

امام سجادؑ بیالیسویں دعا میں اس روش کی طرف اس طرح سے اشارہ فرماتے ہیں: صدع بأمرك ۔

مشکلات کا سامنا اور ان کو برداشت کرنا: صحیفہ سجادیہ کی دوسری دعا جو کہ رسول اکرمؐ پر صلوات کے لئے مخصوص ہے، اس میں امام سجادؑ آپ کی سیرت کے ایک اور پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وَعَرَّضَ فِيكَ لِلمَكروهِ بَدَنَهُ ...وَ اَدابَ نَفسَهُ فِي تَبليغِ رِسالَتِكَ وَ اَتعَبَهَا بِالدُّعَاءِ اِلي مِلَّتِكَ۔ ترجمہ: اور تیری راہ میں اپنے جسم کو ہر طرح کے آزار کا نشانہ بنایا... اور تیرے پیغام کو پہنچانے کے لیے تکلیفیں اٹھائیں اور دین کی طرف دعوت دینے کے سلسلہ میں زحمتیں برداشت کیں۔

شجاعت اور شہامت: دین خدا کی تبلیغ کے سلسلہ میں پیغمبر اکرمؐ کی ایک اہم خصوصیت آپ کا شجاع اور با شہامت ہونا ہے۔ آپ اپنے قبیلہ اور قوم میں موجود دشمنوں سے بھی شجاعت کے ساتھ پیش آتے تھے اور ہم سب جانتے ہیں کہ قبیلہ والوں سے رشتہ بگاڑنا اور ان کے جاہلانہ راہ و رسم سے مقابلہ کرنا کس قدر مشکل کام ہے جس کے لئے خاص شہامت و شجاعت کی ضرورت ہے۔

امام سجادؑ دوسری دعا میں مختلف مقامات پر اس خصوصیت کی طرف اشارہ فرماتے ہیں:

وَكَاشَفَ فِي الدُّعاءِ اِلَيكَ حَامَّتَهُ وَ حَارَبَ فِي رِضَاكَ اُسرَتَهُ وَ قَطَعَ فِي اِحياءِ دِينِكَ رَحِمَهُ وَ اَقصَي الاَدنَينَ عَلَي جُحُودِهِم وَ قَرَّبَ الاَقصَينَ عَلي استِجَابَتِهِم لَكَ۔ ترجمہ: لوگوں کو تیری طرف دعوت دینے میں اپنے عزیزوں سے بھی مقابلہ کیا، اور تیری رضا کے لئے اپنے قوم قبیلے سے جنگ کی اور تیرے دین کو زندہ کرنے کے لئے سب

۱۔ سورہ حجر، آیت ۹۴

رشتے ناطے قطع کر لئے۔ نزدیک کے رشتہ داروں کو انکار حق کی وجہ سے دور کر دیا اور دور والوں کو اقرار کی وجہ سے قریب کیا۔ اور تیری وجہ سے دور والوں سے دوستی اور نزدیک والوں سے دشمنی رکھی۔

ہجرت کو قبول کرنا: اپنے وطن اور جائے ولادت کو چھوڑ کر کسی پرائے شہر کو کوچ کرنا اور غربت کو برداشت کرنا بہت دشوار امر ہے۔ پیغمبر اکرمؐ نے مکہ سے اپنے گہرے لگاؤ کے باوجود وہاں سے کوچ فرمایا تا کہ دین الٰہی کو اعزاز دلا سکیں اور لوگوں تک خدا کا پیغام پہنچانے کے لئے ایک مناسب جگہ حاصل کریں۔ آپ نے کچھ دنوں کے لئے طائف کی طرف کوچ کیا اور اس کے بعد یثرب کی طرف دائمی ہجرت فرمائی جو کہ تاریخ اسلام میں مدینہ النبی (نبی کا شہر) کے نام سے جانا جاتا ہے:

وَ هَاجَرَ اِلي بِلادِ الغُربَةِ وَ مَحَلِّ النَأيِ عَن مَّوطِنِ رَحلِهَ وَ مَوضِعِ رِجلِه وَ مَسقَطِ رَأسِهِ وَ مَأنَسِ نَفسِهِ۔ ترجمہ: وطن سے ادھر ہجرت کی جو غربت کا شہر تھا اور اپنے کو ساز و سامان زندگی کی منزل سے دور رکھا اس جگہ سے دور رکھا جہاں پیر رکھے تھے اور جہاں دنیا میں آئے تھے اور جس جگہ سے نفس مانوس تھا۔[1]

ج۔ پیغمبر اکرمؐ کی جنگی سیرت اور آپ کی فوجی حکمت عملی

عام طور سے پیغمبر اکرمؐ کی سیرت کے سلسلے میں تحقیق و تحلیل کرنے والوں نے آپ کے فردی اخلاق و سیرت کے بارے میں گفتگو کی ہے، جیسے کہ آپ کے لباس پہننے، کھانا کھانے اور بیٹھنے کا طریقہ، عبادت کرنے کا انداز، عورتوں، بچوں اور غلاموں سے پیش آنے کا انداز، آپ کی عفو و بخشش وغیرہ۔ مختصر ایہ کہ سب نے آپ کی تبلیغی اور اجتماعی سیرت کے سلسلے میں بات کی ہے لیکن پیغمبر اکرم کی جنگی سیرت اور آپ کی فوجی تدابیر کے سلسلے میں کمتر گفتگو ہوئی ہے اور سیرت نبوی کے بعض پہلوؤں کی تحلیل سے لوگ ابھی بھی غافل ہیں۔ ایسے میں امام سجادؑ کے کلام میں پیغمبر اکرمؐ کی سیرت کے اس پہلو پر خاص توجہ دی گئی ہے۔

۱۔ صحیفہ سجادیہ، دعا نمبر ۲، بند ۱۶

غیبی امداد پر بھروسہ اور ظاہری کمزوری کی طرف توجہ: امام سجادؑ صحیفہ کی دوسری دعا میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ بظاہر تو پیغمبر اکرمؐ عدّہ اور عُدّہ کے لحاظ سے ناتوان اور ضعیف تھے لیکن آپؐ نے خدا سے مدد اور فتح کی درخواست فرما کر اور اس سے طاقت کی التجا کر کے اپنی کمزوری کو اپنی طاقت میں تبدیل کر دیا. آپؐ خدا کی حمایت اور اس کی غیبی امداد پر بھروسہ کرتے ہوئے جنگ کے میدان میں ہدف کی طرف اپنی راہ کا آغاز فرمایا۔ امام سجادؑ فرماتے ہیں:

فنهد اليهم مستفتحا بعونك و متقويا علي ضعفه بنصرك۔ ترجمہ: وہ تیری نصرت سے فتح وکامرانی چاہتے ہوئے اور اپنی کمزوری کے باوجود تیری مدد کی پشت پناہی پر دشمنوں کے مقابلہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔[1]

پیغمبر اکرمؐ کی تہاجمی حکمت عملی: دشمنان اسلام کو روحی اور نفسیاتی لحاظ سے کمزور کرنے، توحید کے راستے میں آنے والے کانٹوں کو ہٹانے اور عالم بشریت کو ہر قسم کے بتوں سے آزادی دلانے کے لئے پیغمبر اکرمؐ نے دشمنوں پر حملہ کرنے اور ان پر چڑھائی کرنے کی حکمت عملی سے کام لیا۔ یہ بھی آپ کی ان برجستہ سیرتوں میں سے ہے جس کی طرف امام سجادؑ نے صراحت کے ساتھ اشارہ فرمایا ہے:

فَغَزاهُمَ فِي عُقرِ دِيَارِهِم وَ هَجَمَ عَلَيهِم فِي بُحبُوحَةِ قَرارِهِم۔ ترجمہ: اور پھر دشمنوں سے ان کے گھر کے اندر جنگ کی اور ان کے ٹھکانوں کے بیچوں بیچ پر حملہ کر دیا۔[2]

مکتب رسالتؐ کے سب سے بڑے شاگرد مولائے متقیان علیؑ کو ۳۸ ہجری میں جب شہر انبار پر معاویہ کی فوج کے حملے کی خبر ملی اور آپ نے کوفہ والوں کی سستی دیکھی تو آپ نے جہاد کی فضیلت کے سلسلہ میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

فَوَاللّه مَا غُزِيَ قَوْمٌ قَطُّ فِي عُقْرِ دَارِهِمْ إِلَّا ذَلُّوا۔ ترجمہ: خدا کی قسم جس قوم سے اس کے گھر کے اندر جنگ کی جاتی ہے اس کا حصہ ذلت کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا ہے۔[3]

۱۔ صحیفہ سجادیہ، دعا نمبر ۲
۲۔ ایضاً، دعا ۲، بند ۲۰
۳۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۲۷

مولائے کائناتؑ کے استاد پیغمبر اکرمؐ بخوبی اس حکمت سے آگاہ تھے۔ مدینہ میں اسلامی حکومت برپا کرنے اور بدر، احد اور احزاب کی جنگوں میں مجاہدین اسلام کے زبردست دفاعی کارناموں کے بعد پیغمبر اکرمؐ نے دشمنوں پر حملہ کرنے اور ان کے ٹھکانوں پر یلغار کرنے کو اپنا شیوہ بنایا۔ اپنے دس سالہ دور حکومت میں پیغمبر اکرمؐ کی آدھی جنگیں تہاجمی شکل میں تھیں۔ پانچویں ہجری میں جنگ خندق میں غیبی امداد اور مولائے کائناتؑ کی فداکاریوں اور آپ کے ہاتھوں عمرو بن عبدود کے قتل کے بعد مسلمانوں کو فتح حاصل ہونے سے لیکر چھٹیں ہجری تک پیغمبر اکرمؐ نے تقریباً ۲۵ جنگی ٹولیوں کو دشمن کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا۔

پیغمبر اکرمؐ، فاتح میدان کارزار اور اہداف عالیہ میں کامران: امام سجادؑ پیغمبر اکرمؐ کی تبلیغی سیرت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آپ نے دین خدا کو اعزاز دلانے اور کفر پر فتح حاصل کرنے اور ان چیزوں کو محقق کرانے میں جو آپ دشمنان اسلام کے لئے چاہتے تھے، کس طرح تدابیر انجام دیں۔ آپ نے اپنے چاہنے والوں کو بلند مقاصد تک پہنچانے کے لئے ہجرت جیسی دشواریوں کو برداشت کیا۔ اس کے بعد امامؑ ارشاد فرماتے ہیں:

حَتّٰی استَتَبَّ لَهُ مَا حَاوَلَ فِی اعدائِكَ وَ استَتَمَّ لَهُ مَا دَبَّرَ فِی اَولِیائِكَ۔

ترجمہ: یہاں تک کہ انہوں نے جو کچھ تیرے دشمنوں کے بارے میں چاہا تھا وہ بھی مکمل ہو گیا اور جو تدبیر تیرے دوستوں کے بارے میں کی تھی وہ بھی منزل اتمام کو پہنچ گئی [1]۔

اسی دعا میں ایک دوسرے مقام پر امام سجادؑ، پیغمبر اکرمؐ کی جنگی سیرت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرماتے ہیں:

حَتّٰی ظَهَرَ اَمرُكَ وَ عَلَت كَلِمَتُكَ وَ لَو كَرِهَ المُشرِكُونَ۔ ترجمہ: یہاں تک کہ تیرا دین (شریعت) غالب اور تیرا کلمہ بلند ہو کر رہا۔ اگرچہ مشرکین اسے ناپسند کرتے رہے۔

جی ہاں اور کہنا ہوگا کہ خدائے کریم ایسا نہیں ہے جو اپنے پیغمبر کو اکیلا اور تنہا چھوڑ دے، جیسا کہ اس نے خود فرمایا:

۱۔ صحیفہ سجادیہ، دعا نمبر ۲، بند ۱۷

هُوَ الَّذِی أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِینِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهُ عَلَی الدِّینِ کُلِّهِ وَلَوْ کَرِهَ الْمُشْرِکُونَ ۔ ترجمہ: وہ خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اپنے دین کو تمام ادیان پر غالب بنائے چاہے مشرکین کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو ۔[1]

اس مقالہ میں مؤلف کی کوشش رہی ہے کہ امام سجادؑ کے اقوال کی بنیاد پر رسول اکرمؐ کی سیرت پر روشنی ڈالے۔ مؤلف کی کوشش تھی کہ امام سجادؑ کے نزدیک آپؐ کے رفیع ترین مقام، اور اسی طرح لوگوں کو خوبصورتی اور مہربانی کے اس مثالی نمونہ کی طرف متوجہ کرے۔ امام سجادؑ نے اس مہم کو پیغمبر اکرمؐ پر مسلسل درود و سلام کے نثار کرنے سے آغاز کیا، اور پھر آپؐ کو امام رحمت، وحی کے امانت دار، خدا کے آخری پیغمبر اور حق کی بندگی کے اعزاز سے آراستہ جیسے عنوانوں سے یاد فرمایا ہے۔

منابع و مآخذ

- قرآن کریم، ترجمہ الٰہی قمشہ ای
- نہج البلاغہ، ترجمہ محمد دشتی، بہ نشر، مشہد، ۱۳۸۳
- صحیفہ سجادیہ، ترجمہ فیض الاسلام، تہران، ۱۳۷۵
- آیتی، محمد ابراہیم، تاریخ پیامبر اسلام محمد، انتشارات دانشگاہ تہران، ۱۳۶۹
- ابن فارس، احمد معجم مقاییس اللغہ، تحقیق عبد السلام ہارون، مکتب الاعلام الاسلامی، قم، ۱۴۰۵ق
- حسینی مدنی، سید علی خان، ریاض السالکین، مؤسسہ النشر الاسلامی، قم، ۱۴۲۵ق
- حکیمی، محمد رضا، امام در عینیت جامعہ، فجر، تہران، ۱۳۵۶
- راغب اصفہانی، حسین بن محمد، مفردات، دفتر نشر کتاب، تہران، ۱۴۰۴ق
- زمخشری، جار اللہ محمود بن عمر، اساس الابلغہ، تحقیق عبد الرحیم محمود، مکتب الاعلام الاسلامی، قم
- شیخ صدوق، محمد بن علی بن حسین بن موسیٰ بن بابویہ قمی، معانی الاخبار، تصحیح علی اکبر غفاری، مؤسسہ النشر الاسلامی، قم، ۱۳۶۱
- طباطبائی، سید محمد حسین، المیزان، اسماعیلیان، قم، ۱۳۹۳ق

۱۔ سورہ توبہ، آیت ۳۳

- طوسی، محمد بن حسن، اختیار معرفۃ الرجال، تحقیق سید مہدی رجایی، مؤسسہ آل البیتؑ، قم، ۱۴۰۴ق
- کلینی، محمد بن یعقوب، اصول الکافی، تصحیح محمد جعفر شمس الدین، دار المعارف، بیروت، ۱۴۱۱ق
- گروہی از نویسندگان، محمد خاتم پیامبران، حسینیہ ارشاد المعارف، تہران، ۱۳۴۷
- مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار، دار الکتب الاسلامیہ، تہران
- مطہری، مرتضی، ختم نبوت، انتشارات طوس، مشہد، ۱۳۵۴
- معین، محمد، فرہنگ فارسی، امیر کبیر، تہران، ۱۳۷۴

قیام امام حسینؑ کے اہداف و محرکات

مؤلف: بابک ہادیان حیدری
مترجم: شبیہ عباس خان

امام حسینؑ کے قیام کے اہداف و محرکات کے سلسلے میں تجزیہ نگاروں نے مختلف تفسیریں پیش کی ہیں لیکن ان میں سے بعض تحلیلیں جو زیادہ تر لامنس اور اس کے جیسے دوسرے دین اسلام کے جوہر و حقیقت سے ناواقف مستشرقین نے پیش کی ہیں، پوری طرح سے حقیقت سے دور اور امامؑ کی مقدس شخصیت کے برخلاف ہیں، کیونکہ ان لوگوں نے امامؑ کے اہداف کو مادی اور وہ بھی حصول خلافت بتایا ہے جب کہ آپ صرف خدا کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس مقالہ میں اعتقادی مبانی کے پیش نظر اور امامؑ کے کلام کی مدد سے قیام عاشورہ کے اہداف و محرکات کی تحلیل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس تحقیق کے نتائج سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام حسینؑ کے قیام کے سبھی اہداف، دین و سنت کو زندہ کرنے سے لیکر، امت کی اصلاح (امر بہ معروف و نہی از منکر کو زندہ کرنا) اور اہل کوفہ کے خطوط، صرف لوگوں پر حکومت کرنے اور خلافت کے لئے نہیں تھے بلکہ آپ کا ہدف صرف اور صرف خدا کی خوشنودی تھی۔ اسی لئے آپ نے ظالم کی حکومت کو ماننے سے انکار کیا اور قیام فرمایا کیونکہ آپ جانتے تھے کہ آپ کا یہ قیام اور بھی بڑے انقلاب کے لئے راہ گشا ہوگا۔

عاشورہ وہ عظیم کارنامہ ہے جو اپنے ہی دور میں ایک انقلاب کی شکل میں ظاہر ہوا اور پھر اس کے بعد ایسے غم انگیز واقعہ میں تبدیل ہو گیا جس میں ماتم اور آنسو بہائے جانے لگے۔ اگرچہ حال کی صدیوں میں خاص کر ایران میں اسلامی انقلاب کے بعد ایک بار پھر عاشورہ اپنی اصلی شکل میں ظاہر ہو رہا ہے اور اب لوگ صرف امام حسینؑ کے لئے آنسو بہانے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ آپ کے قیام کی حماسی روح کو بھی سراہتے ہیں۔ ایران کا اسلامی انقلاب امام حسینؑ کے قیام کو اپنا نمونہ بناتے ہوئے، ظالموں کے مقابلے میں کھڑا ہوا ہے۔

تاریخ خود اس حقیقت کی بخوبی گواہ ہے کہ اسلامی سرزمین پر بنی امیہ کا دور حکومت اس خاندان کے ظلم و جور کی علامت ہے۔ جب امام حسینؑ کو پتہ چلا کہ بنی امیہ کا اصل مقصد، رسول اللہؐ کے نام کو مٹانا ہے تو آپ نے قیام کیا۔ یہ وہ دور تھا جب تبعیض، ظلم اور ناانصافی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور شیعیان اہل بیتؑ کو آزار واذیت دی جارہی تھی۔

بلاشک کربلا کا قیام جسے امام حسینؑ اور آپ کے اصحاب نے اپنے خون سے سینچا ہے، ایک معمولی بات نہیں ہے، کیونکہ آپ انسان کامل کا ایک نمونہ ہیں جس نے بغیر کسی مقصد کے ہرگز اس میدان میں قدم نہیں رکھا ہے، لہٰذا امام حسینؑ، آپ کے اصحاب باوفا اور ساتھ ہی آپ کا مطہر گھرانہ کچھ اہداف و مقاصد کے پیش نظر میدان کربلا میں حاضر ہوئے اور یہ اہداف مادیات سے بڑھ کر تھے، بلکہ الٰہی اہداف تھے۔ اسی لئے امام حسینؑ اور آپ کے اصحاب کے قیام کو اس آیہ کریمہ کا مصداق بتایا جاسکتا ہے:

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ثَوَابًا مِّنْ عِندِ اللَّهِ وَاللَّهُ عِندَهُ حُسْنُ الثَّوَابِ۔ ترجمہ: پس خدا نے ان کی دعا کو قبول کیا کہ میں تم میں سے کسی بھی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔ تم میں بعض بعض سے ہیں۔ پس جن لوگوں نے ہجرت کی اور اپنے وطن سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے اور انہوں نے جہاد کیا اور قتل ہوگئے تو میں ان کی برائیوں کی پردہ پوشی کروں گا اور انہیں ان جنتوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ یہ خدا کی طرف سے ثواب ہے اور اس کے پاس بہترین ثواب ہے۔[1]

اسی طرح دیگر آیات میں بھی یہی بات آئی ہے جو آپ اور آپ کے اصحاب کا مصداق ہو سکتی ہے:

لَّا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِينَ دَرَجَةً وَكُلًّا

۱۔ سورہ آل عمران، آیت ۱۹۵

وَعَدَ اللَّـهُ الْحُسْنَىٰ ۚ وَفَضَّلَ اللَّـهُ الْمُجَاهِدِينَ عَلَى الْقَاعِدِينَ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿۹۵﴾ دَرَجَاتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَرَحْمَةً ۚ وَكَانَ اللَّـهُ غَفُورًا رَّحِيمًا۔ ترجمہ: اندھے بیمار اور معذور افراد کے علاوہ گھر بیٹھ رہنے والے صاحبانِ ایمان ہر گز ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جو راہِ خدا میں اپنے جان و مال سے جہاد کرنے والے ہیں۔ اللہ نے اپنے مال اور جان سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر امتیاز عنایت کئے ہیں اور ہر ایک سے نیکی کا وعدہ کیا ہے اور مجاہدین کو بیٹھ رہنے والوں کے مقابلہ میں اجر عظیم عطا کیا ہے۔[1]

جب اسلام خطرے میں ہو اور ظالموں و مشرکوں پر قابو پا ناممکن ہو تو ایسے میں سبھی مسلمانوں پر واجب ہے کہ اپنی جان، مال اور اولاد کو اسلامی معاشرے کی اصلاح کے لئے قربان کر دیں۔ تاریخ اسلام خود امام حسینؑ اور آپ کے اصحاب کی مخلصانہ کوششوں کی گواہ ہے جو آپ نے اسلام کے حق میں کی تھیں لیکن اس موضوع میں جو چیز سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے وہ ہے قیام کے اہداف و محرکات

اس موضوع بہت ساری کتابیں تحریر کی گئی ہیں جن میں سے کچھ کے نام اس طرح ہیں:

- ❖ دانشنامہ امام حسینؑ بر پایہ قرآن، حدیث و تاریخ (۱۳ جلد)، محمد محمدی ری شہری
- ❖ حماسہ حسینی (دو جلد)، مرتضی مطہری
- ❖ موسوعۃ الامام الحسینؑ،
- ❖ امام ناشناختہ حسین بن علی، جلال الدین فارسی
- ❖ شہادت نامہ امام حسینؑ، محمد محمدی ری شہری
- ❖ عاشورا حماسہ جاودان، محمد شفیعی مازندرانی
- ❖ قرآن و امام حسینؑ امام حسینؑ و قرآن، محمد علی رضایی اصفہانی

لیکن ان مقالات اور کتب میں اس موضوع کے کچھ ہی حصوں کی تحلیل و بررسی ہوئی ہے کیونکہ پہلے توانہوں نے ایک ہی مقالے میں کئی موضوعات کی تحلیل کی ہے، دوسرے یہ کہ ایک ہی زاویہ سے امامؑ کے

۱۔ سورہ آل عمران، آیت ۹۵-۹۶

قیام کے آثار و نتائج کی بررسی کی ہے لیکن مقالہ ہذا میں کوشش کی گئی ہے کہ اس موضوع کو تاریخی شواہد اور امامؑ کے کلمات و خطبات کی روشنی میں تجزیہ کیا جائے۔

دین اور سنت کو زندہ رکھنا، قیام عاشورہ کا اصلی مقصد:

امام حسینؑ اور آپ کے اصحاب باوفا کا قیام مقدس اہداف کے لئے تھا، کیونکہ ایسا ممکن نہیں ہے کہ امام بزرگوار بنا کسی دلیل کے اپنی جان فدا کر دیں۔ ہم کو اس بات پر یقین ہونا چاہئے کہ امام حسینؑ اور آپ کے اصحاب جن اہداف کو حاصل کرنا چاہتے تھے وہ اس دنیا کے مادی تمنیات سے بڑھ کر تھے کیونکہ اگر مادیات ہی ہدف ہوتا تو آپ ہر گز اپنی جان قربان نہ کرتے لیکن در حقیقت امام عالی مقام کا ہدف دین و سنت کو زندہ رکھنا تھا کیونکہ دین کے ذریعہ سے ہی تمام انسان ابدی سعادت تک پہنچ سکتے ہیں۔ دین کی اہمیت کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے کہ اس کی نجات کی خاطر امام حسینؑ جیسی والا شخصیت نے اپنی جان اقدس کو پیش کر دیا۔ امام خمینیؒ اس بارے میں بہت اچھا جملہ فرماتے ہیں:-

"اسلام اس قدر عزیز ہے کہ نواسۂ رسول نے اس کے لئے اپنی جان قربان کر دی۔ امام حسینؑ نے اپنے جوانوں اور اپنے اصحاب کے ساتھ مل کر اسلام کے لئے جنگ فرمائی اور اپنی جانیں قربان کر دیں اور اسلام کو زندہ کیا۔"[1]

لیکن جب تک معاویہ زندہ تھا، امامؑ نے قیام نہیں کیا اور دوسرے لوگوں کو بھی اس کی اجازت نہیں دی کیونکہ معاویہ نے بہت ہی فریب کاری سے دین کے ظاہر کو باقی رکھا تھا، اسی لئے امامؑ نے محمد بن بشر ہمدانی اور سفیان بن لیلیٰ ہمدانی کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

لیکن کلُّ امری مِنکم حِلساً مِن احلاسِ بَیتِهِ مادامَ هذَا الرَّجُلُ (ای مُعاوِیهُ) حَیا فَإن یَهلِكَ و انتم اَحیاءٌ، رَجونا ان یَخیرَ اللهُ لَنا و یُوتینا رُشدَنا و لایکلَنا الی انفُسِناف، إنَّ اللهَ مَعَ الَّذینَ اتَّقوا وَ الَّذینَ هُم مُحسنونَ (سورہ نحل، ۱۲۸)۔

ترجمہ: جب تک یہ شخص (معاویہ) زندہ ہے تم سب اپنے گھروں میں بیٹھو، اور اگر اس کے ہلاک ہو جانے کے بعد تک تم زندہ رہے تو جو بہتر ہوگا خدا ہمارے لئے وہی چنے گا اور ہم کو ہمارے

۱۔ موسوی، خمینی، صحیفہ امام، جلد ۸، ص ۱۵۱

راستے پر آگے بڑھائے گا اور اپنے حال پر نہیں چھوڑے گا، بے شک خدا متقین کے ساتھ اور محسنین کے ساتھ ہے۔[۱]

جب معاویہ کی موت کے بعد اس کا بیٹا یزید ناحق طریقے سے خلیفہ بنا تو وہ اپنے باپ کے بر خلاف ہر طرح کے گناہ، فسق اور فجور کو انجام دیتا تھا اور تاریخ گواہ ہے کہ اس دور میں کیسی کیسی بدعتیں دین میں داخل ہوئیں۔ اسی لئے جب امام حسینؑ نے دیکھا کہ خدا کا دین دھیرے دھیرے زوال کی طرف جارہا ہے اور اس کو مٹانے کی کوشش ہو رہی ہے تو آپ بصرہ کے بزرگوں کو اس طرح خط لکھتے ہیں:

اِنَّ السُنَّةَ قَد امیتَت و اِنَّ البِدعةَ قَد احییت و نُعِشَت۔ ترجمہ: سنت مر گئی ہے اور بدعت زندہ ہوئی ہے اور بدعت کو بڑھاوا دیا جارہا ہے۔[۲]

یہاں تک کہ امام حسینؑ نے روز عاشور عمر بن سعد کے لشکر کے سامنے اپنے قیام کے ہدف کو دین و سنت کو زندہ کرنا بتایا جو بنی امیہ کے دور میں ختم کر دی گئی تھیں:

لاتَعجَلوا حَتّی اخبِرَکُم خَبری وَاللهِ ما اَتَیتُکُم حَتّی اَتَتنی کُتب اماثِلِکُم بِاَنَّ السُنَّةَ قَد امیتَت وَ النِّفاقَ قَد نَجَمَ وَ الحُدودَ قَد عُطِّلَت، فَاقدَمَ لَعَلَّ اللهَ تَبارَکَ وَ تَعالی یصلِحُ بِکَ امَّةَ محمد فَاَتیتُکُم فِاذا کَرِهتُم ذلِکَ ، فَاَنا راجُعٌ عَنکم وَارجِعوا اِلی اَنفُسِکُم فَانظُروا هَل یصلُحُ لَکم قَتلی۔اَو یحِلُّ لَکُم دَمی؟اَلَستُ ابنَ بِنتِ نَبیکم وَ ابنَ ابنِ عَمِّهِ وَ ابنَ اوَّلِ المُؤمِنینَ ایماناً؟اَوَلَیسَ حَمزَةُ وَ العَبّاسُ وَ جَعفَرٌ عُمومَتی؟ اَوَلَم یبلُغُکم قَولُ رَسول الله فِی اَخی وَلِسَیدا شَبابِ اهلِ الجَنَّةِ۔ ترجمہ: جلدی نہ کرو کہ میں تم کو اپنی خبر سے باخبر کرتا ہوں۔ خدا کی قسم میں یہاں نہ آتا اگر تمہارے بزرگوں کے خط مجھ تک نہ پہنچتے کہ سنت مر چکی ہے اور نفاق نے سر اٹھار کھا ہے اور حدود الٰہی ختم ہو چکے ہیں، آگے بڑھو ہو سکتا ہے خدائے

۱۔ لجنتہ الحدیث فی معہد باقر العلوم، ص ۲۵۲؛ ابن جابر البلاذری، احمد بن یحیٰ، انساب الاشراف، جلد ۲، ص ۱۵۱؛ میلانی، سید محمد ہادی، قادتنا کیف نعرفھم، جلد ۳، ص ۴۸۸

۲۔ انساب الاشراف، جلد ۲، صفحہ ۷۸

متعال تمہارے ذریعہ امت محمدی کی اصلاح کرنا چاہتا ہو۔ میں اسی لئے یہاں آیا ہوں اور اگر میرا آنا تمہیں نہیں پسند تو لوٹ جاؤں گا اور تم لوگ بھی جاگ جاؤ اور دیکھو کیا میری جان لینا تمہارے حق میں ہے؟ کیا میرا خون تم پر روا ہے؟ کیا میں تمہارے نبی کی بیٹی کا بیٹا اور نبی کے چچا زاد اور سب سے پہلے مؤمن کا بیٹا نہیں ہوں؟ کیا ہمزہ، عباس اور جعفر میرے چچا نہیں ہیں؟ کیا تم تک نبی کی یہ حدیث نہیں پہنچی کہ جس میں نبی نے میرے اور میرے بھائی کے بارے میں فرمایا۔ یہ دو (حسن و حسین) جنت کے جوانوں کے سردار ہیں۔[1]

امام حسینؑ نے بصرہ میں اپنے چاہنے والوں کے نام ایک خط لکھا اور اس کو سلمان نام کے ایک صحابی سے بھجوایا۔ اس خط میں امام تحریر فرماتے ہیں:

بسم الله الرحمٰن الرحیم، مِنَ الحُسینِ بن عَلی اِلی مالِك بن مِسمَع وَالأحنَفِ بن قَیسٍ وَ المُنذِرِ بن الجارودِ وَ مَسعودِ بن عَمرٍ و قَیسِ بن الهَیثَمِ ، سلامٌ عَلیکم، اَمّا بَعدُ فَاِنّی اَدعوکم اِلی اِحیاءِ مَعالِمِ الحقِّ و اِماتَةِ البِدَعِ، فَاِن تُجیبوا تَهتَدوا سُبُلَ الرِشاد، و السلام۔ ترجمہ: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، حسین بن علی سے مالک بن مسمع، احنف بن قیس، منذر بن جارود، مسعود بن عمر اور قیس بن ہیثم کے نام۔ سلام علیکم، امابعد، میں تم لوگوں کو حق کی نشانیوں کو زندہ کرنے اور بدعتوں کو ختم کرنے کے لئے پکارتا ہوں، اگر میری آواز پر لبیک کہوگے تو راہ راست کی طرف ہدایت پاؤگے۔ والسلام۔[2]

لہٰذا بخوبی واضح ہے کہ امام حسینؑ کے قیام ایک مقصد، دین خدا اور سنت رسول خداؐ کو زندہ رکھنا اور رائج بدعتوں کو پوری طرح سے ختم کرنا تھا۔ اگرچہ آپ اور آپ کے اصحاب کو شہید کر دیا گیا لیکن آپ کی شہادت نے خاموش شعلوں کو پھر سے روشن کیا جس کا نتیجہ توابین اور مختار ثقفی کے قیام میں نظر آیا۔

۱۔ ابن عساکر، علی بن حسن، ترجمہ الامام الحسین، ص ۳۱۲؛ انساب الاشراف، ص ۳۲۵

۲۔ احمدی میانجی، علی، مکاتیب الرسول، جلد ۱، ص ۳۹۵؛ ابن قتیبہ، الدینوری، الاخبار الطوال، ص ۲۳۱

دین خدا کی نصرت کے لئے مسلح قیام:

امام حسینؑ نے دین خدا کو زندہ رکھنے کے لئے نہ صرف اپنے الفاظ اور خطبوں سے کوشش فرمائی بلکہ اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر تلوار سے ان کے خلاف جنگ کی تا کہ خدا کا دین جو بنی امیہ کے دور میں صاحب منصبوں کے ہاتھ کا کھلونا بن گیا تھا پھر سے زندہ ہو جائے۔ اس دور میں معاویہ نے اپنے سیاسی اہداف کے پیش نظر جعل حدیث کا حکم دیا۔ اس دور میں دین مال و شہرت حاصل کرنے کا ایک ذریعہ بن گیا تھا، اور بعض تو دین کو دولت اور سیاسی طاقت کا ذریعہ بنا چکے تھے یا یوں کہا جائے کہ اس دور میں دین کی صورت پوری طرح سے مسخ ہو چکی تھی لیکن امام حسینؑ نے بنی امیہ سے مقابلہ کرکے اور اپنے قیام کے ذریعہ دین خدا کو عزت بخشنے کی کوشش فرمائی اور اس کام کو اپنی مبارک جان دے کر پورا کیا۔ امام حسینؑ نے فرزدق شاعر کو اپنے قیام کے مقصد کے بارے میں اس طرح بتایا ہے:

قالَ الامام الحسین علیہ السلام لِلفَرَزدَق الشاعِرِ: یا فَرَزدَق اِنَّ هولاءِ قَومٌ لَزَموا طاعَةَ الشَّیطانِ وَ تَرَکوا طاعَةَ الرَّحمنِ وَ اظهَرُوا الفَسادَ فِی الاَرضِ و ابطَلُوا الحُدودَ وَ شَرِبوا الخُمورَ وَ استَاثَروا فی اَموالِ الفُقراءِ وَ المَساکینِ و اَنا اولی مَن قامَ بِنُصرَةِ دینِ اللهِ وَاِعزازِ شَرعِهِ وَ الجِهادِ فی سَبیلِهِ، لَتَکونَ کَلِمَةُ اللهِ هِیَ الْعُلْیا۔ ترجمہ: امام حسینؑ نے فرزدق کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: اے فرزدق، اس قوم نے شیطان کی اطاعت کو اپنا لیا ہے اور خدائے رحمان کی اطاعت کو ترک کر دیا ہے۔ اس قوم نے زمین پر فساد برپا کیا اور حدود الٰہی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے شراب بھی پیتے ہیں اور فقیروں اور کمزوروں کے اموال کو بھی ہڑپ رہے ہیں۔ دین خدا کی مدد کرنے اور اس کی کھوئی ہوئی عزت کو لوٹانے کے لئے میں سب زیادہ سزاوار ہوں اور اس راہ میں جہاد کروں گا تا کہ خدا کا حکم اعلی ہو۔[1]

اسی طرح تاریخ طبری میں ابو عثمان نہدی سے منقول ہے کہ امام حسینؑ نے بصرہ کی فوج کے عہدہ داروں اور وہاں کے بزرگوں جیسے کہ مالک بن مسمع بکری، احنف بن قیس، منذر بن جارود، مسعود بن

۱۔ لجنۃ الحدیث فی معہد باقر العلوم، ص ۴۰۸

عمرو، قیس بن ہیثم اور عمرو بن عبداللہ معمر کے نام ایک خط لکھا اور اس کو سلیمان نام کے ایک شخص کے ذریعے ان تک پہنچایا۔ اس خط کا متن اس طرح ہے:

اَمّا بعدُ فَاِنَّ اللہَ اصطَفی محمّداً عَلی خَلقِہِ و اَکرَمَہُ بِنُبُوَّتِہِ وَ اختارَہُ لِرِسالَتِہِ، ثُمَّ قَبَضَہُ اللہُ اِلَیہِ وَ قَد نَصَحَ لِعِبادِہِ وَ بَلَّغَ ما اَرسِلَ بِہِ وَ کُنّا اَھلَہُ و اولیاءُہُ وَ اوصیاءُہُ وَرَثَتَہُ وَ اَحَقَّ النّاسِ بِمَقامِہِ فِی النّاسِ۔ فَاستأثَرَ عَلَینا قَومُنا بِذٰلِکَ فَرضینا وَکرِھنَا الفُرقَۃَ وَاَحبَبنا العَافیۃَ وَنَحنُ نَعلَم اَنَّا اَحَقُّ بِذٰلکَ الحَقِّ المُستَحَقِّ عَلَینا مِمَّن تَوَلّاہُ... و قَد بَعَثتُ رَسولی اِلیکم بِھذا الکِتابِ وَ اَنا اَدعوکُم اِلی کِتابِ اللہِ وَ سُنَّۃِ نَبِیِہِ، فَاِنَّ السُنَّۃَ قَد اُمیتَت وَ اِنَّ البِدعَۃَ قَد احییت و اِن تَسمعوا قَولی و تُطیعوا اَمری اَھدِکم سَبیلَ الرِّشادِ، والسلام عَلیکم و رحمۃُ اللہِ۔

ترجمہ: اما بعد اللہ نے محمدؐ کو اپنے بندوں میں منتخب کیا، اور اپنی نبوت کے لئے ان کو عہدہ رسالت پر فائز کیا۔ اس کے بعد خدا نے ان کو اپنی جانب بلا لیا، جب کہ وہ اللہ کے بندوں کے خیر خواہ تھے اور وہ سب بتایا جو ان تک پہنچایا گیا تھا۔ ہم لوگ اسی نبی کے خاندان اور ان کے اولیا اور اوصیا کے وارثین ہیں، ان کی جانشینی کا حق سب سے زیادہ ہمیں ہے، لیکن لوگوں نے ہمارے اس مقام کو اپنے اختیار میں لے لیا اور ہم نے بھی اجازت دی تاکہ تفرقہ نہ ہونے پائے کیونکہ ہم امت کا خیر چاہتے تھے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہم نبی کی جانشینی کے لئے اس سے زیادہ لائق ہیں جو ابھی پیغمبرؐ کا جانشین بنا ہوا ہے۔ میں اپنے قاصد کو اس خط کے ساتھ تمہارے پاس بھیج رہا ہوں۔ میں تمہیں خدا اور سنت رسولؐ کی طرف دعوت دینا چاہتا ہوں کہ بے شک سنت مر چکی ہے اور بدعت زندہ ہو گئی ہے۔ اور اگر میری بات کو سنوگے اور اطاعت کروگے تو میں تم کو ہدایت کے راستے پر رہنمائی کروں گا۔ والسّلام علیکم و رَحمتہ اللہ و بَرکاتہ۔[1]

۱۔ ابن جریر طبری، محمد، تاریخ الطبری، جلد ۴، ص ۲۶۵؛ سماوی، محمد، ابصار العین فی انصار الحسین، ص ۹۵

یزید سے بیعت نہ کرنا اور اس کے خلاف قیام

ظالموں کے خلاف جہاد کرنا ایک طرح کی عبادت ہے۔ امام حسینؑ نے معاویہ کے دور میں یزید کی بیعت سے انکار کیا کیونکہ یہی بیعت کرنا ظلم کے سامنے سر جھکانے کے برابر ہوتا، اسی لئے امامؑ نے سختی کے ساتھ معاویہ کی دھمکیوں کا سامنا کیا اور یزید کی بیعت نہیں کی، لیکن امام حسینؑ جنگ نہیں بلکہ عدالت چاہتے تھے۔ وہ عدالت جس کا بنی امیہ کے دور میں نام نشان تک باقی نہیں بچا تھا۔ اسی لئے جب یزید کے دور میں امامؑ سے یزید کی بیعت کے لئے کہا گیا تو امامؑ نے قبول نہیں کیا اور قیام کرنے کا فیصلہ لیا۔ محمد بن حنفیہؒ اور دیگر لوگوں نے آپ کو رائے دی کہ بیعت نہیں کر رہے ہیں تو کم سے کم خاموش ہی رہئے اور کنارہ کشی اختیار کر لیجئے لیکن امامؑ نے فرمایا:

وَاَمّا الحُسینُ فَاِنَّهُ خَرَجَ بِبَنیهِ وَ اِخوَتِهِ وَ بَنی اَخیهِ وَ جُلِّ اهل بیتهِ اِلّا محمد بنَ الحَنفیةِ، فَاِنَّهُ قالَ لَهُ: یااخی انتَ اَحَبُّ النّاسِ اِلی وَ اَعَزُّهُم عَلی و لَستُ اَدَّخِرُ النَّصیحَةَ لِاَحدٍ مِنَ الخَلقِ اَحَقَّ بِها مِنكَ، تَنَحَّ بِتَبِعَتِكَ عَن یزیدَ بن مُعاویةَ وَ عَنِ الاَمصارِ مَا استَطَعتَ، ثُمَّ اَبعَثَ رُسُلَكَ اِلی النّاسِ فَادعُهُم اِلی نَفسِكَ، فَاِن بَایَعوا لَكَ حَمِدتَ اللهَ عَلی ذلكَ و اِن اجمَعَ النّاسُ عَلی غَیرِكَ لَم ینقُصِ اللهُ بِذلكَ دینَكَ و لا عَقلَكَ و لا یذهِبُ بِهِ مُروءَتَكَ و لا فَضلَكَ، اِنّی اَخافُ اَن تَدخُلَ مِصراً مِن هذه الامصارِ و تَاتی جَماعةً مِنَ الناسِ فَیختَلِفونَ بَینَهُم، فَمِنهُم طائِفةٌ مَعَكَ و اخری عَلَیكَ، فَیَقتَتِلونَ فَتَكونُ لِاَوَّلِ الاسِنَّةِ، فَاِذا خَیرُ هذهِ الامَّةِ كُلِّها نَفسا و ابا امّا اضیعُها دَما و اَذَلُّها اهلاً۔ قالَ لَهُ الحسین علیہ السلام: فَاِنّی ذاهِبٌ یا اخی، قال: فَانزِل مَكةَ، فَاِنِ اطمأنَّت بِكَ الدارُ فَسَبیلُ ذلكَ و اِن نَبَت بِكَ لَحِقتَ بِالرِّمالِ وشَعَفِ الجِبالِ و خَرَجتَ مِن بَلَدٍ اِلی بَلَدٍ حَتّی تَنظُرَ اِلی ما یصیرُ امرُ الناسِ و تعرِفَ عِندَ ذلكَ الرَّای، فَاِنَّكَ اصوَبُ ما یكونُ رَایاً و احزَمُهُ عَمَلاً حینَ تَستَقبِلُ الامورَ استِقبالاً و لا تكونُ الامورُ عَلیكَ

اَبَداً اشکَلَ مِنها حینَ تَستَدبِرُها استِبارا ، قالَ : یا اَخی قَد نَصَحتَ فَاَشفَقتَ، فَاَرجوا اَن یکونَ رَایکَ سَدیدا مُوَفَّقا ۔

ترجمہ: امام حسینؑ اپنے بیٹوں، بھائیوں اور بھتیجوں کے ساتھ نکلے، سوائے محمد بن حنفیہؒ کہ جنہوں نے امامؑ سے کہا: اے میرے بھائی! لوگوں کے درمیان میرے لئے سب سے زیادہ عزیز آپ ہی ہیں اور میں سب سے زیادہ آپ کا ہی بھلا چاہتا ہوں۔ آپ جتنا ممکن ہو اپنے اصحاب کے ساتھ یزید بن معاویہ نیز شہروں سے دور ہو جائیں، اور پھر وہاں سے اپنے قاصدوں کے ذریعے لوگوں کو اپنی طرف دعوت دیجئے۔ اگر لوگوں نے آپ کی بیعت کرلی تو اس کے لئے خدا کے مشکور رہئے گا اور اگر لوگ آپ کے سوا کسی اور کے گرد جمع ہوئے تو اس سے خدا آپ کے ایمان اور عقل سے کم نہیں کرے گا اور آپ کی جوانمردی اور فضیلت میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں آئے گی، کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ آپ ان شہروں میں لوگوں کے پاس جائیں تو ان میں آپس میں ہی اختلاف ہو جائے، اور ایک گروہ آپ کا حامی اور دوسرا آپ کے خلاف ہو کر ایک دوسرے سے لڑ جائیں اور آپ خود کو نیزوں کے سائے میں پائیں، جس کے نتیجے میں امت کے شریف ترین شخص کا خون ضائع ہو جائے اور رسوائی کا سامنا ہو۔ امام حسینؑ نے ان سے فرمایا: میرے بھائی! میں ضرور جاؤنگا۔ محمد بن حنفیہؒ نے کہا: مکہ میں ٹھہریئے گا، اگر وہ جگہ سکون اور رکنے کی جگہ ہوئی تو ٹھیک، اور اگر آپ کے میل کے خلاف ہوئی تو بیابانوں اور پہاڑوں کا رخ کرتے ہوئے ایک شہر سے دوسرے شہر جایئے گا جب تک کہ لوگوں کے رد عمل کا پتہ چلے اور پھر اس وقت آپ کو پتہ چل چکے گا کہ کیا کرنا چاہئے۔ صحیح مشورہ اور صحیح راستہ اس وقت حاصل ہوگا جب سختی سے حالات کا سامنا کریں گے اور حالات اس وقت سب سے زیادہ مشکل ہو جاتے ہیں جب پشت سے ان کا پیچھا کیا جائے۔ امامؑ نے فرمایا: اے میرے بھائی! تم نے خیر خواہی اور دلسوزی کی۔ امید کرتا ہوں تمہارے خیالات محکم اور مددگار ہوں۔[1]

۱۔ ابومخنف کوفی، لوط بن یحیٰ ، وقعۃ الطف ص ۸۴؛ مفید، محمد بن محمد ، الارشاد فی معرفۃ حجج اللہ علی العباد، جلد ۲، ص ۳۴؛ مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار الجامعۃ لدرر اخبار الائمۃ الاطہار، جلد ۴۴، ص ۳۲۷؛ بحرانی اصفہانی، عوالم العلوم والمعارف والاحوال امام علی بن ابیطالب ، جلد ۱۷، ص ۱۷۶

اسی طرح ایک دوسری روایت میں ہے کہ محمد بن حنفیہؒ کی طرح عبداللہ بن مطیع عدوی نے بھی کوفہ کے راستے میں امام کو خاموش رہنے کا مشورہ دیا، جس کے جواب میں امامؑ نے فرمایا:

اَقبلَ الحُسینُ علیہ السلام سَیرا اِلی الکوفۃِ ، فَانتھی اِلی ماءٍ مِن مِیاہِ العَرَبِ، فَاِذا عَلَیہِ عَبدُ اللہِ بنُ مُطیعٍ العَدَوی وَ ھُوَ نازِلٌ ھاھُنا، فَلَمَّا رَای الحُسینَ علیہ السلام قامَ اِلیہِ ، فَقالَ بِاَبی اَنتَ وَ اُمی یا ابن رسول اللہ، ما اَقدَمَکَ؟ (وَاحتَمَلَہُ فَانزَلَہُ) فَقالَ لَہُ الحُسینُ علیہ السلام : کانَ مِن مَوتِ مُعاویۃَ ما قَد بَلَغَکَ،فَکَتَبَ اِلی اھلُ العِراقِ یَدعونَنی اِلی اَنفُسِھِم. فَقَالَ لَہُ عَبدُ اللہِ بنُ مُطیعٍ: اذَکرُکَ اللہِ یا ابن رسول اللہ و حُرمَۃَ الاسلام اَن تُنتَھَکَ، اَنشُدُکَ اللہَ فی حُرمۃِ رسول اللہ ؐ اَنشُدُکَ اللہَ فی حُرمۃِ العَرَب، فوَاللہِ لَئِن طَلَبتَ ما فی ایدی بَنی امیۃَ لَیقتُلُنَّکَ و لَئِن قُتِلتَ لا یھابونَ بعدکَ اَحَدا اَبَدا، وَاللہِ اَن ھا لَحُرمَۃُ الاِسلامِ تُنتَھَکَ و حُرمۃُ قُرَیشٍ و حُرمَۃُ العَرَبِ، فلا تَفعَلَ و لا تأتِ الکوفۃَ و لا تَعَرَّض لِبنی امیۃَ، قالَ فَابی اِلّا اَن یمضی۔

ترجمہ: امام حسینؑ کوفہ کی جانب چلے، جب پانی پینے کی ایک جگہ پر پہنچے تو عبداللہ بن مطیع پہلے سے وہاں موجود تھا۔ جیسے ہی اس نے امامؑ کو دیکھا وہ آپ کی طرف آیا اور بولا: میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں اے فرزند رسول! یہاں کس لئے آئے ہیں آپ؟ پھر اس نے امام کو گھوڑے کی پشت سے اترنے میں مدد کی اور آپ نے اس سے فرمایا: معاویہ کی موت سے تو تم باخبر ہوگے، عراقیوں نے مجھے خط لکھے ہیں اور مجھے بلایا ہے۔ عبداللہ بن مطیع نے کہا: خدا کے لئے اسلام کی حرمت و آبرو کی فکر کیجئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کی آبرو جانے سے وہ بھی ختم ہو جائے۔ آپ کو خدا کا واسطہ رسول اللہؐ کی عزت اور عرب کی عزت کو لٹنے سے بچایئے۔ خدا کی قسم اگر آپ بنی امیہ سے وہ طلب کریں گے جو ان کے اختیار میں ہے تو وہ آپ کو قتل کر دیں گے اور اگر انہوں نے آپ کو قتل کر دیا تو پھر آپ کے بعد کسی اور سے نہیں ڈریں گے، اور خدا

کی قسم اسلام، قریش اور عرب سب کی عزت لٹ جائے گی۔ لہٰذا آپ کوفہ نہ جایئے اور بنی امیہ کو ان کے حال پر چھوڑ دیجئے۔ امامؑ نے اس کے مشورے کو قبول کرنے سے انکار کیا اور اپنے سفر کو جاری رکھا۔[۱]

حتی بعض لوگوں نے تو روز عاشورا امام حسینؑ سے یزید کے حکم کے سامنے تسلیم ہونے کے لئے کہا، لیکن آپ نے فرمایا:

"نہیں، خدا کی قسم میں اپنے ہی ہاتھوں سے خود کو تمہارے سامنے ذلیل نہیں کرونگا، اور غلاموں کی طرح فرار نہیں کرونگا۔ (اس کے بعد آپ نے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا) ائے خدا کے بندوں، میں ہر اس متکبر شخص سے جو روز جزا پر یقین نہیں رکھتا تمہارے اور اپنے پروردگار کی پناہ چاہتا ہوں۔ (اس کے بعد آپ نے فرمایا) عزت کی موت ذلت کی زندگی سے بہتر ہے۔"[۲]

اس کا مطلب یہ ہے کہ امامؑ خلافت کے مدعی نہیں تھے اور آپ نے صرف خدا کے دین کی حمایت کے لئے یزید بن معاویہ کی بیعت سے انکار کیا۔ اسی لئے جب مروان نے امامؑ کو یزید کی بیعت کا حکم دیا تو آپ نے فرمایا:

وَیحَکَ! اَتَامُرُنی بِبَیعَةِ یزیدَ و هُوَ رَجُلٌ فاسقٌ ؟ لَقَد قُلتُ شَطَطا مِنَ القَولِ یا عَظیمَ الزَّلَلِ! لا الومُکَ عَلی قَولِکَ لِاَنَّکَ الَّعینُ الذی لَعَنَکَ رسول الله و انت فی صُلبِ اَبیکَ الحَکَمِ بنِ ابی العاصِ. فَاِنَّ مَن لَعَنَهُ رسول الله لا یمکنُ لَهُ و لا مِنهُ اِلّا اَن یدعُوَ اِلی بَیعَةِ یزید. ثُمّ قالَ: اِلیکَ عَنّی یا عدُوَّ اللهِ فَاِنّا اهل بیت رسول الله وَ الحَقُّ فینا و بِالحَقِّ تَنطِقُ اَلسِنَتُنا و قَد سَمِعتُ رسول الله یَقولُ: الخِلافَةُ مُحَرَّمةٌ عَلی آلِ ابی سُفیانَ و عَلی الطُّلَقاءِ ابناءِ الطُّلَقاءِ ، فَاِذا رَایتُم مُعاویةَ عَلی مَنبَری فَابقُروا بَطنَهُ ، فَوَاللهِ لَقَد رآهُ اللهُ فی النّارِ عذابا۔ ترجمہ: وائے ہو تم پر، کیا تم مجھے یزید کی بیعت کا حکم دے رہے ہو؟ جب کہ وہ ایک فاسق انسان ہے۔ وائے ہو تمہاری

۱۔ وقعۃ الطف، ص ۱۶۱، قادتنا کیف نعرفھم، جلد ۳، ص ۶۰۵

۲۔ ابن شہر آشوب، مازندرانی، مناقب آل ابی طالب، جلد ۴، ص ۶۸؛ بحار الانوار، جلد ۴۴، ص ۱۹۲؛ عباس، سفینۃ البحار مدینۃ الحکم والآثار جلد ۴، ص ۴۰۱

لغزش بڑی ہے۔ تم نے بہت بکواس کر لی۔ میں تمہاری باتوں کے لئے تمہاری ملامت نہیں کروں گا کیونکہ تم کو پیغمبرؐ نے لعنت کیا جب تم اپنے باپ حکم بن عاص کے صلب میں تھے۔ پیغمبرؐ کے ذریعہ لعنت شدہ شخص سے یہی امید کی جاسکتی کہ وہ مجھ سے یزید کی بیعت کا مطالبہ کرے۔ اس کے بعد امامؑ نے فرمایا: اے خدا کے دشمن ہم سے دور ہو جاؤ کہ ہم نبی خدا کے اہل بیت ہیں اور حق ہمارے درمیان ہے اور ہماری زبانیں حق بولتی ہیں۔ میں نے پیغمبرؐ سے سنا کہ فرمایا: ابوسفیان کے خاندان اور طلقاء اور ابن طلقاء پر خلافت حرام ہے، اور اگر معاویہ کو میرے منبر پر دیکھنا تو اس کے پیٹ کو پھاڑ دینا۔ خدا کی قسم مدینہ والوں نے اس کو میرے نانا کے منبر پر دیکھا لیکن وہ نہ کیا جس کا انہیں حکم تھا اور خدا نے بھی ان لوگوں کو اس کے بیٹے یزید سے دوچار کر دیا۔ خدا آتش جہنم میں اس کے عذاب میں اضافہ فرمائے۔[1]

جس وقت مروان نے مدینہ کے حاکم ولید کو اشارہ کیا کہ یزید کی بیعت سے انکار کرنے والوں کی گردن اڑا دے، تو امامؑ نے مروان سے فرمایا:

وَیلی عَلیکَ یابنَ الزَّرقاءِ! انتَ تأمُرُ بِضَربِ عُنُقی؟کَذَبتَ و لَؤُمتَ، نحنُ اهل بیت النُبُوَّۃِ و مَعدِنُ الرِّسالَۃِ و یزیدُ فاسقٌ شارِبُ الخَمرِ وقاتِلُ النَّفسِ و مِثلی لایبایعُ لِمِثلِہِ و لکن نُصبِحُ و تُصبِحون اینا اَحَقُّ بِالخِلافَۃِ و البَیعَۃِ۔ ترجمہ: ویل ہو تم پر اے زرقا کے بیٹے! تم میری گردن کاٹنے کا حکم دیتے ہو؟ تم نے جھوٹ بولا ہے اور ظلم کیا ہے۔ ہم اہل بیت نبوت اور معدن رسالت ہیں، اور یزید فاسق، شرابی اور لوگوں کا قاتل ہے۔ مجھ جیسا کبھی بھی یزید جیسے کی بیعت نہیں کر سکتا، لیکن ہم اور تم انتظار کریں گے اور دیکھیں گے کہ ہم میں سے کون زیادہ بیعت اور خلافت کے لائق ہے۔[2]

ان لوگوں نے معاویہ کی کہی ہوئی باتوں پر بھی عمل نہیں کیا کیونکہ اس نے خود امام حسینؑ کی حقانیت کا اقرار کیا تھا اور اپنی وصیت میں بھی امام حسینؑ کے ساتھ مسالمت آمیز رویہ کا حکم دیا تھا۔ اس کی وصیت

۱۔ لجنتہ الحدیث فی معہد باقر العلومؑ، ص ۳۴۶؛ ابن اعثم الکوفی، الفتوح، جلد ۵، ص ۱۷؛ یعقوب، احمد حسین، کربلا الثورۃ والماساۃ، ص ۱۴۹

۲۔ ابن نما الحلی، مثیر الاحزان و منیر سبل الاشجان، ص ۱۴

میں امام حسینؑ کے بیعت نہ کرنے اور آپ کے قیام کے احتمالات کے سلسلے میں ابی مخنف نے عبدالملک بن نوفل بن مساحق بن عبداللہ بن مخرمہ سے اس طرح نقل کیا ہے:

"جب معاویہ مرض الموت میں مبتلا ہوا تو اس نے اپنے بیٹے یزید کو بلوایا اور کہا: بیٹا میں نے تمہارے لئے سفر اور ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کی محنت و مشقت کو کم کر دیا ہے اور ساری چیزوں کو تمہارے لئے تیار کر دیا ہے، تمہارے دشمنوں کو دبایا اور عرب کے بڑے بڑوں کو تمہارے سامنے جھکا دیا ہے، اور تمہارے لئے لوگوں کے درمیان ایکتائی اور وحدت فراہم کرا دیا ہے۔ تمہاری خلافت کے لئے مجھے کسی سے ڈر نہیں ہے سوائے قریش کے ان چار لوگوں کے: حسینؑ بن علیؑ، عبداللہ بن عمر، زبیر اور عبدالرحمٰن بن ابی بکر۔ عبداللہ بن عمر ایسا شخص ہے جو پوری طرح عبادت میں مشغول ہو چکا ہے اور اگر اسے لگے گا کہ اس کے سوا سبھی نے بیعت کر لی ہے تو وہ بھی بیعت کر لے گا۔ لیکن حسین بن علی، عراق والے اس بات کے انتظار میں ہیں کہ اس کو قیام کی دعوت دیں تو ان سے بچنا اور ان کو رہا کر دینا، کیونکہ ان کا گھرانہ اہم گھرانہ ہے اور لوگوں پر اس گھرانے کا بہت بڑا حق ہے۔ عبدالرحمٰن ابی بکر ایسا شخص ہے کہ جو اپنے ساتھیوں کو کرتا ہوا پائے گا وہی وہ بھی انجام دے گا۔ اس کے پاس چرب زبانی اور خوش گذرانی کے علاوہ کچھ نہیں ہے لیکن وہ انسان جو شیر کی طرح تمہاری تاک میں ہے اور اس انتظار میں ہے کہ تم کو بہکائے اور موقع ملتے ہی تم پر حملہ کرے، وہ عبداللہ بن زبیر ہے۔ اگر وہ تمہارے ساتھ کچھ ایسا کرتا ہے تو اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا۔ لیکن یزید نے اپنے باپ کی وصیت کے برخلاف عمل کیا اور امام والا مقام کو شہید کر دیا۔[1]

ہم یہ دیکھتے ہیں کہ امام حسینؑ وہ عدالت چاہتے تھے جو بنی امیہ خاص کر یزید کے دور میں ختم ہو چکی تھی اور آپ کا ہدف ہرگز جنگ نہیں تھا۔ اگر آپ کا مقصد جنگ ہوتا تو آپ معاویہ کے دور میں بھی ایسا کر سکتے تھے لیکن آپ نے قیام نہیں کیا، کیونکہ معاویہ نے خود یزید کو امامؑ کے ساتھ مدارا کرنے کو کہا تھا لیکن یزید نے نہ صرف یہ کہ مدارا نہیں کیا بلکہ آپ کو شہید بھی کر دیا۔

۱۔ تاریخ طبری، جلد ۵، ص ۳۲۲

ظالموں سے مقابلہ

ظلم کے خلاف ہر گز خاموش نہیں رہنا چاہئے، بلکہ ظالموں کے سامنے کھڑے ہو کر ان کا سامنا کرنا چاہئے، کیونکہ ظلم کے مقابل میں خاموش رہنا در حقیقت ظلم کو قبول کر لینے کے برابر ہے جس کے نتیجے میں ظلم پھیلتا چلا جاتا ہے اور صاحبان حق اپنے حق سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ظلم سے مقابلہ کا ایک مرحلہ جہاد استماتہ اور جانبازی ہے، جس کا مطلب راہ حق میں اور ظلم کے خلاف فداکاری کرنا ہے، چاہے اس میں انسان کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ اس طرح کے جہاد کو خود پیغمبرؐ کے دور میں ہی شرعی حیثیت حاصل ہوئی، جس کی بہترین مثال جنگ موتہ ہے جس میں لشکر اسلام کے تین ہزار سپاہیوں کا سامنا روم کے دو لاکھ لشکریوں سے ہوا۔ جب اسلامی فوج کو دشمن کی تعداد کا پتہ چلا تو انہوں نے جعفر بن ابی طالب اور عبداللہ بن رواحہ کی سرپرستی میں آپس میں مشورت کیا اور انہوں نے جہاد کرنے اور قتل ہو جانے کا فیصلہ کیا۔ جب دشمن سے سامنا ہوا تو لشکر اسلام کے سپہ سالار جعفر ابن ابی طالب، زید بن حارثہ اور عبداللہ بن رواحہ نے یکے بعد دیگرے دشمن کے لشکر پر حملہ کیا اور لڑتے رہے جب تک کہ شہید نہیں ہو گئے۔[1]

جہاد استماتہ کی دوسری مثال جو پیغمبر اسلامؐ کی وفات کے بعد واقع ہوئی وہ امام حسین اور آپ کے اصحاب کا جہاد ہے۔ ایک روایت میں امام حسینؑ حر بن یزید کے سپاہیوں سے بات کرنے کے بعد لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> اَیھا الناسُ! فَاِنَّکم اِن تَتَّقوا و تَعرِفوا الحَقَّ لِاَھلِہِ یکن ارضی للّٰہِ و نحنُ اھلَ البیتِ اولی بِوِلایۃِ ھذا الامرِ عَلیکم مِن ھؤلاءِ المُدَّعینَ ما لیسَ لَھُم وَ السّائِرینَ فیکن بِالجَورِ وَ العُدوانِ و اِن انتم کَرِھتُمونا و جَھِلتُم حقَّنا و کانَ رَایکم غَیرَ ما اَتَتنی کتُبُکم و قَدِمَت بِہِ عَلی رُسُلُکُم ، انصَرفتُ عَنکم۔
>
> ترجمہ: اے لوگو!، اگر تم لوگ تقوا اختیار کرو اور حق کو اس کے اہل کے لئے جانو تو تمہارا یہ کام خدا کو زیادہ خوش کریگا۔ ہم اہل بیت تمہاری سرپرستی کے زیادہ حقدار ہیں بنسبت ان کے جو خود

۱۔ کلینی، محمد بن یعقوب، اصول الکافی، جلد ۲، ص ۶۸۲

کو اس کا حقدار سمجھتے ہیں، جب کہ ان کا کوئی حق نہیں ہے اور وہ تمہارے درمیان ظلم و ستم کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ اگر ہم تم کو پسند نہیں اور تم کو ہمارا حق نظر نہیں آرہا ہے اور تمہاری خواہش قرآن و سنت سے مختلف ہے تو میں واپس چلا جاؤنگا۔[1]

اسی طرح تاریخ طبری میں عقبہ بن ابیعزار سے منقول ہے کہ امام حسینؑ بیضہ میں اپنے اصحاب اور حر کے سپاہیوں کے سامنے، ظالموں سے مقابلے کی خاطر قیام کی اہمیت کو ایک خطبے میں اس طرح بتاتے ہیں:

ایھاالناسُ اِنَّ رسول الله قالَ: مَن رَای سُلطانا جائِرا مُستَحِلاً لِحُرَمِ اللهِ، ناکثا لِعَهدِ اللهِ، مُخالفا لِسُنَّةِ رسول الله، یَعمَلُ فی عبادِ اللهِ بِالاثمِ و العُدوانِ ، فَلَم یغیر عَلیهِ بِفِعلٍ و لا قَولٍ، کانَ حقاً عَلی اللهِ اَن یدخِلَهُ مُدخَلَهُ. الا و اِنَّ هؤلاءِ قَد لَزِموا طاعةَالشَّیطانِ و تَرَکوا طاعةَ الرحمنِ و اظهَروا الفَسادَ و عَطَّلوا الحدودَ و استاثَروا بِالفیءِ و اَحَلّوا حَرامَ اللهِ و حَرَّموا حَلالَهُ و انا اَحَقُّ مَن غَیرَ قد اَتَتنی کتُبُکم و قَدِمَت عَلی رُسُلُکم بِبَیعَتِکم اَنَّکم لا تُسلِمونی و لاتَخذُلونی، فَاِن تَمتُم علی بَیعَتِکم تُصیبوا رُشدَکم، فَاَنا الحسینُ بنُ علی و ابنُ فاطمةَ بنتِ رسول الله نَفسی مَعَ انفُسِکم و اهلی مَعَ اهلیکم فَلَکم فی اسوَةٌ و اِن لَم تَفعلوا و نَقَضتُم عَهدَکم و خَلَعتُم بَیعَتی مِن اعناقِکم، فَلَعَمری ما هِی لَکم بِنُکرٍ لَقَد فَعَلتُموها بِاَبی و اخی و ابنِ عَمّی مُسلِمٍ و المَغرورُ مَنِ اغتَرَّ بِکم، فَحَظَّکم اخطأتُم و نَصیبَکم ضَیعتُم و مَن نَکَثَ فَاِنّما ینکثُ عَلی نَفسِهِ و سَیغنی اللهُ عَنکم و السلام علیکم و رحمة اللهِ و برکاتهُ۔

ترجمہ: اے لوگو!، اللہ کے نبی نے فرمایا: اگر کوئی شخص کسی ظالم حاکم کو دیکھے جو خدا کے حرام کو حلال قرار دے رہا ہے، خدا کے احکام کی نافرمانی کر رہا ہے، سنت خدا و رسول کی مخالفت کر رہا ہے اور بندگان خدا کے سلسلہ میں گناہ اور زیادتی سے کام لے رہا ہے، اور وہ شخص

۱۔ وقعۃ الطف، ص ۱۷۰

پھر بھی اس ظالم حکمران کی اپنے عمل اور گفتار سے مخالفت نہ کرے، تو اللہ اس کے ساتھ بھی وہی کریگا جو وہ ظالموں کے ساتھ کرتا ہے۔ یہ لوگ شیطان کی پیروی کرنے لگے ہیں اور خدائے رحمان کی اطاعت چھوڑ چکے۔ آشکارا طور سے فساد کرتے ہیں اور حدود الٰہی کو ختم کر دئے ہیں، لوگوں کے اموال کو ھڑپ کر اپنا بنا لئے ہیں اور خدا کے حرام کو حلال اور اس کے حلال کو حرام قرار دیتے ہیں۔ اور میں وہ ہوں جو ان کی مخالفت کے لئے سب سے زیادہ سزاوار ہوں۔ تمہارے خطوط مجھ تک پہنچے اور تمہارے قاصدوں نے تمہاری بیعت مجھ تک پہنچائی کہ مجھے دشمن کے سپرد نہیں کروگے، اب اگر اپنی بیعت پر باقی رہے تو اس کا مطلب راہ ہدایت پر پہنچ گئے۔ میں حسینؑ ہوں، علیؑ و فاطمہ اور نبی کی بیٹی کا بیٹا، میں تمہارے ساتھ اور میرے گھر والے تمہارے گھر والوں کے ساتھ ہیں اور مجھ میں تمہارے لئے ایک نمونہ ہے۔ اگر تم لوگ عہد شکنی کرتے ہو اور بیعت سے خارج ہوتے ہو اور میری جان کی قسم یہ تم سے بعید بھی نہیں ہے کیونکہ تم نے میری ماں، باپ اور میرے بھائی مسلم کے ساتھ یہی کیا اور تمہاری حمایت پر بھروسہ کرنے والا دھوکا کھانے والوں میں سے ہوتا ہے، لہٰذا تم اپنے نصیب تک نہیں پہنچے ہو اور اس کو برباد کر دیا ہے۔ جو بھی عہد شکنی کرے گا وہ اس کا نقصان بھی خود برداشت کرے گا۔ جلد ہی خدا مجھ کو تم سے بے نیاز کرے گا۔ والسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔[1]

امام حسینؑ خود کو پہچنواتے ہوئے فرماتے ہیں: میں حسین ہوں علی و فاطمہ اور رسول کی بیٹی کا بیٹا، میں تمہارے ساتھ ہوں اور میرا گھرانہ تمہارے گھر والوں کے ساتھ ہے، میرے اندر تمہارے لئے نمونہ ہے۔ لہٰذا وہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں جو یہ دعوی کرتے ہیں کہ عمر سعد کا لشکر امامؑ کو نہیں پہچانتا تھا۔ امامؑ خود کو پہچنوانے کے بعد ظالموں کے خلاف اپنے قیام کے ہدف کو بتاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ آپ حق ہیں اور وہ لوگ باطل ہیں۔ اس کا مطلب امامؑ اپنے قیام کے ہدف کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ خود کو حق پر بھی بتاتے ہیں، اور فرزند زہرا (س) کے الفاظ سے بڑھ کر کیا حجت ہو سکتی ہے؟

۱۔ تاریخ طبری، جلد ۴، ص ۳۰۴؛ ابن اثیر، عزالدین، الکامل فی التاریخ، جلد ۴، ص ۴۸

امت کی اصلاح

کوفہ والوں کی دعوت اور خطوط کو امام حسینؑ کے قیام کی وجہ بتایا جاتا ہے جب کہ ایسا نہیں ہے بلکہ امامؑ نے اپنے خطبوں میں مسلسل اصلاح امت اور امر بہ معروف و نہی از منکر کو اپنے قیام کا مقصد بتایا ہے کیونکہ امر بہ معروف و نہی از منکر سب کی ذمہ داری ہے اور اس کو انجام نہ دینے سے شریعت کے پائے کمزور ہوتے چلے جاتے ہیں اور دین آہستہ آہستہ ختم ہونے لگتا ہے، اور معاشرے میں تباہی اور فساد پھیل جاتا ہے۔ قرآن نے امر بہ معروف و نہی از منکر سے غفلت کو پچھلی قوموں کی ہلاکت کی ایک وجہ بتایا ہے:

كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَن مُّنكَرٍ فَعَلُوهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ۔ ترجمہ: انہوں نے جو برائی بھی کی ہے اس سے باز نہیں آتے تھے اور بدترین کام کیا کرتے تھے۔[1]

اسی طرح قرآن کریم نے یہ بھی بتایا ہے کہ امر بہ معروف و نہی از منکر کو ترک کرنے کے نتیجہ میں معاشرے میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے:

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿۱۰۴﴾ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَأُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ۔ ترجمہ: اور تم میں سے ایک گروہ کو ایسا ہونا چاہئے جو خیر کی دعوت دے، نیکیوں کا حکم دے، برائیوں سے منع کرے اور یہی لوگ نجات یافتہ ہیں۔ اور خبردار ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے تفرقہ پیدا کیا اور واضح نشانیوں کے آجانے کے بعد بھی اختلاف کیا کہ ان کے لئے عذاب عظیم ہے۔[2]

امر بہ معروف و نہی از منکر اس قدر اہمیت کا حامل ہے کہ خدا اس کو امت مسلمہ کی برتری کی وجوہات میں سے بتاتا ہے:

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُم مِّنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ

۱۔ سورہ مائدہ، آیت ۷۹

۲۔ سورہ آل عمران، آیت ۱۰۴-۱۰۵

الْفَاسِقُونَ۔ تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لئے منظر عام پر لایا گیا ہے تم لوگوں کو نیکیوں کا حکم دیتے ہو اور برائیوں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اگر اہل کتاب بھی ایمان لے آتے تو ان کے حق میں بہتر ہوتا لیکن ان میں صرف چند مومنین ہیں اور اکثریت فاسق ہے۔[1]

امام حسینؑ اپنے بھائی محمد کے نام وصیت میں اپنے قیام کے ہدف کو امت کی اصلاح بیان فرماتے ہیں:

دَعا الحُسینُ علیہ السلام بِدواوةٍ و بَیاضٍ و کَتَبَ هذه الوَصیةَ لِاَخیهِ محمد: بسم الله الرحمنِ الرحیمِ، هذا ما اوصی بِهِ الحسینُ بنُ عَلی بنِ ابی طالبٍ اِلی اخیهِ محمد المَعروفِ بِابنِ الحَنَفیةِ: اِنَّ الحسینَ یشهدُ اَن لا اله الاَّ اللهُ وَحدَهُ لا شریکَ لَهُ و اَنَّ مُحَمَّداً عبدهُ و رَسولُهُ جاءَ بِالحَقِّ مِن عِند الحَقِّ و اَنَّ الجَنَّةَ و النارَ حقٌّ و اَنَّ السّاعَةَ آتیةٌ لا ریبَ فیها و اَنَّ اللهَ یبعثُ مَن فی القبورِ و اَنّی لَم اَخرُج اَشِرا و لا بَطِراً و لا مُفسِداً و لا ظالماً و اِنّما خَرَجتُ لِطَلَبِ الاصلاحِ فی امّةِ جَدی، اریدُ اَن آمُرَ بِالمَعروفِ و انهی عَنِ المُنکرِ و اسیرَ بِسیرَةِ جدی محمد و مَن رَدَّ عَلی هذا اَصبِرُ حتی یقضی اللهُ بینی و بَینَ القومِ بِالحقِّ و یحکمَ بینی و بینهُم و هو خیرُ الحاکمینَ و هذا وصیای یا اخی اِلیکَ و ما توفیقی الا باللهِ علیه توکّلتُ و اِلیهِ انیب۔

ترجمہ: امام حسینؑ نے کاغذ و دوات طلب کیا اور یہ وصیت اپنے بھائی محمد کے لئے لکھا: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، یہ وصیت ہے حسین بن علی بن ابی طالب کی اپنے بھائی محمد بن حنفیہؒ کے لئے۔ حسین گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ محمد خدا کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور خدا کی طرف سے جو حق ہے وہ لے آئے اور جنت و جہنم حق ہے اور بے شک قیامت آئے گی اور خدا سبھی لوگوں کو جو قبروں میں ہیں زندہ کرے گا۔ میں نے سرکشی، طغیان، فساد اور ظلم کے لئے قیام نہیں کیا ہے بلکہ میں اپنے جد کی امت کی

۱۔ سورہ آل عمران، آیت ۱۱۰

اصلاح کے لئے اٹھ کھڑا ہوا ہوں، میں امر بہ معروف اور نہی از منکر اور اپنے جد محمدؐ اور باپ علی بن ابی طالب کی سیرت پر چلنا چاہتا ہوں۔ اگر میں تم کو حق پر نظر نہیں آتا تو میں صبر کروں گا جب تک کہ خدا ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرے اور میرے اور ان کے بیچ حکم کرے اور وہ ہی بہترین حاکم ہے۔ یہ میری وصیت ہے تم کو اے میرے بھائی اور خدا میرا مددگار ہوگا۔ میں نے خدا پر توکل کیا ہے اور اسی کی طرف پلٹ کر جاؤں گا۔[1]

امیر المومنین علیؑ دوسرے فرائض کے مقابل میں امر بہ معروف و نہی از منکر کے مقام کو اس طرح بیان فرماتے ہیں:

وَما اَعمالُ البِرِّ کلُّها و الجِهادُ فی سُبیلِ اللهِ عِندَ الاَمرِ بِالمَعروفِ و النَّهی عَنِ المُنکرِ اِلّا کنَفثَةٍ فِی بَحرٍ لُجّی۔ ترجمہ: سبھی نیک امور، یہاں تک کہ خدا کی راہ میں جہاد بھی امر بہ معروف و نہی از منکر کے مقابل میں ایسے ہی ہیں جیسے ایک گھونٹ پانی وسیع دریا کے مقابل میں۔[2]

کوفہ والوں کے خطوط

امام حسینؑ کے کوفہ روانہ ہونے کی ایک وجہ، اہل کوفہ کے وہ خطوط تھے جو انہوں نے امامؑ کے لئے بھیجے تھے۔ ان میں سے ایک خط کی عبارت اس طرح ہے:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، مؤمن شیعوں کی طرف سے حسین بن علی کے نام۔ فوراً کوفہ کی طرف حرکت کرئے، کیونکہ لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں اور آپ کے سوا ان کا کوئی غمخوار نہیں ہے۔ العجل، العجل، العجل، والسلام"۔

اس کے بعد شبث بن ربعی، حجار بن ابجر، یزید بن حارث بن رویم، عروہ بن قیس، عمرو بن حجاج زبیدی اور محمد بن عمرو تیمی نے امام حسینؑ کے لئے اس طرح لکھا:

۱۔ حسینی موسوی، محمد بن ابی طالب، تسلیۃ المجالس وزینۃ المجالس جلد ۲، ص ۱۶۰

۲۔ شریف الرضی، محمد بن حسین، نہج البلاغہ، ص ۵۴۲؛ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، جلد ۱۹، ص ۳۰۶

"اما بعد، ہمارے باغ ہرے بھرے، ہمارے پھل تیار، فصلیں لہلہاتی، درختوں میں سارے پتے آ گئے، آپ جب چاہیں ایک تیار لشکر کی طرف حرکت کر سکتے ہیں، خدا کا سلام اور اس کی رحمت و برکت ہو آپ پر اور آپ کے والد پر۔"[1]

جب امام حسینؑ کوفہ کے قریب پہنچے اور آپ کو پتہ چلا کہ جن لوگوں نے آپ کو خط لکھا تھا وہی لوگ آپ کے سامنے آ کھڑے ہوئے ہیں تو آپ نے ان کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

ایھا الناسُ! انھا مَعذِرَۃٌ اِلی اللہِ عزوجل و اِلیکم ، اِنّی آتِکم حَتّی اَتَتنی کتُبُکم و قَدِمَت عَلی رُسُلُکم ، اَنِ اقدَم عَلینا فَاِنَّہُ لَیسَ لَنا اِمامٌ لَعَلَّ اللہَ یجمعُنا بِکَ عَلی الھُدی فَاِن کُنتُم عَلی ذلک فَقَد جِئتُکم ، فَاِن تُعطونی ما اَطمئِنُّ اِلیہِ مِن عُھودِکم و مَواثیقِکم اقدَم مِصرَکم و اِن تفعلوا و کنتم لِمَقدَمی کارھینَ انصَرَفتُ عَنکم اِلی المَکانِ الذی اَقبَلتُ مِنہُ اِلیکم۔ ترجمہ: اے لوگوں، یہ عذر تمہارے اور خدائے عزوجل کے بیچ ہے۔ میں تمہارے پاس نہیں آیا مگر یہ کہ تمہارے خط مجھ تک پہنچے اور تمہارے قاصدوں نے مجھ تک تمہارا پیغام پہنچایا اور کہا: ہماری مدد کو آیئے کہ ہمارا کوئی پیشوا نہیں ہے، شاید خدا آپ کے ذریعہ ہماری ہدایت کر دے۔ اگر اپنی کہی ہوئی باتوں پر باقی ہو تو میں تم تک آ گیا ہوں، اگر مجھ سے کوئی قابل اعتماد عہد کرتے ہو تو ہم سب تمہارے شہر کی جانب چلیں، اور اگر ایسا نہیں چاہتے ہو اور میرا آنا تمہیں پسند نہیں ہے تو میں وہیں لوٹ جاؤنگا جہاں پر میں یہاں آنے سے پہلے تھا۔[2]

لہٰذا امامؑ کے قیام کی ایک وجہ اہل کوفہ کے وہ خطوط تھے جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ امامؑ خود کو مدینہ سے کوفہ پہنچائیں اور اہل کوفہ کے ساتھ مل کر یزید اور بنی امیہ کے خلاف قیام کریں۔

۱۔ مجلسی، محمد باقر، زندگانی حضرت امام حسن مجتبیٰ، ص ۳۶۵

۲۔ وقعۃ الطف، ص ۱۶۹؛ نوری، حسین بن محمد تقی، مستدرک الوسایل و مستنبط المسایل، جلد ۴، ص ۲۹

امام حسینؑ اور آپ کے اصحاب باوفا کا قیام الٰہی اسباب و اہداف کے پیش نظر تھا لیکن افسوس کے مستشرقین نے اس عظیم حماسہ کی غلط تحلیل پیش کی اور اس کو مادی بتا کر آپ کے قیام کے مبارک ہدف کو خدشہ دار کرنا چاہا لیکن اس مقالہ سے حاصل نتائج ان کی غلط تحلیلوں کا محکم جواب ہیں، جن میں سے کچھ اہم نتائج کو مندرجہ ذیل طریقے سے بیان کیا جاسکتا ہے:

۱۔امام حسینؑ کے بہت سے اصحاب اپنے کام کے انجام سے واقف تھے لیکن پھر بھی وہ وفاداری کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو تنہا نہیں چھوڑا، اور قیام میں آپ کے حامی بنے۔اس سے قیام کے غیر مادی اہداف کی بات واضح ہو جاتی ہے کیونکہ اگر ان کے اہداف مادی ہوتے تو وہ جان کا خطرہ دیکھ کر پیچھے ہٹ جاتے۔

۲۔امام حسینؑ اتم واکمل کا مصداق ہیں جنہوں نے خدا کے دین کو زندہ کرنے اور سنت رسولؐ کے لئے قیام فرمایا تاکہ ان مقدس اہداف کے سائے میں لوگوں کو اس سعادت تک پہنچا سکیں جس کا خدا نے وعدہ کیا ہے۔

۳۔اسلامی متون میں ظلم وجور کے خلاف جنگ اور جہاد کرنے کے لئے مسلسل تاکید ہوئی ہے، اور قیام امام حسینؑ کا ایک ہدف یہ بھی تھا۔آپ کی جنگ عقلمندانہ تھی اور آپ نے زمانے کے تقاضوں کے حساب سے قیام کرنا بہتر سمجھا لیکن بعض اوقات صلح کر لینا ایک طرح کی عقلمندانہ جنگ ہوتی ہے، جیسا کہ امام حسنؑ نے اپنے زمانے کے حساب سے صلح کرنا بہتر سمجھا۔

۴۔امام حسینؑ کے قیام اور آپ کا کوفہ کی طرف حرکت کرنے کا ایک اور سبب اہل کوفہ کے بہت سارے خطوط تھے جو انہوں نے آپ کے لئے لکھا تھا جن کی وجہ سے آپ مدینہ سے کوفہ روانہ ہوئے لیکن وہ لوگ جنہوں نے امامؑ کو خط لکھا، انہوں نے ہی کوفہ پہنچنے سے پہلے امامؑ کے راستے کو روک دیا اور آپ کو شہید کر دیا۔

۵۔امام حسینؑ کے قیام کا ایک اور مقدس ہدف تھا جس کی ضرورت آج کے دور میں بھی محسوس ہوتی ہے، اور وہ امر بہ معروف و نہی از منکر کے فریضوں کو زندہ کرنا ہے، جب امامؑ کو یزید کے فاسقانہ اعمال کی خبر ملی تو پھر امامؑ نے سکوت کرنے کو بہتر نہیں سمجھا اور ان دو فریضوں کی خاطر قیام فرمایا۔

امام حسینؑ کی شہادت نے بجھے ہوئے شعلوں کو پھر ہوا دی جن میں توابین اور مختار ثقفی کے قیام اس شہادت کے نتائج تھے۔

منابع و مآخذ

- قرآن کریم، ترجمہ انصاریان، حسین، انتشارات اسوہ، قم، ۱۳۸۳
- ابن ابی الحدید، عبد الحمید بن ھبۃ اللہ۔ شرح نہج البلاغہ لابن ابی الحدید، محقق و مصحح محمد ابو الفضل ابراہیم، مکتبہ آیۃ اللہ المرعشی النجفی، قم، ۱۴۰۴
- ابن اعثم الکوفی، احمد، الفتوح، تحقیق علی شیری، دار الاضواء للطباعۃ والنشر والتوزیع، بیروت، ۱۴۱۱
- ابن اثیر، عزالدین، الکامل فی التاریخ، دار صادر، بیروت، ۱۳۸۶
- ابن جابر، البلاذری، احمد بن یحیٰی، انساب الاشراف، تحقیق الشیخ محمد باقر المحمودی، دار التعارف للمطبوعات، بیروت، ۱۳۹۷
- ابن جریر طبری، محمد، تاریخ الطبری، تحقیق نخبۃ من العلماء الاجلاء، موسسۃ الاعلمی للمطبوعات، بیروت، ۱۴۱۸ ہجری
- تاریخ الامم والملکوک، تحقیق محمد ابو الفضل ابراہیم، دار المعارف، قاہرہ
- احمدی میانجی، علی، مکاتیب الرسولؐ، دار الحدیث،، قم، ۱۴۱۹ ہجری
- ابن شعبہ حرانی، حسن بن علی، تحف العقول عن آل الرسولؐ محقق/ مصحح: علی اکبر غفاری، انتشارات جامعۂ مدرسین، قم، ۱۴۰۴
- ابن شہر آشوب مازندرانی، محمد بن علی، مناقب آل ابی طالب، قم، ۱۳۷۹
- ابن عساکر، علی بن حسن۔ ترجمہ الامام الحسینؑ، تحقیق: الشیخ محمد باقر المحمودی، مجمع احیاء الثقافۃ الاسلامیہ، قم، ۱۴۱۴
- ابن قتیبۃ الدینوری، ابو حذیفہ احمد بن داوود، الاخبار الطوال، تحقیق عبد المنعم عامر، قاہرہ، ۱۹۶۰م
- ابن نما الحلی، جعفر بن محمد، مثیر الحزان ومنیر سبل الشجان، المطبع الحیدریۃ، نجف اشرف، ۱۹۵۰م
- ابو مخنف کوفی، لوط بن یحیٰی، وقعۃ الطف، محقق/ مصحح: محمد ھادی یوسفی غروی، جامعہ مدرسین حوزہ علمیہ قم، ۱۴۱۷
- بحرانی اصفہانی، عبد اللہ بن نور اللہ، عوالم العلوم ولمعارف والاحوال الامام علی بن ابی طالب، محقق/ مصحح: محمد باقر موحد ابطحی اصفہانی، موسسۃ الامام المہدی (عج)، قم، ۱۳۸۲
- حسینی موسوی، محمد بن ابی طالب، تسلیۃ المجالس وزینۃ المجالس، محقق/ مصحح: کریم فارس حسون، موسسۃ المعارف الاسلامیہ، قم
- سماوی، محمد، ابصار العین فی انصار الحسینؑ، تحقیق: الشیخ محمد جعفر الطبسی، مطبعۃ حرس الثورہ الاسلامیہ، قم، ۱۴۱۹

- شریف الرضی، باقر، حیاۃ الامام الحسینؑ، مطبعۃ الاداب ، نجف اشرف، ۱۳۹۴
- شریف الرضی، محمد بن حسین، نہج البلاغہ، محقق/ مصحح: صالح، صبحی، قم، ہجرت، ۱۴۱۴
- قمی، عباس، سفینۃ البحار مدینۃ الحکم والآثار، اسوہ، قم، ۱۴۱۴
- کلینی، محمد بن یعقوب، اصول الکافی، مترجم محمد باقر کمرہ ای، اسوہ، قم، ۱۳۷۵
- لجنۃ الحدیث فی معہد باقر العلومؑ، موسوعہ کلمات الامام الحسینؑ، دار المعروف للطباعۃ والنشر، قم، ۱۴۱۶
- مجلسی، محمد باقر بن محمد تقی، بحار الانوار الجامعۃ لدرر اخبار الائمہ الاطہار، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۰۳
- زندگانی حضرت امام حسن مجتبیٰؑ، ترجمہ جلد ۴۴ بحار الانوار، مترجم: محمد جواد نجفی، تہران، ۱۳۶۲
- مفید، محمد بن محمد، الارشاد فی معرفۃ حجج اللہ علی العباد، محقق، مصحح موسسۃ آل البیت، کنگرہ شیخ مفید قم، ۱۴۱۳
- موسوی خمینی، روح اللہ، صحیفہ امام، مؤسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی، تہرانؒ، ۱۳۸۶
- میلانی، سید محمد ہادی، قادتنا کیف نعرفہم، تحقیق سید محمد علی میلانی، شریعت، قم، ۱۴۲۴
- نوری، حسین بن محمد تقی، مستدرک الوسائل و مستنبط المسائل، محقق/ مصحح موسسہ آل البیتؑ، موسسۃ آل البیت، قم، ۱۴۰۸
- یعقوب، احمد حسین، کربلا الثورہ والماساۃ، الغدیر للطباعۃ والنشر والتوزیع، بیروت، ۱۴۱۸

امام رضاؑ کا تذکرہ صوفیا کی کتابوں میں

تالیف: منصور داداش نژاد
ترجمہ: مولانا ڈاکٹر گلزار احمد خان

اہل تصوف اپنے بزرگوں اور اولیاء کی شرح حال لکھنے کو بہت اہمیت دیتے تھے اور اس طرح سے وہ اپنے مریدوں کو ان کامیاب نمونوں کے ذریعہ صحیح راستہ دکھاتے تھے۔ وہ لوگ تصوف کی بزرگ شخصیتوں کی زندگی کو لوگوں کے لئے بیان کرتے تھے تاکہ ان کو یہ بتاسکیں کہ انہیں کن چیزوں پر اعتقاد رکھنا ہے اور کن اخلاقی قواعد کی پابندی کرنی ہے۔اس طرح کی کتابوں کو اہل تصوف کی اصطلاح میں تاریخ ارشادی کہتے ہیں جن میں بزرگان تصوف کی زندگی سے کچھ سبق آموز کہانیاں بیان کی جاتی ہیں اور یہ کام تیسری صدی ہجری یعنی تصوف کے وجود میں آنے کے فوراًبعد ہی شروع ہوچکا تھا[۱]۔ دوسری اور تیسری صدی ہجری میں صوفیا نے انبیاء، پیغمبر اسلامؐ، صحابہ اور اہل بیت پیغمبرؐ کی زندگی سے ماخوذ سبق آموز کہانیوں کو اپنی محافل و مجالس میں نقل کرنا شروع کیا اور چوتھی اور پانچویں صدی میں یہ کہانیاں ان کی کتابوں میں داخل ہوگئیں[۲]۔

آہستہ آہستہ صوفیا کی تعلیمات جو اس سے پہلے سینہ بہ سینہ نقل ہوتی تھیں، کتابوں میں داخل ہوئیں اور مکتب تصوف وجود میں آیا اور اسی زمانہ سے ائمہ اطہارؑ کے اسمائے گرامی بھی ان کتابوں میں نقل ہوئے۔ صوفیا کی کتابوں میں ساتویں صدی تک امام رضاؑ کا نام بہت ہی مختصر انداز میں آیا ہے لیکن بعد کے ادوار میں زیادہ تفصیل کے ساتھ آپ کا نام ان کتابوں میں تحریر ہوا۔ پہلے کی کتابوں میں امام رضاؑ کی زندگی سے صرف چند سبق آموز نکتے یا کچھ روایتوں کی سند نقل ہوئی ہیں جیسے تہذیب الاسرار خرگوشی[۳] (وفات ۴۰۷ ہجری)

۱۔ پور جوادی، نصراللہ، آسمان جان، ص ۲۲
۲۔ ایضاً
۳۔ خرگوشی، عبدالملک بن محمد، تہذیب الاسرار فی اصول التصوف، ص ۱۹۶

اور طبقات الصوفیہ سلمی(وفات ۴۱۲ ہجری)[۱] لیکن بعد کی کتابوں میں جیسے فصل الخطاب خواجہ محمد پارسا (وفات ۸۲۲)[۲] اور شواہد النبوۃ جامی (وفات ۸۹۸ ہجری)[۳] میں آپ کی زندگی پر کئی صفحات مختص ہیں۔

ہم اس مقالہ میں اس موضوع پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں کہ پہلی سات صدیوں میں صوفیا کی کتابوں میں امام رضاؑ کا تذکرہ کس انداز میں ہوا ہے اور سب سے پہلے کس کتاب میں آپ کا نام ملتا ہے۔ قاسم تہرانی نے اپنی کتاب معروف الکرخی تلمیذ الامام الرضاؑ و استاذ العرفاء میں معروف کرخی سے متعلق اس واقعہ کو تفصیل سے پیش کیا ہے اور امام رضاؑ سے کرخی کی ملاقات کو مثبت انداز میں بیان کیا ہے[۴]۔ کامل مصطفیٰ شیبی اپنی دو کتاب الصلۃ بین التصوف و التشیع اور التشیع و التصوف میں معروف کرخی کے اس واقعہ کو تشیع اور تصوف کے درمیان تعلقات کی ایک کڑی مانتے ہیں[۵]۔ منوچہر صدوقی سہا نے اپنے مقالہ نسبت سلسلہ ہای صوفیہ با ائمہ اہل البیت میں بزرگان صوفیا اور ائمہ کے مابین تعلقات پر سوال اٹھائے ہیں[۶]۔ حسن ذوالفقاری نے اپنے مقالہ معروف کرخی میں کرخی کے واقعہ کا تجزیہ کیا اور اسے قبول نہیں کیا ہے[۷]۔

منابع اہل تصوف میں شرح حال امام رضاؑ

ائمہ اطہارؑ کے اقوال و تعلیمات ہمیشہ سے صوفیا کے لئے الہام بخش رہے ہیں اور بعض اقوال تصوف کے قدیمی ترین منابع میں منقول ہیں۔ ان کتابوں میں ائمہ اطہارؑ اور بزرگان تصوف کے مابین تعلقات کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ مثال کے طور امام موسی کاظمؑ اور شقیق بلخی (وفات ۱۹۴ہجری) اور بشر حافی (وفات

۱۔ سلمی، محمد بن حسین، طبقات الصوفیہ، ص ۸۲
۲۔ پارسا، خواجہ محمد، فصل الخطاب، ص ۵۷۷-۵۸۸
۳۔ جامی، نورالدین، عبدالرحمٰن، شواہد النبوۃ، ص ۳۸۰-۳۹۲
۴۔ طہرانی، قاسم، معروف الکرخی تلمیذ الامام الرضاؑ واستاذ العرفاء، ص ۲۴۱-۵۳۲
۵۔ شیبی، کامل مصطفیٰ، تشیع و تصوف تا آغاز سدہ دوازدہم ہجری، ص ۶۷
۶۔ صدوقی، سہا، منوچہر، نسبت سلسلہ ہای صوفیہ با ائمہ اہل البیت، کیہان اندیشہ، شمارہ ۴۹، ص ۱۱
۷۔ ذوالفقاری، حسن، معروف کرخی، ادب و زبان فارسی، بہار ۱۳۸۵، ص ۱۵۶

۲۲۷ ہجری) کے مابین تعلقات[۱]۔ اسی طرح کتب صوفیہ میں کرخی اور امام رضاؑ کے تعلقات کو ثابت کرنے کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور بہت سی کتابوں میں اس موضوع کو نقل کیا گیا ہے۔ اس طرح کی کتابوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

الف: ایسی کتابیں جن میں سرسری طور پر امام رضاؑ کا تذکرہ ملتا ہے۔ ایسی کتابوں میں کسی صوفی کے تذکرے کے ضمن میں یا بعض اخلاقی روایتوں کے ضمن میں امام رضاؑ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس طرح کی کتابیں زیادہ تر شروع کی سات صدیوں میں تحریر کی گئی ہیں۔

ب: ایسی کتابیں جن میں تفصیل کے ساتھ آن حضرت کا تذکرہ کیا گیا ہے اور جو ساتویں صدی کے بعد تحریر ہوئی ہیں جیسے عبد الرحمٰن جامی (۸۹۸) کی شواہد النبوۃ لتقویہ یقین اہل الفتوۃ[۲]۔ اس مقالہ میں صرف شروع کی سات صدیوں میں تحریر کی گئی کتابوں پر نظر ڈالی جائے گی۔ ان کتابوں میں امام رضاؑ کا نام کسی حکایت یا کسی حدیث کے راوی کے عنوان سے نقل ہوا ہے۔ یہاں پر اہل تصوف کی ان کتابوں کی فہرست پیش کی جارہی ہے جن میں امام رضاؑ کا تذکرہ ملتا ہے اور شروع کی سات صدیوں میں تحریر کی گئیں ہیں:

۱. **تہذیب الاسرار**: ابو سعد زاہد (وفات ۴۰۷ ہجری) صوفیوں کے پہلے مؤلف ہیں جنہوں نے اپنی کتاب میں امام رضاؑ کا تذکرہ کیا ہے۔ ابو سعد عبد الملک بن محمد خرگوشی معروف بہ ابو سعد واعظ اور ابو سعد زاہد نیشابور کے شافعی عالم دین تھے[۳]۔

اس سے قبل ابو نصر سراج طوسی (۳۷۸) صاحب اللمع فی التصوف، ابو بکر محمد بن ابراہیم کلاباذی (وفات ۳۸۰ ہجری) صاحب التعرف لمذہب اہل التصوف اور ابو طالب مکی (وفات ۳۸۶ ہجری) صاحب قوت القلوب نے اپنی کتابوں میں بعض ائمہ اطہارؑ کا تذکرہ کیا ہے لیکن کسی نے بھی امام رضاؑ کا تذکرہ نہیں کیا ہے جب کہ امام رضاؑ کا زہد مشہور تھا[۴] لیکن شاید امام رضاؑ کی ولی عہدی کی وجہ سے آپ کا نام نہیں لیا گیا ہے۔

۱۔ الگار، حامد، امام موسی کاظم و اخبار اہل تصوف، ص ۴۲-۵۵

۲۔ داداش نژاد، منصور، زندگانی دوازدہ امام در کتاب شواہد النبوۃ جامی، ص ۵۱-۶۸

۳۔ شمس، محمد جواد، دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی، مدخل خرگوشی، ج ۲۲، ص ۳۱۷

۴۔ ابن جوزی، عبد الرحمٰن بن علی، المنتظم فی تاریخ الامم والملوک، ج ۱۰، ص ۹۶؛ صدوق، محمد بن علی، عیون اخبار الرضا، ج ۲، ص ۱۳۹

خرگوشی نے اپنی کتاب میں دو جگہ پر امام رضاؑ کا تذکرہ کیا ہے۔ پہلی حکایت آپ کے حمام جانے کی سلسلہ میں ہے جسے اس طرح بیان کیا ہے:

> عام طور پر حمام آپ کے لئے خالی کر دیا جاتا تھا۔ایک دن کوئی شخص حمام میں وارد ہوا لیکن وہ امام کو پہنچانتا نہیں تھا اور حمامی بھی اس وقت موجود نہیں تھا۔ اس نے امام کو امر و نہی کیا اور امام نے بھی وہ کام انجام دئے جو وہ چاہتا تھا۔ حمامی واپس آیا تو اس منظر کو دیکھ کر مارے خوف کے بھاگ گیا۔

خرگوشی اس حکایت کے آخر میں امامؑ سے ایک جملہ نقل کرتا ہے کہ حمامی کو بھاگنا نہیں چاہئے تھا کیونکہ اس کی کوئی غلطی نہیں تھی[۱]۔خرگوشی نے اس کتاب کے آخری باب میں بھی امام رضاؑ سے ایک روایت نقل کی ہے جسے آپ نے اپنے والد بزرگوار سے روایت کی ہے۔

۲. **طبقات الصوفیہ**: ابوعبدالرحمٰن محمد بن حسین سلمی (وفات ۴۱۲ ہجری) مفسر صوفیوں میں سے ہیں۔ انہوں نے اولیائے صوفیہ کی شرح حال میں ایک کتاب تحریر کی جسے طبقات الصوفیہ کے نام سے جانا جاتا ہے جس میں امام رضاؑ کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ سلمی پہلے شخص ہیں جنہوں نے امام رضاؑ کے ہاتھوں پر معروف کرخی کے اسلام لانے کی طرف اشارہ کیا ہے[۲]۔ سلمی کے بعد کے مؤلفین نے اس بات کو اسی کتاب سے نقل کیا ہے پر سلمی اپنی کتاب میں معروف کرخی کے بارے تحریر کرتے ہیں کہ وہ امام رضاؑ کے دست مبارک پر مسلمان ہوئے اور مسلمان ہونے کے بعد آنحضرت کے دربان تھے[۳]۔ امامؑ کی خدمتگزاری کے دوران جب شیعہ آپ سے ملاقات کے لئے ایک دوسرے پر ٹوٹ رہے تھے تو آپ کے پہلو پر چوٹ لگی اور اسی چوٹ کی وجہ سے ان کا انتقال ہو گیا۔ انہیں بغداد میں دفن کیا گیا[۴]۔

۱۔ تہذیب الاسرار فی اصول التصوف، ص ۱۹۲
۲۔ سلمی، طبقات الصوفیہ، ص ۸۲
۳۔ ایضاً
۴۔ ایضاً

امام رضاؑ کے سلسلہ میں سلمی نے صرف اتنا ہی بیان کیا ہے البتہ اس واقعہ کو سلمی کے بعد کی کتابوں میں بہت اہمیت دی گئی ہے۔ مثال کے طور پر عطار کی کتاب تذکرۃ الاولیاء میں بھی اس کو نقل کیا گیا ہے[۱]۔

۳. آداب الصحبۃ: یہ کتاب بھی سلمی کے ذریعہ تحریر کی گئی ہے اور اس میں امام رضاؑ کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ انہوں نے آداب ہم نشینی اور حسن معاشرت کے سلسلہ میں امام رضاؑ سے ایک حدیث نقل کی ہے جسے علی بن مہدی بن صدقہ نے آپ سے روایت کی ہے۔ امامؑ اس حدیث میں باپ کے ذریعہ بیٹے کی مدد کے سلسلہ میں پیغمبر اسلامؐ کا ایک قول نقل کرتے ہیں[۲]۔

سلمی انہیں اسناد کے ذریعہ انسانوں کے ساتھ نیکی کرنے کے سلسلہ میں دو روایت نقل کرتے ہیں[۳]۔ فتوت میں امام صادقؑ سے ایک حدیث نقل کرتے ہیں جس کی اسناد میں امام رضاؑ کا نام لیا گیا ہے[۴]۔

۴. تفسیر الامام جعفر الصادقؑ: سلمی نے اس کتاب میں بعض روایتوں کو بلاواسطہ امام صادقؑ سے نقل کیا ہے جبکہ دوسری کتابوں میں ان روایات کے سلسلہ اسناد میں امام رضاؑ کا نام بھی ملتا ہے[۵]۔ سلمی نے اس کتاب میں روایتوں کے اسناد کو مکمل طور پر نقل نہیں کیا ہے اور امام رضاؑ اور دوسرے راویوں کا ذکر نہیں کیا ہے[۶]۔

۵. حلیۃ الاولیاء و طبقات الاصفیا: ابو نعیم احمد بن عبداللہ اصفہانی (وفات ۴۳۰ ہجری) نے اس کتاب کو زاہدوں اور عابدوں کی شرح حال میں تحریر کیا ہے جس میں ائمہ معصومینؑ کے سوانح حیات بھی منقول ہیں۔ انہوں نے بزرگان صوفیہ کے ذیل میں امام علی بن ابیطالبؑ[۷]، امام حسنؑ[۸]، امام زین العابدینؑ[۹]،

۱۔ عطار نیشاپوری، فریدالدین، تذکرۃ الاولیاء، ج ۱، ص ۲۶۹-۲۷۳
۲۔ سلمی، محمد بن حسین، مجموعہ آثار السلمی، ج ۲، ص ۱۰۴
۳۔ مجموعہ آثار السلمی
۴۔ ایضاً، ص ۲۷۵
۵۔ بقلی شیرازی، روزبہان، عرائس البیان فی حقائق القرآن، ج ۱، ص ۱۵
۶۔ مجموعہ آثار السلمی، ج ۱، ص ۲۱-۲۳
۷۔ اصفہانی، ابو نعیم احمد بن عبداللہ، حلیۃ الاولیاء و طبقات الاصفیاء، ج ۱، ص ۶۱
۸۔ ایضاً، ج ۲، ص ۳۵
۹۔ ایضاً، ج ۳، ص ۱۳۳

امام محمد باقرؑ [۱] اور امام جعفر صادقؑ [۲] کا تذکرہ کیا ہے۔ مؤلف نے پانچ روایتوں کی اسناد میں امام رضاؑ کا تذکرہ کیا ہے:

- سب سے مشکل کام کے سلسلہ میں احمد بن عامر طائی [۳] (وفات ۲۶۰ ہجری کے بعد) کے ذریعہ منقول ایک روایت [۴]۔
- ابوالصلت ہروی (م ۲۳۶ق) کے ذریعہ حدیث سلسلۃ الذہب
- اخلاص کے بارے میں ایک حدیث [۵]
- سوال کرنے کی تعریف میں پیغمبر اسلامؐ سے مروی ایک حدیث کی سند [۶]
- امام صادقؑ کی شہادت کے سلسلہ میں ایک روایت [۷]
- شرب خمر کی مذمت میں پیغمبر اسلامؐ سے مروی ایک روایت کی سند [۸]

ابو نعیم اصفہانی نے اس کتاب میں معروف کرخی کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ کیا ہے [۹] لیکن امام رضاؑ سے سے ان کی ملاقات کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔

۶. تاریخ اصبہان: ابو نعیم اصفہانی نے اس کتاب میں ان راویوں کا تذکرہ کیا ہے جنہوں نے اصفہان کا سفر کیا ہے اور اس ضمن میں تین روایتیں امام رضاؑ سے منقول ہیں: سفر نیشاپور کے دوران ایمان کے سلسلہ

۱۔ حلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء، ص ۱۸۰

۲۔ ایضاً، ۱۹۲

۳۔ ان کی کنیت ابو جعد ہے۔ سنہ ۱۵۷ قمری میں ولادت ہوئی اور سنہ ۲۶۰ تک زندہ تھے۔ امام رضاؑ کے مؤذن تھے۔ شیخ طوسی نے ان کو اصحاب امام رضاؑ میں شمار کیا ہے۔ خطیب بغدادی نے اپنی کتاب میں ایک باب ان کے لئے مختص کیا ہے۔ (خطیب بغدادی، احمد بن علی، تاریخ بغداد او مدینۃ السلام، ج ۵، ص ۹۶)

۴۔ حلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء، ج ۱، ص ۸۵

۵۔ ایضاً، ج ۳، ص ۱۹۲

۶۔ ایضاً

۷۔ ایضاً، ص ۱۹۸

۸۔ ایضاً، ص ۲۰۳

۹۔ ایضاً، ج ۸۸، ص ۳۶۰

میں ایک حدیث[۱]۔انہیں اسناد کے ساتھ روایت محض پر فقاہت کی برتری پرایک حدیث[۲] اور حسن معاشرت کے سلسلہ میں ایک روایت[۳]۔

اس کتاب میں زیادہ تر شہر اصفہان کی تہذیبی تاریخ اور دینی تہذیب کی ترویج کرنے والی شخصیتوں کا تذکرہ ہے لیکن ابو نعیم نے روایات کے انتخاب میں اخلاقی پہلو پر زیادہ توجہ کی ہے، اسی وجہ سے اس کتاب میں امام رضاؑ سے منقول روایات بھی تہذیب وتربیت سے متعلق ہیں۔

۷. **رسالہ قشیریہ**: عبدالکریم قشیری (وفات ۴۶۵ ہجری) نے اس کتاب میں معروف کرخی کی شرح حال میں امام رضاؑ کا تذکرہ کیا ہے[۴]۔ قشیری نے کرخی کو امام رضاؑ کے موالیوں میں سے بتایا ہے اور اپنے استاد ابو علی دقاق[۵] (وفات ۴۰۵ ہجری) سے نقل کیا ہے کہ کرخی، امام رضاؑ کے ہاتھوں مسلمان ہوا اور اسے امامؑ کا خادم بتایا ہے۔رسالہ قشیریہ میں صرف امام علیؑ، امام زین العابدینؑ اور امام رضاؑ کا مختصر تذکرہ ملتا ہے۔

۸. **کشف المحجوب**: ابوالحسن علی بن عثمان ہجویری (وفات ۴۶۵ ہجری) کی یہ کتاب فارسی زبان میں اسلامی تصوف کی قدیم کتابوں میں سے ہے جسے دوسرے دانشوروں نے ماخذ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس کتاب میں چھٹے امام تک کا تذکرہ موجود ہے[۶]۔ ہجویری معروف کرخی کے سوانح حیات کے ذیل میں امام رضاؑ کا تذکرہ کرتا ہے اور معروف کو امامؑ کے متعلقین میں سے بتاتا ہے۔

۹. **طبقات الصوفیہ**: طبقات الصوفیہ خواجہ عبداللہ انصاری (وفات ۴۸۱ ہجری) کی مجالس وعظ ونصیحت کا مجموعہ ہے جس میں انہوں صرف معروف کرخی کے واقعہ کے ضمن میں امام رضاؑ کا تذکرہ کیا ہے اور تین

۱۔ اصفہانی، ابو نعیم احمد بن عبداللہ، تاریخ اصبہان، ج۱، ص ۱۷۴

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً، ج ۲، ص ۱۷۲

۴۔ قشیری، عبدالکریم، الرسالۃ القشیریہ، ص ۴۱

۵۔ حسن بن محمد دقاق معروف بہ ابو علی دقاق نیشاپور کے بزرگ صوفیوں میں سے تھے۔انہوں نے اپنی بیٹی کی شادی قشیری سے کی۔ (جامی، عبدالرحمن، نفحات الانس، ص ۳۲۹)

۶۔ ہجویری، ابوالحسن، علی، کشف المحجوب، ص ۸۵-۹۶

نکات یعنی امام کے ہاتھوں کرخی کا اسلام لانا، بارگاہ امام کی دربانی اور امام کی ملاقات کے لئے آئے ہوئے اژدہام کی وجہ سے ان کی موت کی طرف اشارہ کیا ہے[۱] اور حضرت علیؑ سے کچھ باتیں نقل کی ہیں۔

۱۰. **کیمیای سعادت**: ابوحامد غزالی (وفات ۵۰۵ ہجری) نے کیمیای سعادت میں حمامی کی داستان بیان کی ہے جسے خرگوشی نے نقل کیا ہے[۲]۔ دونوں کتابوں میں اس واقعہ کی نقل میں صرف محل وقوع کا فرق ہے۔ خرگوشی نے یہ نہیں بتایا کہ وہ حمام کہاں پر واقع ہے لیکن غزالی نے صراحت کے ساتھ تحریر کیا ہے کہ یہ واقعہ نیشاپور کا ہے[۳]۔ غزالی نے احیاء علوم الدین میں بھی اس کا تذکرہ کیا ہے[۴]۔

۱۱. **کشف الاسرار**: رشید الدین میبدی (وفات ۵۳۰ ہجری) نے اس کتاب کو خواجہ عبداللہ انصاری کی تفسیر کی بنیاد پر ترتیب دی ہے اور چار روایتوں کے نقل میں امام رضاؑ کا تذکرہ کیا ہے۔ ایک روایت بسم اللہ کے معنی کے سلسلہ میں[۵]، دوسری روایت جہاد و شہادت کے ثواب کے لئے[۶] اور تیسری روایت حسن خلق کے موضوع[۷] پر اور آخری روایت قرائت سورہ زلزل کے ثواب کے بارے میں[۸]۔

۱۲. **مناقب الابرار و محاسن الاخیار**: ابن خمیس موصلی (وفات ۵۵۲ ہجری) شافعی فقیہ اور ابوحامد غزالی کے شاگرد تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب مناقب میں معروف کرخی اور امام رضاؑ کے تعلقات کے سلسلہ میں پچھلے دانشوروں کی باتوں کو نقل کیا ہے[۹]۔

۱۔ انصاری، عبداللہ بن ابی منصور، طبقات الصوفیہ، ص ۳۸
۲۔ غزالی، ابوحامد محمد، کیمیای سعادت، ج ۲، ص ۲۵
۳۔ ایضاً
۴۔ غزالی، ابوحامد محمد، احیاء علوم الدین، ج ۸، ص ۱۲۸
۵۔ میبدی، ابوالفضل، رشید الدین، کشف الاسرار و عدۃ الابرار، ج ۱، ص ۲۸
۶۔ ایضاً، ج ۲، ص ۲۴۸
۷۔ ایضاً، ج ۱۰، ص ۱۸۹
۸۔ ایضاً، ص ۵۷۷
۹۔ موصلی، حسین بن نصر، مناقب الابرار و محاسن الاخیار فی طبقات الصوفیہ، ج ۱، ص ۱۲۰

۱۳. **عرائس البیان فی حقائق القرآن**: روزبہان بقلی شیرازی (وفات ۶۰۶ ہجری) معروف بہ شیخ شطاح شافعی فارس کے عرفا میں سے ہیں۔انہوں نے عرفانی نقطہ نظر کی بنیاد پر تفسیر کے موضوع پر اس کتاب کو تحریر کیا۔ انہوں نے باالواسطہ یا بلاواسطہ اٹھارہ روایتیں امام رضاؑ سے نقل کی ہیں جن کی اسناد امام جعفر صادقؑ تک پہنچتی ہیں۔ ان احادیث کا موضوع تفسیر و تاویل ہے۔شرح بسم اللہ[۱]، سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۲۵ میں لفظ بیت کی وضاحت[۲]، سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۵۸ میں صفا و مروہ کی وضاحت[۳] اور سورہ نساء کی آیت نمبر ۲۹ میں لا تقتلوا انفسکم کی وضاحت[۴] ان احادیث میں شامل ہیں۔

۱۴. **تقسیم الخواطر**: شیخ شطاح نے تقسیم الخواطر میں صرف ایک روایت امام رضاؑ سے خلقت رسول خداؐ کے سلسلہ میں نقل کی ہے[۵]۔

۱۵. **شمس المعارف الکبری**: شیخ احمد بن علی بونی (وفات ۶۲۲ ہجری) علوم غریبہ کے مشہور دانشور ہیں جنہوں نے عربی زبان میں ادعیہ، جداول، طلسم اور اسمائے اعظم الٰہی کے موضوع پر اس کتاب کو تحریر کیا ہے۔ انہوں نے اسی کتاب میں کسی خلیفہ کے ہاتھوں پر امام رضا کی عدم بیعت کو علم جفر سے مستند کیا ہے۔انہوں نے اس خلیفہ کا نام نہیں بتایا ہے۔

۱۶. **تذکرۃ الاولیاء**: شیخ عطار نیشاپوری (وفات ۶۲۷ ہجری) کی منثور کتاب ہے جس میں انہوں نے مشائخ صوفیہ کے ۹۷ بزرگوں کا تذکرہ کیا ہے۔تذکرۃ الاولیا امام جعفر صادقؑ کی شرح حال سے شروع ہوتی ہے۔ عطار نے دو جگہ امام رضاؑ کا تذکرہ کیا ہے۔ پہلے معروف کرخی کے واقعہ کے ذیل میں آنحضرتؑ کے ہاتھوں ان کا اسلام لانا اور امام کی بارگاہ میں رہتے ہوئے ان کی موت[۶] اور دوسرے سفر نیشاپور کے

۱۔ عرائس البیان فی حقائق القرآن، ص ۱۵
۲۔ ایضاً، ص ۶۲
۳۔ ایضاً، ص ۷۰
۴۔ ایضاً، ص ۲۴۱
۵۔ بقلی شیرازی، روزبہان، تقسیم الخواطر، ص ۱۷۸
۶۔ تذکرۃ الاولیاء، ج ۱، ص ۲۶۹-۲۷۳

کے دوران حدیث سلسلۃ الذہب[۱] کے راوی محمد بن اسلم طوسی (م ۲۲۶) کا امام کی صحبت میں رہنا[۲]۔

ساتویں صدی کی پہلے پچیس سالوں میں عرفا و صوفیا کی کتابوں میں امام رضاؑ کے بارے میں جو کچھ تحریر تھا اسے ہم نے یہاں بیان کیا۔ ان کتابوں کی مدد سے بعد کی صدیوں میں زیادہ تفصیل کے ساتھ امام رضاؑ کے بارے تحریر کیا گیا اور بہت سارے موضوعات زیر بحث آئے۔

یہ نکتہ ذہن نشین رہے کہ اسلامی دور کی ابتدائی صدیوں میں خراسان تصوف کا ایک بڑا مرکز رہا ہے اور اس علاقہ کے بہت سے زاہد و صوفی مشہور ہوئے ہیں[۳] لہٰذا صوفیا کی کتابوں میں امام رضاؑ کے تذکرہ پر زیادہ حیران نہیں ہونا چاہئے۔ خاندان پیامبرؐ سے انتساب کے علاوہ آپ ایسے سجایا اور محاسن کے حامل تھے جن کی بنیاد پر صوفیا نے آپ کا تذکرہ اپنے رجال کے زمرہ میں کیا ہے۔ ہم یہاں پر آپ کی بعض ایسی خصوصیات کی طرف اشارہ کریں گے جن کا تذکرہ صوفیا کی کتابوں میں آیا ہے:

۱. **زہد**: امام رضاؑ زہد اور سادہ زیستی کے لئے خاص و عام میں مشہور تھے۔ مثال کے طور آپ کے بارے میں ملتا ہے کہ:

> ابوالحسن گرمیوں میں ہمیشہ بوریا پر اور سردیوں میں بھونسا کے ایک پرت پر بیٹھتے تھے۔ آپ ہمیشہ موٹا کپڑا پہنتے تھے لیکن جب کسی سے ملنے جاتے تو اپنا سب سے اچھا لباس زیب تن کرتے تھے۔

امامؑ کی زاہدانہ زندگی صرف مدینہ تک محدود نہ تھی بلکہ آپ نے خراسان میں اور مامون کی ولی عہدی کے زمانہ میں بھی اسی طرح زندگی بسر کی۔ امامؑ خراسان میں جب بھی مامون کے ساتھ تنہا ہوتے تو اسے نصیحت کرتے تھے[۴]۔ مثلاً روایت میں ملتا ہے:

> ایک روز امام نے دیکھا کہ مامون وضو کر رہا ہے اور غلام اس کے ہاتھ پر پانی ڈال رہا ہے۔

۱۔ شریف القریشی، محمد باقر، حیاۃ الامام رضا، ص ۱۵۷

۲۔ تذکرۃ الاولیاء، ج ۱، ص ۲۳۸

۳۔ ذبیح اللہ صفا، تاریخ ادبیات در ایران ج ۱، ص ۲۵۵؛ راوندی، مرتضیٰ، تاریخ اجتماعی ایران، ج ۸، ص ۲۴۱

۴۔ شیبی، کامل مصطفیٰ، ہمبستگی میان تصوف و تشیع، ترجمہ علی اکبر شہابی، ص ۲۳۲

امامؑ نے فرمایا: کسی کو اللہ تعالی کی عبادت میں شریک نہ کرو[۱]۔

امامؑ جب مامون کے ولی عہد بنے تو آپ کے اسی زہد کے پیش نظر بعض لوگوں کو حیرت ہوئی اور انھوں نے آپ سے اس کی وجہ دریافت کی[۲]۔ان سب کے باوجود جب امام نے مامون کی ولی عہدی کو قبول کیا تو حکومت کی طاقت کی طرف توجہ نہیں دی[۳] اور امامؑ کا نماز عید کے لئے روانہ ہونا اس بات کا گواہ ہے[۴]۔

امامؑ کے اسی زہد و سادہ زیستی کی وجہ سے صوفیا نے آپ کا ذکر اپنے سلسلہ اسناد تصوف میں کیا ہے[۵] اور معروف کرخی کو آپ کا شاگرد و مرید مانا ہے[۶]۔

۲. **حسن خلق**: امامؑ کا حسن اخلاق بھی صوفیوں کے لئے کشش کا باعث تھا۔ حمام میں ایک انجان شخص سے امامؑ کے حسن سلوک نے صوفیا کو اپنی طرف متوجہ کیا اور اسی کے ذریعہ آپ کا نام صوفیا کے تذکروں میں داخل ہوا۔ اس واقعہ نے ساتویں صدی کے صوفیا کو بھی اپنی طرف مجذوب کیا ہے[۷]۔

۳. **علمی جامعیت**: امامؑ کی شخصیت کے سلسلہ میں منقول روایتوں سے آپ کی علمی جامعیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مامون نے مختلف مقاصد کے تحت مناظرے کروائے جس سے امامؑ کی علمی جامعیت اور بھی ظاہر ہوئی[۸]۔امامؑ کی علمی جامعیت کا تعلق صرف زمانہ ولی عہدی سے نہیں ہے بلکہ مدینہ میں بھی یہ بات سب پر ظاہر ہو چکی تھی اور امامؑ نے خود اس بات کا ذکر کیا ہے کہ آپ مسجد نبوی میں سوالوں کے جواب دیتے تھے۔

تصوف کی کتابوں میں منقول بعض روایتوں میں امامؑ کا نام درمیانی راوی کی حیثیت سے نقل ہوا ہے اور بلاواسطہ کوئی بات آپ سے نقل نہیں ہوئی ہے لیکن ایسی روایتوں کی بھی کمی نہیں ہے جن میں آپ کی

۱۔ اصفہانی، ابوالفرج، مقاتل الطالبیین، تحقیق سید احمد صفر، ص ۴۵۶
۲۔ صدوق، ص ۱۳۸
۳۔ شریف القرشی، ج ۱، ص ۳۴
۴۔ مفید، محمد بن محمد بن نعمان، الارشاد فی معرفۃ حجج اللہ علی العباد، ج ۲، ص ۲۶۴
۵۔ آملی سید حیدر، جامع الاسرار و منبع الانوار، ص ۲۲۴
۶۔ ہمبستگی میان تصوف و تشیع، ص ۲۳۳، طبقات الصوفیہ، ص ۸۲
۷۔ شبلنجی، مؤمن، نور الابصار فی مناقب آل بیت النبی المختار، ص ۳۰۹
۸۔ صدوق، محمد بن علی، عیون اخبار الرضا ج ۱، ص ۱۵۴-۲۰۴

جامعیت پر اذعان کیا گیا ہے اور بعض باتیں بلاواسطہ آپ سے نقل ہوئی ہیں۔ حلیۃ المتقین میں اخلاص کے سلسلہ میں آپ سے منقول روایت اس کا ایک نمونہ ہے[۱]۔

حدیث سلسلۃ الذہب کے ثبت کے دوران محمد بن اسلم طوسی (وفات ۲۲۶ ہجری) جیسے صوفیوں کا وہاں موجود رہنا اور حدیث کی سماعت کے سلسلہ میں ان لوگوں کا شوق اس بات کی تائید کرتا ہے۔

۴. **خراسان میں امامؑ کی موجودگی**: امام رضاؑ کی مرو میں موجودگی اور محمد بن اسلم طوسی جیسے بعض صوفیا کی آپ سے ملاقات اور اسی طرح امام کے مرقد کا نیشابور کے قریب ہونا جو کہ اس زمانہ میں تصوف کا ایک مرکز تھا اور سفر کے دوران مرقد امام کی زیارت اور آپ کی قبر کی مجاورت کی وجہ سے صوفیا نے اپنی کتابوں میں مختصر طور پر سہی امام کے بارے تحریر کیا ہے۔ ابن حبان بستی شافعی (م ۳۵۴) امام رضا کی قبر کی زیارت اور پریشانیوں کے حل کے لئے قبر کے پاس دعا کرنے کو مجرب مانا ہے اور انہوں نے خود اس کا تجربہ کیا ہے۔[۲]

۵. **معروف کرخی کی امام سے ملاقات**: معروف بن فیروزان مشہور بہ معروف کرخی بزرگ صوفی اور ائمہ اور صوفیوں کو جوڑنے والے آخری شخص تھے۔ ان کے بعد ائمہ اور صوفیا میں کسی طرح کے تعلق کا اظہار نہیں ملتا ہے۔ ان کی کنیت ابو محفوظ ہے اور وہ داؤد طائی (م ۱۶۵) کے مرید اور سری سقطی (م ۲۵۳) کے استاد ہیں۔ انہوں نے امامؑ کے ہاتھوں اسلام قبول کیا اور ہجویری کے قول کے مطابق امامؑ کی نظر میں بہت عزیز تھے[۳]۔ صوفیوں نے ان کے لئے بہت سارے فضائل و کرامات کئے ہیں[۴]۔ سلمی نے اپنی کتاب طبقات الصوفیہ میں پہلی بار معروف کرخی کا تذکرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ انہوں نے امام رضاؑ کے ہاتھوں اسلام قبول کیا ہے[۵]۔

۱۔ اصفہانی، حلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء، ج ۳، ص ۱۹۲
۲۔ بستی، محمد بن حبان، کتاب الثقات، ج ۸، ص ۹۳؛ کشف المحجوب، ص ۱۴۱
۳۔ کشف المحجوب، ص ۱۴۱
۴۔ تذکرۃ الاولیاء، ص ۲۶۹
۵۔ طبقات الصوفیہ، ص ۸۱

منابع ومآخذ:

- آملی، سید حیدر، جامع الاسرار ومنبع الانوار، مرکز انتشارات علمی وفرہنگی، بیروت، ۱۳۶۸
- ابن جوزی، عبد الرحمٰن بن علی، المنتظم فی تاریخ الامم والملوک ج ۱۰، تحقیق مصطفیٰ عبد القادر عطا ودیگران، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۴۱۲ق
- اربلی، علی بن عیسی، کشف الغمۃ فی معرفۃ الائمہ، جلد ۲ رضی، قم، ۱۴۲۱ق
- اشرف امامی، علی، امام رضاؑ وجریان تصوف وعرفان، ابعاد شخصیت وزندگی حضرت امام رضاؑ، مرتضی سلمان نژاد، دانشگاہ امام صادقؑ، تہران، ۱۳۹۲
- اصفہانی، ابو نعیم احمد بن عبد اللہ، حلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء، تحقیق محمد رضا شفیعی کدکنی، دار ام القراء اللطباعۃ والنشر، بی تا
- اصفہانی، ابو الفرج، مقاتل الطالبین، تحقیق سید احمد صقر، دار المعرفۃ، بیروت، بی تا
- اصفہانی، ابو نعیم احمد بن عبد اللہ، تاریخ اصبہان (ذکر اخبار اصبہان) ج ۱، تحقیق سید کسروی حسن، بیروت: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۰ق
- انصاری، عبد اللہ بن ابی منصور، طبقات الصوفیہ، تصحیح محمد سرور مولایی، توس، تہران، ۱۳۶۲
- بستی، محمد بن حبان، کتاب الثقات، جلد ۸، مجلس دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدر آباد، ۱۴۰۲ق
- بقلی شیرازی، روزبہان، عرائس البیان فی حقائق القرآن ج ۱، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۰۸م
- بونی، احمد بن علی، شمس المعارف الکبری، مؤسسہ النور للمطبوعات، بیروت، ۱۴۲۷ق
- پارسا، خواجہ محمد، فصل الخطاب، تصحیح جلیل مسگر نژاد، مرکز نشر دانشگاہی تہران، ۱۳۸۱
- پور جوادی، نصر اللہ، آسمان جان، فرہنگ معاصر، تہران، ۱۳۹۳
- جامی، نور الدین عبد الرحمٰن، شواھد النبوہ، تصحیح سید حسن امین، میر کسری، تہران، ۱۳۷۹
- حامد، امام موسی کاظمؑ واخبار اہل تصوف، معارف، ترجمہ آذر میدخت مشایخ فریدنی، ۱۳۷۲، ش ۲۹ و ۳۰
- خرگوشی، عبد الملک بن محمد، تہذیب الاسرار فی اصول التصوف، تحقیق امام سید محمد علی، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۷ق
- داداش نژاد، منصور، زندگانی دوازدہ امامؑ در کتاب شواہد النبوہ جامی، تاریخ وفرہنگ، پاییز وزمستان ۱۳۹۰، ش ۷۸۔

- داداش نژاد، منصور، سیمای دوازدہ امامؑ در میراث مکتوب اہل سنت پژوہشگاہ علوم وفرہنگ اسلامی، قم، ۱۳۹۵
- دھباشی، مہدی ودیگران، تاریخ تصوف ا، سمت، تہران، ۱۳۸۴
- ذولفقاری حسن، معروف کرخی ادب وزبان فارسی، بہار ۱۳۸۵
- سلمی، محمد بن حسین، طبقات الصوفیہ، تحقیق مصطفیٰ عبد القادر عا، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۴ق
- سلمی، محمد بن حسین، مجموعہ آثار السلمی، ج ۲، مرکز نشر دانشگاہی، تہران، ۱۳۶۹
- سوری، محمد، تصویر امامان شیعہ در متون زھد وتصوف نخستین نصر اللہ پور جوادی، رسالہ دکتری، دانشکدہ الہیات ومعارف اسلامی، دانشگاہ قم، ۱۳۹۲،
- شبلنجی، مومن، نور الابصار فی مناقب آل بیت النبی المختارؐ، شریف رضی، قم
- شریف القرشی، محمد باقر، حیاۃ الامام الرضاؑ، سعید بن جبیرہ، دوم، قم، ۱۳۸۰
- شمس، محمد جواد، دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی؛ مدخل خرگوشی، مرکز دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی، ج ۲۲، تہران
- شیبی، کامل مصطفیٰ، تشیع وتصوف تا آغاز سدہ دوازدہم ہجری، ترجمہ علیرضا ذکاوتی قراگزلو، امیر کبیر، تہران، ۱۳۸۵
- شیبی، کامل مصطفیٰ، ہمبستگی میان تصوف وتشیع، ترجمہ علی اکبر شہابی، دانشگاہ تہران، تہران، ۱۳۵۴
- صدوق، محمد بن علی، عیون اخبار الرضاؑ ج ۲، تہران، ۱۳۷۸
- صدوقی سہا، منوچہر، (نسبت سلسلہ ہا صوفیہ با ائمہ آل البیتؑ) کیہان اندیشہ، مرداد وشہریور ۱۳۷۲
- طہرانی، قاسم، معروف الکرخی تلمیذ الامام الرضاؑ واستاد العرفاء، دار المحجۃ البیضاء، بیروت، ۱۴۲۳ق
- عطار نیشاپوری، فرید، الدین، تذکرہ الاولیاء ج ۱، تصحیح رینولد آلین نیکلسون، لیدن مطبعہ لیدن، ۱۹۰۵
- غزالی، ابو حامد محمد، کیمیای سعادت جلد ۲، تحقیق حسین خدیوجم، انتشارات علمی وفرہنگی، تہران، ۱۳۸۳
- غزالی، ابو حامد محمد، احیاء علوم الدین، جلد ۲ تحقیق عبد الرحیم بن حسین حافظ عراقی، دار الکتاب العربی، بیروت

- فروزان فر، بدیع الزمان، مقدمہ رسالہ قشیریہ، ترجمہ ابو علی عثمانی، نشر علمی فرہنگی، تہران، ۱۳۷۴
- قشیری، عبد الکریم، الرسالۃ القشیرہ، تحقیق عبد الحلیم محمود و دیگران، بیدار، قم، ۱۳۷۴
- موصلی، حسین بن نصر، مناقب الابرار و محاسن الاخیار فی طبقات الصوفیہ جلد ۱، تحقیق سعید عبد التاح، دار الکتاب العلمیہ، بیروت، ۱۴۲۷ق
- میبدی، ابوالفضل رشید الدین، کشف الاسرار و عدۃ الابرار، جلد ۱ تحقیق علی اصغر حکمت، امیر کبیر، تہران، ۱۳۷۱
- ہجویری، ابوالحسن علی، کشف المحجوب، تحقیق ژوکوف فسکی و دیگران، طہوری، تہران، ۱۳۷۵

انقلاب اسلامی ایران میں سیاسی اسلام کا مفہوم

تالیف: محمد صادق جمشید راد و سید محمد رضا محمود پناہی
ترجمہ: مولانا شیخ ممتاز علی

موجودہ دور میں ہم اسلام کی متعدد تعبیریں ملاحظہ کر رہے ہیں۔ مثلاً روایتی اسلام، اسلامی رجحانات ، اسلامی تحریک، اسلامی بنیاد پرستی اور سیاسی اسلام جیسے الفاظ سے ہم روبرو ہیں جو اسلامی معاشرہ میں ایک طرح کی بیداری اور جدید آگاہی کی علامت ہے۔ اس بیداری کی جڑیں پچھلی صدی کی ساتویں دہائی میں پیوست ہیں۔ اس زمانہ میں دینی پابندی تحریک رونما ہوئی اور بہت سارے دانشور ، اسلامی بنیادوں کی طرف بازگشت اور اجتماعی زندگی میں دینی اثرات کے احیاء کی ضرورت پر زور دینے لگے۔ اس سلسلہ میں اسلام کی روایتی اور سیاسی دو طرح کی تقسیم سامنے آئی ہے۔ روایتی اسلام وہ ہے جو مختلف شرعی اور عقلی توجیہات کی بناپر ہر طرح کے سیاسی نظام سے میل کھاتا ہے۔ روایتی اسلام صدیوں پرانا ہے اور معاشرہ میں لوگ زیادہ تر اس طرح کے اسلام سے واقف ہیں۔ اس طرح کے اسلام میں حاکم اور عالم مجزا اور الگ الگ ہیں۔ حاکم دنیاوی امور کی سرپرستی کرتا ہے اور عالم اخروی کاموں میں یعنی نماز روزہ وغیرہ میں لوگوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ عالم کسی شہنشاہ یا امیر کے زیر نظر ہوتا ہے اور امیر کو دینی مشروعیت عطا کرتا ہے لیکن اس روایتی اسلام کے پہلو میں اسلام کی جدید تصویر بھی موجود ہے جس کی جڑیں اسلامی بنیادوں میں پیوست ہیں اور اس کی بازگشت اصل اسلام کی طرف ہے۔ اس طرح کے اسلام میں دین وسیاست کے درمیان کی حدیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ سیاسی اسلام میں سیاسی امور کی مرجعیت دین کی ذمہ داری ہے۔

مغربی جدیدیت کی نظر میں دین، سیاست سے جدا ہے لہٰذا سیاسی میدان میں کسی طرح کی دینی دخل اندازی ایک غلط ، منفی اور رجعت پسندانہ اقدام ہے۔ عالم اسلام پر مغرب کا ہر طرف سے حملہ اور اس سے اسلام والوں کا مقابلہ ، مغربی ماڈرن تعلیمات کی رد اور اسلامی تمدن کے احیاء اور اسلام کو سیاسی زندگی میں واپس لانے کے لئے مسلمان دانشوروں کی کوششوں کے نتیجہ میں اہل مغرب نے اسے رجعت پسندانہ عمل

اور اسلامی بنیاد پرستی قرار دیا [۱]۔ امام خمینی اس اسلام کا تعارف کراتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اسلام صرف عبادت نہیں ہے، یہ صرف عبادت والی تعلیم و تعلم نہیں ہے۔ اسلام مکمل سیاست ہے، اسلام کا غلط تعارف کرایا گیا ہے، جدید سیاست کا سرچشمہ اسلام سے پھوٹتا ہے [۲]۔

تین مختلف نظریات کے ذریعہ سیاسی اسلام کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

پہلا نظریہ، مشرق وسطیٰ میں عوام اور حکومت کے مابین پیش آنے والے بحران کے نتیجہ میں سیاسی اسلام کا ظہور ہوا۔

دوسرا نظریہ ہنٹنگٹن کا نظریہ ہے جس کے مطابق سیاسی اسلام کے ظہور کی وجہ سے تہذیبوں میں ٹکراؤ پیدا ہوگا۔ اس تعبیر میں دار الاسلام ایک طرف ہے اور یہودی و مسیحی تمدن دوسری طرف۔

تیسرے نظریہ کے مطابق سیاسی اسلام ایک معتبر جدید طاقت بن کر مثبت انداز میں تبدیلیاں پیش کرنے والا ہے اور اسلام ہی راہ حل ہے کا نعرہ ہی اصل نعرہ ہے۔ اس نظریہ میں مسلمان اسلام کو ایک مکتب فکر سمجھتے ہیں اور اسلامی ملکوں میں موجود سیکولرزم سے اسے الگ جانتے ہیں۔ یہ نعرہ ان ملکوں میں اکثر سنا جاتا ہے جہاں اسلام کے شیدائی اپنی حکومت کو جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش میں مشغول ہیں۔ اسی طرح ان ملکوں میں بھی یہ نعرہ گونجتا ہے جہاں اسلامی جماعتیں اپنے مقاصد کو وسعت دینے کے لئے موجودہ سیاسی نظام میں شرکت کر رہی ہیں۔ اس مقالہ میں آخری نظریہ کو بنیاد بنایا گیا ہے اور موجودہ ایران میں اسلامی بنیاد پر جو نظام قائم ہے اس سیاسی اسلام کو فقاہتی اسلام کے عنوان سے پیش کیا جائے گا۔

بابی سعید کا خیال ہے کہ سیاسی اسلام، اسلامی شکل وصورت کو سیاسی عمل کے قالب میں پیش کرتا ہے اور یہ مفہوم ان لوگوں کے لئے ہے جو اسلامی اصولوں کی بنیاد پر حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں، یعنی اسلامی ذہنیت کی پیدائش سے لیکر معاشرہ کی نو سازی تک کے تمام مراحل کو جو اسلامی اصول کے مطابق بنانا چاہتے ہیں، یہ نظریہ انہیں افراد کا ہے [۳]۔ اس نظریہ کے مد مقابل مغرب کا موقف نہ صرف مخالفانہ ہے بلکہ مخاصمانہ بھی ہے۔ الشہابی کے قول کے مطابق اس نظریہ کے عروج کو ایران کے اسلامی انقلاب کی کامیابی

۱۔ بھروزلک، اسلام سیاسی و اسلام گرایی معاصر، ص ۲

۲۔ امام خمینی، صحیفہ نور، ج ۱۰۷، ص ۵

۳۔ بابی سعید، ہراس بنیادین اروپامداری و ظہور اسلام گرایی، ص ۳۹

میں دیکھا جاسکتا ہے [۱]۔ اسلامی حکومت کے مرکزی مفہوم تک پہنچنے سے پہلے سیاسی اسلام کا مفہوم بڑی تبدیلیوں کا حامل رہا ہے۔ اس مقالہ میں سیاسی اسلام کی تاریخی تبدیلیوں اور فقاہتی اسلام کی خصوصیتوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

سیاسی اسلام کی تاریخ

مسلمان مفکرین نے سیاسی اسلام کی تحریک کو شروع کیا جو موجودہ دور میں خاص کرکے دو قطبی نظام کے بکھر جانے کے بعد نئے عالمی نظام کے لئے چیلنج بن چکا ہے۔ اسلام تہذیب، نظریات اور دوسرے میدانوں میں مغربی لبرل سرمایہ داری نظام کے لئے ایک بڑا چلنج بن کر سامنے آیا ہے۔ اسلام عالمی نظم و نسق، مختلف قومی، علاقائی اور عالمی سطح پر اختلافات کے حل و فصل اور بین الاقوامی تعلقات کے مستقبل کے لئے اپنا الگ نظریہ پیش کرتا ہے۔ سید جمال الدین اسد آبادی، محمد عبدہ، سید محمد رشید رضا، عبد الرحمٰن کوکبی، حسن البناء، ابو الاعلیٰ مودودی، ابوالحسن علی ندوی، سید قطب، نواب صفوی اور امام خمینی دور حاضر میں اسلامی رجحان رکھنے والے رہنما تھے۔

جمال الدین اسد آبادی (۱۸۹۷۔۱۸۲۹) غفلت اور تاریک اندیشی پر تنقید کرتے ہیں اور اس طرح وہ اصلاح پسندوں کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ محمد عبدہ (۱۸۴۹۔۱۹۰۵) بھی عالم اسلام کے زوال پذیر حالات سے رخ موڑتے نظر آتے ہیں۔ رشید رضا (متوفی ۱۹۳۵) بھی انفعال اور عدم کوشش کی وجہ سے مسلمانوں کی ملامت کرتے ہیں لیکن وہ اصلی خوبیوں کی طرف پلٹتے ہیں اور تجدد کا جدید نظریہ پیش کرتے ہیں اور غیر کی تقلید کو نا قابل قبول سمجھتے ہوئے اسے ناکافی بھی مانتے ہیں [۲]۔

جدید حالات اور سیاسی اسلام کی تاریخ کی تحقیق سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ سیاسی اسلام سیاسی کیوں ہے اور اسلامی سیاست کیوں اسلامی حکومت کی تشکیل کی کوشش کرتی ہے؟ سیاسی اسلام انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں مغربی تمدن کے بارے میں اپنے نوع نگاہ کی تبدیلی سے روبرو ہوا ہے۔ روایتی اسلام، اسلامی معاشرہ کی اقدار کی تشکیل میں زیادہ تر قدرت وحکومت کے بغیر شامل رہا ہے لیکن جب

۱۔ الشابی، سعید، ایران بین ربیع الثورات و تلوینات قوی الثورۃ المضادۃ، ص ۲

۲۔ برتران، بدیع، دو دولت: قدرت و جامعہ در غرب و سرزمین ہای اسلامی، ۸۶

اسلام مغرب اور زمانہ کی مشکلات سے روبرو ہوتا ہے تو وہ سیاسی بننے اور انسانی حیات کے ہر پہلو پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتا ہے۔

مغرب سے تعامل کا مرحلہ

اس مرحلہ میں اسلام معاصر تمدن کی ساخت میں مشارکت کررہا ہے ۔ایسا تمدن جس میں بہت سے منفی پہلو ہیں لیکن اسے سرے سے نکارا نہیں جاسکتا ہے کیوں کہ اس میں انسانی جوہر موجود ہے اور اس کے بہت سے بنیادی محور اسلام سے یا اسلام کے اس سے ملنے جلنے کی وجہ سے مشترک ہیں۔اس بنیاد پر مسلمانوں کو معاصر تمدن کے ان بہترین عناصر کو لے لینا چاہئے تھا جن کا دین سے تضاد نہیں ہے۔

مغرب کی طرف اس طرح نظر ڈالنے والی تحریکیں سید جمال الدین اسد آبادی و شیخ محمد عبدہ کے زیر اثر تھیں۔ یہ تحریکیں مغربی زمین پر مغربی نکتہ نظر سے مغرب سے روبرو تھیں۔انیسویں صدی کے نصف آخر بلکہ اس سے پہلے کے اسلامی رجحان رکھنے والوں کی نظر میں مغربی تمدن ترقی کا آئینہ دار اور دوسروں کے لئے نمونہ تھا۔ یہ تو صحیح ہے کہ اس زمانہ میں مغرب اسلام اور مسلمانوں کا دشمن تھا لیکن اس کا مقابلہ کرنے کے لئے اسی کے شیوہ اور روش کو اپنانے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔اس زمانہ میں دو باتیں مسلّم تھیں جو تمام روشن فکر اور سیاسی مسلمانوں کے ذہن و عقل پر چھاچکی تھیں:

۱۔ مغرب اور ترقی و تمدن دو مساوی چیزیں ہیں۔

۲۔ نتیجۃً مسلمانوں کے پاس مثبت یا منفی تعاون کرنے کے لئے ایک واحد راستہ ہے۔ یا تو اس جدید تمدن کو اپنا کر اس سے تعامل کیا جائے اور یہ بات ممکن نہ ہونے کی صورت میں اسے ایک ہتھیار کے طور پر مقابلہ کے لئے استعمال کیا جائے[۱]۔

اسلامی رجحان رکھنے والوں نے اسلامی موروثی ثقافت اور اس کے مسائل و رجحانات پر غور و فکر کیا۔ مغربی تمدن کے سامنے سر جھکا لینا یا مغرب کی تقلید کرنے کی کوشش کرنے کا یہ مطلب نہیں تھا کہ انہوں نے اسلام اور اسلامی ثقافت کو نظر انداز کر دیا ہے بلکہ یہ اسلامی قدروں اور تمدن جدید کی بنیادی قدروں کے درمیان تعاون اور حکومتی نظام کی سطح پر شورائے اسلامی اور مغربی ڈیموکریسی کے درمیان مشابہت کی نشان

۱۔السید، رضوان، اسلام سیاسی معاصر در کشاکش ہویت و تجدد، ص ۱۶

دہی کی کوشش تھی۔ گذشتہ صدیوں میں طبیعی علوم میں مسلمانوں کی حیرت انگیز علمی ترقی اور درمیانی صدیوں میں اسلامی معاشرہ کے حیرت انگیز علمی کارناموں سے استفادہ پر تأکید ہوتی تھی۔ ان تمام باتوں کے باوجود اسلام کا جو چہرہ سامنے آتا ہے وہ دینداری اور اخلاقی نظام کا صاف شفاف چہرہ ہے جو مغرب کے متعفن چہرہ سے بالکل الگ ہے۔

اس بنیاد پر اسلام میں ترقی کے عناصر مغربی تمدن سے زیادہ قوی ہیں لیکن مسلمانوں کی پسماندگی اور مغرب کی ترقی کا سبب یہ ہے کہ مسلمانوں نے ایسے اقدار اور دین کے بلند اصولوں کو چھوڑ دیا اور ان چھوڑی ہوئی چیزوں سے دوبارہ تمسک کے سوا ان کے پاس کوئی دوسرا چارہ کار نہیں ہے۔ دوبارہ تمسک کے ذریعہ ان کی حالت بہتر ہو سکتی تھی۔

اس نظریہ کے مطابق جن اصولوں کو مسلمانوں نے بھلا دیا در حقیقت انہیں اصولوں کو جدید مغرب نے اپنا رکھا ہے۔ مغرب کے مضبوط قدم کا راز یہی ہے۔ اسی وجہ سے محمد عبدہ کے زمانہ میں ایک جملہ رائج ہو گیا تھا جسے پہلے پہل بیان کرنے والے کا نام نہیں معلوم اور وہ یہ ہے کہ مغرب میں اسلام ہے لیکن مسلمان نہیں ہیں اور مشرق میں مسلمان ہیں مگر اسلام نہیں ہے۔ اس زمانہ میں اسلام و مسلمانوں کے بارے میں مغربی منفی افکار کا جواب دیا گیا۔ اسلام میں عقیدہ قضاء و قدر کا دفاع ہوا اور غلامی کے بارے میں اسلامی نظریات پر مبنی کتابیں تحریر کی گئیں۔ مسلمانوں کے زوال کے اسباب اور اسلام کے جاودانہ اقدار کے مباحث پر کتابیں سامنے آئیں۔ سید جمال الدین نے دھریوں اور ڈارون کے نظریات کا جواب دیا۔ محمد عبدہ نے ھانوتو، رنان اور فرح آنطون کا جواب لکھا۔ اسلام کے موقف کو واضح کرنے کے لئے اسلامی حکومت، فلسفہ، علم اور ترقی کے موضوع پر کواکبی، العظم اور رشید رضا کے کام سامنے آئے۔ عیسائیت کے مقابلہ میں، اسلام زیادہ ترقی یافتہ مذہب ہے، زندگی میں ترقی کرنے کے لئے اسلام سے دستبردار ہونے کی ضرورت نہیں ہے، جیسے موضوعات پر بہت کچھ کام ہوا کیوں کہ مسیحیت کو جدید یوروپ نے ایک گوشہ میں رکھ دیا تھا لیکن اس کے برخلاف اسلام ہمیشہ ترقی اور علم کے راستے دکھاتا رہا۔ اس کے علاوہ اسلام، عیسائیت کی طرح نہیں ہے جو افکار کو ترقی سے روک دے جیسا کہ قرون وسطیٰ میں مسیحیت نے یہ کام انجام دیا۔

پہلے مرحلہ میں اسلامی رجحان رکھنے والوں کی کوششوں کا ماحصل یہ ہے کہ اسلام بھی یورپ کی طرح تمدن و ترقی کا منادی ہے۔ سیاسی اور فوجی مشکلات کے علاوہ مسلمان اور مغرب کے درمیان کوئی اختلاف

نہیں ہے۔ (یورپ کی استعماری طاقتوں کے ذریعہ اسلامی ملکوں میں ایسی مشکل پیدا ہو گئی ہے) اس بناپر جب مسلمانوں کی سرزمین سے مغرب نکل جائے گا تو مغربی تمدن کو مسلمان خود ہی رائج کریں گے کیوں کہ یہ تمدن تو اسلام کا تقاضا اور اس کا حقیقی جوہر ہے یہاں تک کہ مسلم دیار میں یوروپی استعمار کا وجود مسلمانوں کی ترقی میں رکاوٹ کا سبب ہے کیوں کہ مسلمانوں کی پسماندگی اور اوہام میں غرق رہنے ہی میں مغرب کی مصلحت پوشیدہ ہے۔ دین اور اس کی تاریخ اس پسماندگی اور اوہام سے انکار کرتی ہے۔ پہلے مرحلہ میں سیاسی اسلام مندرجہ ذیل نکات پر تاکید کرتا ہے:

(الف) اسلام ایک کامل اور جامع دین ہے جو ہر زمانہ اور ہر جگہ کے لئے آیا ہے لیکن اسلام مغرب سے تعاون کرتے ہوئے اس کے علم و فن اور صنعت سے اسلامی معاشرہ کی ترقی میں مدد لے سکتا ہے۔

(ب) اسلامی ممالک میں اسلامی اصول واقدار کو اپنانے میں کمزور کارکردگی مسلمانوں کی پسماندگی کا سبب ہے۔

(ج) مغربی تمدن کی ترقی کے تمام عوامل اور بنیادیں اسلام میں موجود ہیں بلکہ اسلام اس سے بہتر ہے۔

(د) اسلامی معاشرہ کی محرومی اور پسماندگی کا حل، اسلام اور اس کی ترقی یافتہ تعلیمات سے رجوع کرنے میں پوشیدہ ہے۔

(ہ) مغرب میں سیکولرزم کی وجہ کلیسا کی غیر عقلی اور انحرافی تعلیم ہے نہ کہ وحی الٰہی۔

(و) اسلام انحراف سے محفوظ آسمانی کتاب کے ذریعہ مغربی تمدن سے زیادہ ترقی یافتہ تمدن کی بنیاد رکھ سکتا ہے کیوں کہ عقل و علم کے علاوہ اس کے دامن میں وحی الٰہی کا خزانہ بھی موجود ہے

(ذ) تمام امور میں شریعت کی طرف رجوع کرنا، امت اسلامی کے روشن مستقبل کا ضامن ہے۔

(ح) مغربی ممالک کے ذریعہ اسلامی ملکوں کا تجزیہ اور استعمار، مغربی تمدن کا عدالت سے دور اور ظالمانہ رویہ ہے اور مسلمانوں کے رشد و ترقی میں رکاوٹ ڈالنے کی علامت ہے۔

مغرب سے تقابل کا مرحلہ

انیسویں صدی کے آخری حصہ میں عالم اسلام میں تجدد کے نظریہ میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ اب تجدد کا مطلب مشرق کے زوال کے رد عمل میں، مغرب سے عاریت لینا نہیں ہے بلکہ اسلام کے خاص تجدد کو

مغرب کے مقابل قرار دینا ہے[۱]۔ یہ مرحلہ تنقیدی اور بنیاد کو اکھاڑ پھینکنے والا مرحلہ ہے۔ یہ حالت اس زمانہ زمانہ کے تمدن سے مسلمانوں کی ناامیدی بیان کرتی ہے۔ مختلف اجتماعی اور سیاسی میدانوں میں خاص اسلامی تمدن کا نمونہ ظاہر ہوا جن کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ طبقاتی اور قومی چیلنجوں کو اسلام صحیح نہیں سمجھتا۔ اسلام جمہوریت یا سوشل ازم نہیں ہے لیکن اجتماع اور سیاست کے باب میں وہ پوری دنیا کے سامنے ایک ایسا نمونہ پیش کرتا ہے جو سب سے الگ ہے اور مادیت اور معاصر تمدن کے شر سے بالاتر ہے۔

ابو الاعلیٰ مودودی نے چوتھی دہائی میں اعلان کیا کہ اسلام سب سے الگ ایک دین ہے جس میں ساری چیزیں پائی جاتی ہیں جو شریعتوں کی ناسخ اور تمدن کے اعتبار سے یگانہ ہے۔ خداوند عالم فرماتا ہے من لم یحکم بما انزل اللہ فاولئك هم الكافرون[۲]، لہٰذا مسئلہ پلٹ کر اپنی اصل کی طرف جاتا ہے کہ حاکم کون ہے؟ نمونہ کون ہے؟ ارادہ کرنے والا کون ہے؟ ان سوالوں کا ہم دو طرح سے جواب دے سکتے ہیں۔ پہلا جواب یہ ہے کہ ارادہ کرنے والا خدا ہے۔ ایسی صورت میں یہ نظام، نظام خدا اور اسلام وایمان ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ طاغوت کی حکومت حاکم ہے تو پھر ایسی صورت میں نظام، طاغوتی نظام ہوگا اور کفر اور گمراہی ہوگی۔ مودودی کی نظر میں اسلام اپنے پہلے اور بعد والے آئین کا ناسخ ہے، تمام قوانین سے بالاتر ہے اور دو باتوں سے خالی نہیں ہے یا تو اسلام روئے زمین پر حاکم اور مسلط ہو جائے گا یا کسی ایک علاقہ میں برتری حاصل کرکے اپنے پیروں کو مضبوط کرے گا اور پھیلنے اور چھاجانے کے لئے آمادہ ہوگا، اس کے علاوہ کوئی درمیانی صورت نہیں ہے۔ اس میں ڈیموکریسی اور لبرل ازم نہیں ہے۔ اسلام مشروطہ طلب اور نیشنلزم نہیں ہے۔ اسلام صرف اسلام ہے۔ مسلمانوں کو یہ ارادہ کرنا پڑے گا کہ وہ یا تو خالص مسلمان ہوں اور خدا کے بارے میں شرک نہ کریں یا اپنے ایمانی تقاضے کے باوجود دنیا کا مقابلہ نہ کریں اور درمیانی راستہ اختیار کریں۔ یعنی نہ تو خالص مسلمان رہیں اور نہ طاغوت بن جائیں۔ موجودہ تمدن میں طاغوت موجود ہے اور مغربی تمدن میں اپنے فتنوں اور فنون کے ذریعہ مغربی انسان پر غالب آچکا ہے اور انہیں غلامی کی طرف کھینچ چکا ہے اور اس نے مسلمانوں کے دین کو ختم کرنے کے لئے ان کی طرف بھی سیاسی پھندے پھینکے ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ مسلمان اپنا عقیدہ چھوڑ دیں، اپنی سیادت سے ہاتھ دھو بیٹھیں اور غلامی کے نظام میں داخل

۱۔ دو دولت: قدرت و جامعہ در غرب و سرزمین ہای اسلامی، ص ۸۶

۲۔ سورہ مائدہ، آیت ۴۴

ہو جائیں۔انہوں نے کبھی قانون تمدن کے نام پر تو کبھی جدید بین الاقوامی نظام کے نام پر ساری دنیا میں اپنا جال بچھانے کی کوشش کی ہے[۱]۔

اسی مرحلہ میں دوسری جنگ عظیم واقع ہوئی اور اس کے عظیم نقصانات بھگتنے پڑے، سرد جنگ شروع ہوئی اور دنیا کے ممالک سرمایہ داری اور اشتراکیت کے دو بلاک میں تقسیم ہو گئے۔اس کے ساتھ ساتھ فلسطین میں صہیونی حکومت آ گئی اور اسلامی معاشرہ میں لبرل نظام ختم ہوا۔ مغربی مفکرین کی ماڈرن تمدن پر تنقید کے ساتھ روشن فکر مسلمان جو پہلے سے ہی اپنی تحریروں میں اسلام کے لبرل اور معاصر تمدن کے برابر ہونے کی بات کرتے تھے، معاصر نظم تمدن کی تنقید کرنے لگے اور اسلام کو بلند بتانے لگے۔ مغرب کی سیاسی اور فکری ہم آہنگی سے انحراف، اسلام کو مغرب سے مانوس کرنے کی کوشش، تمام امور میں مغربی تمدن سے اسلام کی ہم آہنگی کو ثابت کرنے کی کوشش، مغربی اور مادی تمدن کے نامطلوب اثرات کی بناپر اس کے غیر انسانی اور غیر اخلاقی ہونے پر تنقید، دو عظیم جنگیں، پوری بشریت کو ہلادینے والے ایٹم بم کا استعمال، مشرق وسطیٰ میں ڈکٹیٹر اور فوجی حکومتوں کی حمایت اور کمیونزم سے مقابلہ کی خاطر عربی اسلامی لبرل نظام کے سقوط سے بے اعتنائی وغیرہ ایسے واقعات ہیں جو اسی دور میں رونما ہوئے۔

ایسی فضا میں مغرب کے متمدن اور ترقی یافتہ ہونے میں مسلمان مفکرین کو شک پیدا ہو گیا۔اسلامی تحریروں میں مارکسی ازم اور سرمایہ داری کو بے قیمت قرار دیا گیا اور جدید نظام تمدن کے لئے ایک نمونہ پیش کرکے سیاسی اور نظریاتی مقابلہ کی راہ ہموار ہوئی۔ یہ بات ان کے لئے ممکن تھی کیوں کہ ساتویں صدی عیسوی میں بھی اسلام دو بڑے مادی ڈکٹیٹر شپ (روم وایران) کا مد مقابل رہ چکا تھا اور دونوں طاقتیں دنیا پر اس وقت حکومت کر چکی تھیں، خدا کے نام سے اسلام دنیا کے سامنے ایک جدید نمونہ پیش کر سکا تھا اور ایرانی سلطنت کو ختم کر دیا تھا اور کچھ صدیوں کے مقابلہ کے بعد دوسری طاقت بھی بکھر گئی تھی۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی ۱۹۵۷ میں عربی زبان میں ایک کتاب شائع ہوئی۔ انہوں نے اس میں لوگوں کو اس بات پر متوجہ کیا کہ مغربی آئیڈیالوجی پوری دنیا منجملہ دنیائے اسلام پر چھاجانا چاہتی ہے۔ایسی صورت میں اسلامی آئیڈیالوجی ہی اس کا علاج ہے اور اس تسلط طلب آئیڈیالوجی کا مقابلہ صرف اسلام ہی کر سکتا ہے۔

۱۔ اسلام سیاسی معاصر در کشاکش ہویت و تجدد، ص ۲۰

پچاس اور ساٹھ کی دہائی میں عربی زبان میں مولانا مودودی کی کتابوں کے ترجمہ کے بعد سیاسی اسلام کی گفتگو میں حاکمیت الٰہی کے مفہوم کو خاص جگہ ملی۔ ۱۹۶۴ میں سید قطب نے معالم فی الطریق نامی کتاب میں عصری چیلنج کے مد مقابل آنے والی اسلامی ثقافت کا ذکر کیا ہے۔ سید قطب چالیس اور پچاس کی دہائی میں اسلامی رجحان رکھنے والے مصنفین خصوصاً مولانا مودودی اور مولانا ندوی کے تنقیدی میراث پر تکیہ کرتے ہوئے الٰہی حاکمیت کی آئیڈیالوجی کو اسلامی شناخت کے لئے ریڑھ کی ہڈی بتاتے ہیں اور مسلمانوں کے حالات کے بارے میں اس سوال کے ذریعہ فیصلہ ممکن جانتے ہیں کہ سیاست وحکومت و ثقافت کے میدان میں کس کی حکمرانی ہے، خدا کی یا طاغوت کی ؟ اسلام کے علاوہ جو کچھ ہے وہ جاہلیت ہے، گمراہی اور طاغوت ہے۔ خدا اس طرح کہتا ہے، قرآن ایسی باتیں کرتا ہے اور رسول خداؐ کا قول بھی یہی ہے۔ سید قطب ایک سوال کے جواب میں کہتے ہیں: ہمارا لائحہ عمل الٰہی، قرآنی اور نبوی ہے، تم بغیر کسی لائحہ عمل اور فلسفہ کے صرف طغیان اور طاغوت کی بدولت ہم پر مسلط ہوگئے ہو، ہم جلد ہی طاقت اور اقتدار حاصل کرلیں گے تب تمہیں معلوم ہوگا کہ حکومت کے لئے ہمارے پاس کیا فلسفہ اور دستور العمل موجود ہے۔ اسلامی حکومت کی طرف دعوت کی تاریخی، اجتماعی اور اقتصادی بہت ساری دلیلیں موجود ہیں۔ محمد سعید العشماوی نے اس سلسلہ میں کچھ دلیلیں نقل کی ہیں جن کا خلاصہ یہاں بیان کیا جاسکتا ہے:

۱۔ **تاریخ استعمار**: مغرب (پہلے یورپ پھر پورپ اور امریکہ) اور مشرق (مشرق وسطیٰ) کا آمنا سامنا چار سو سال قبل مسیح ہوا۔ یہ سلسلہ اسکندر کی مصر، شامات اور فارس سے جنگ تک پہونچتا ہے۔ دوسری صدی قبل مسیح میں یونانی طاقتوں پر رومن امپائر والے غالب آگئے۔ حضرت عیسیٰ کے زمانہ میں اس نزاع نے دینی شکل اختیار کرلی۔ اسلام کے ظہور اور مصر، شام، شمالی افریقہ اور فتح اندلس تک سات صدیوں یہ سلسلہ جاری رہا۔ گیارہویں صدی عیسوی سے لیکر تیرہویں صدی عیسوی تک (۱۰۹۰۔ ۱۲۹۱) مغرب اور مسلمانوں کے درمیان صلیبی جنگ چلتی رہی جس میں دونوں طرف بڑے منفی اثرات نظر آئے۔ ایشیائے صغیر، یونان اور شبہ جزیرۂ بالکان پر عثمانی ترکوں کی کامیابی تک اور پھر اٹھارویں، انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی کے اوائل تک استعماری قوتوں مثلاً برطانیہ اور فرانس کے ذریعہ اسلامی ممالک کی تقسیم تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ مسلمانوں اور قبضہ کرنے والوں کے درمیان جھڑپیں ہوئیں۔ اسلامی سرزمین کی آزادی کے لئے دو رجحانات پیدا ہوئے اول: لبرل رجحانات، جس

میں انسانی امور کے لئے جمہوریت اور برابری پر زور دیا گیا۔ دوم: اسلامی رجحان جس میں اسلامی خلافت (خاص کر ۱۹۲۴ میں مصطفیٰ کمال اتاترک کے ذریعہ خلافت ختم کردینے کے بعد) اور اسلامی حکومت قائم کرنے کی خواہش تھی۔

۲۔ **اسرائیلی حکومت کا قیام**: فلسطین کی سرزمین پر ۱۹۴۸ میں اسرائیل کا قیام ہوا جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اس حکومت کے قیام کو یہودی وعدہ الٰہی کا پورا ہونا اور مسلمان ایک سازش سمجھتے تھے۔ اسرائیلی حکومت کے قیام کو مسلمانوں نے صلیبی جنگ کی ایک نئی فصل سے تعبیر کیا اور اعراب واسرائیل کی جنگ کا سلسلہ جاری رہا۔ اعراب کی شکست کی وجہ سے مسلمانوں کا ایک گروہ اسلامی حکومت کے قیام کے بارے میں سوچنے لگا تاکہ اس طریقہ سے اسرائیل کا مقابلہ کیا جاسکے۔

۳۔ **فوجی یا نیم فوجی حکومتیں**: مغربی استعمار اور اسرائیل کی دھمکیوں کے پیش نظر زیادہ تر اسلامی ممالک، فوجی یا نیم فوجی حکومتوں کے ذریعہ چل رہے ہیں۔ اس طرح کی حکومتوں میں جمہوریت اور آزادی افکار کا نہ ہونا بھی اسلامی حکومت کے قیام کے رجحان کو بڑھاوا دیتا ہے۔

۴۔ **فساد**: اسلامی ممالک میں طاقتور انتظامیہ اور سیاسی نظام نہیں ہے جس کی وجہ سے بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں لہٰذا بعض افراد کا یہ ماننا ہے کہ اس کا علاج صرف اسلامی حکومت ہے۔

۵۔ **مغرب کا زوال**: عالم اسلام میں بہت سے افراد مغربی زوال کو سیاسی نعرہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں، اس نیت اور امید کے ساتھ کہ اگر اسلامی حکومت کے ذریعہ عالم اسلام کو اقتدار حاصل ہوا تو اسلامی تمدن دوبارہ رنگ لائے گا اور اپنی برتری ثابت کرے گا۔

۶۔ ۱۹۷۹ میں ایران میں اسلامی انقلاب کامیاب ہوا اور اسلامی حکومت کی تشکیل ہوئی اور اس کے بعد دوسرے ممالک میں بھی اسلامی حکومت قائم کرنے کی خواہش، دوبارہ سے زندہ ہوگئی۔ جب انہوں نے ایران کی جدید حکومت کو آزادی طلب تمام اسلامی تحریکوں کی حمایت کرتے دیکھا اور جب انہیں اسلامی نظام سازی کے موانع اور مشکلات پر غلبہ پاتے دیکھا تو ان کے دلوں میں یہ تڑپ مزید بڑھ گئی۔ البتہ عشماوی کی نظر میں جمہوری اسلامی اور امامت کی اسلامی حکومت صرف شیعوں کے لئے مناسب ہے نہ کہ تمام مسلمانوں کے لئے[۱]۔

۱۔ العشماوی، محمد سعید، الاسلام السیاسی، ص ۱۱۰

دوسرے مرحلہ میں سیاسی اسلام کے مندرجہ ذیل مفہوم ہیں :

الف، اسلام، بس اسلام ہے اور اسے دوسرے بشری مکاتب جیسا نہیں سمجھنا چاہئے ۔

ب: مغرب قابل اعتماد نہیں ہے اس کے تسلط سے چھٹکارہ پانے کے لئے فوجی، سیاسی، علمی، ثقافتی تمام میدانوں میں اس سے مقابلہ ہونا چاہئے۔

ج: قدیم اور جدید حکومتی نظاموں اور نمونوں کے مد مقابل حکومت اور معاشرہ کے لئے اسلام کے پاس خاص نمونے موجود ہیں۔ استعمار، استبداد، بین الاقوامی سطح پر مسلمانوں سے تعصب اور اسلام و مغربی تمدن کی ماہیت میں فرق کی بناپر اسلامی حکومت کی تشکیل ضروری ہے۔

د: عالمی سطح پر مسلمانوں کی کامیابی کے لئے ابتدا میں اسلام اور اس کے خاص نظریہ کو اسلامی علاقوں میں رائج کیا جائے اور استبدادی حکومتوں کو مٹادیا جائے۔

ہ۔ خدا کے علاوہ دوسرے کی حاکمیت طاغوت ہے، مشروعیت کے لئے ہر حکومت کا خدا و قرآن اور سنت نبوی کی طرف منسوب ہونا ضروری ہے۔

و: آئین کی وضع اور اس کا نفاذ شریعت کے مطابق ہونا چاہئے تاکہ مختلف میدانوں میں اسلام کی حقیقی ظرفیت اور اس کا تشخص دکھائی دے۔

اسلامی حکومت کا مطالبہ

اسلامی رجحان کا یہ مرحلہ پچھلی دہائیوں میں ظاہر ہوا اور اس کی دو خصوصیتیں ہیں۔ اسلام کا سیاسی رخ پوری آب و تاب کے ساتھ سامنے آیا جس کی وجہ سے یہ دین مبارزاتی جد و جہد کی حالت سے نکل کر ایسے دین میں تبدیل ہوگیا جو حکومت بنانے کا خواہاں تھا۔ مقابلہ کے مرحلہ میں اسلامی حکومت کی کلیت کی طرف دعوت دی گئی تھی اور اس مرحلہ اسلامی حکومت میں قانون گذاری، قضا اور اجرائی امور پر بحث ہوتی ہے۔ مختلف ملکوں میں اسلامی رجحان رکھنے والی جماعتیں قائم ہوئیں اور مخصوص اقتصادی اور اجتماعی لائحہ عمل پیش کرکے وہ عوام کے خیالات کو اپنی طرف کھینچ رہی ہیں۔ اس کی اصل دلیل یہ ہے کہ قدیمی اسلام، سیاسی اسلام میں بدل گیا ہے۔ ۱۹۲۴ میں ترکی میں خلافت ختم ہوگئی۔ کمال اتاترک کے طرفداروں نے خلافت کو کالعدم قرار دیکر ہزار برس کے پرانے اسلام اور حکومت کے رشتوں کو ختم کردیا۔ ان کے اس عمل سے اسلام

کو نئے سرے سے فعال وسرگرم بنانے کے عمل پر بڑا اثر اپڑا۔ اس مرحلہ میں سیاسی اسلام بڑے سخت مسائل سے دچار ہوا۔ اس مرحلہ میں یہ اہم نتیجہ نکلا کہ اسلامی سرزمین پر حقیقی اسلام کو رائج کرنے کے لئے اسلامی نظریات کے مطابق اقتدار حاصل کرنا اور حکومت قائم کرنا ضروری ہے۔ اس طرح اسلامی حکومت کی تشکیل اور شریعت کے احکام کا نفاذ جو کہ اسلامی رجحان رکھنے والوں کا اصلی مقصد تھا وہ فاسد حکومتوں کی رکاوٹوں اور مغربی ملکوں کی حمایت کی بناپر ایران کے علاوہ کسی دوسرے ملک میں مکمل طور پر کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوا۔ مشرق وسطیٰ میں عوام اور امام خمینیؒ کی کوششوں سے سیاسی اور شیعی اسلام کے عنوان سے جمہوری اسلامی کا قیام عمل میں آیا اور اس طرح صدیوں سال پرانی شیعی تمنا پوری ہو گئی۔

سیاسی اسلام میں دین سیاست سے جدا نہیں ہے اور اس کے اندر حکومت اور سیاست کے بارے میں بڑے جامع نظریات موجود ہیں اور وحی الٰہی پر بھروسہ کرنے کی وجہ سے، انسانی ذہن کی پیداور سیاسی نظریات سے برتر ہیں۔ معاشرہ کی سیاسی حالت کی توضیح اور تبیین کے لئے سیاسی اسلام، اسلامی تعبیروں سے استفادہ کرتا ہے اور اس کی نظر میں دور حاضر کے مسائل کا واحد راہ حل اسلامی حکومت کی تشکیل ہے۔ سیاسی اسلام ایک ایسا ماڈرن معاشرہ تیار کرنا چاہتا ہے جو مغربی تمدن کے مثبت نتائج سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے شر سے دور رہے[۲]۔ اسلامی رجحان رکھنے والوں کے نزدیک مسلمانوں کی سیاسی پسماندگی جدید مغربی استعمار کی دین ہے۔ وہ اسی پس منظر میں مسلمانوں کی پسماندگی کا جواب دینا چاہتے ہیں۔[۳] سیاسی اسلام کا آخری مقصد، اسلامی اصولوں پر مبنی معاشرہ کی تعمیر نو ہے اور سیاسی طاقت حاصل کرنے کے لئے اسی راستہ میں کچھ ضروری مقدمات پیش کئے جاتے ہیں۔ لبرل ازم، سوشل ازم اور شیعی فقہ کے ملنے کے بعد موجودہ ایران کے اندر سیاسی اسلام اور قدرت کے مفہوم میں کچھ اشکالات پیدا ہوئے:

الف: سیاسی لبرل اسلام: اس تحریک میں جمہوریت اور آزادی پر تاکید ہوتی ہے اور شیعی کتابوں کی لیبرل تفسیر کے ذریعہ اور اسلامی تہذیب واقدار پر مبنی جمہوری حکومت کی تشکیل کے لئے مذہب کا سہارا لیا جاتا ہے۔ مہندس مہدی بازرگان نے پہلی بار اس نظریہ کو پیش کیا۔ وہ یہ بتانا چاہتے تھے کہ علم، دین کے

۱۔ ہراس بنیادین اروپامداری وظہور اسلام گرایی، ص ۴۷
۲۔ حسینی زادہ، محمد علی، اسلام سیاسی در ایران، ص ۱۸
۳۔ روا، الیویہ، تجربہ اسلام سیاسی، ص ۲۳

ساتھ اور دینی اقدار، ماڈرن زندگی کے ساتھ سازگار ہے اور آج کے انسان کے لئے دین بہت ضروری ہے ۔ سیاسی میدان میں بھی وہ مغربی سیاست کے اثرات کی قبولیت کے ساتھ ساتھ اسلام کی ڈیموکریٹک لبرل تفسیر کی کوشش کرتے تھے[۱]۔ان کی نظر میں اسلام مکتب عمل ہے اور جدید دنیا سے اس کی مطابقت ممکن ہے۔ بازرگان دین و سیاست کے ارتباط کے قائل تھے۔ وہ زندگی، حکومت اور سیاست پر دین کے تعمیری اثرات کے قائل تھے۔ان کی نظر میں مذہب عام انسان کے روزمرہ کی رفتار معین کرتا ہے اور اس کے ذریعہ سے معاشرہ کی شکل بدلی جاسکتی ہے۔[۲]

ب: بائیں بازو کا سیاسی اسلام: یہ نظریہ اسلام کو سوشلزم سے مرکب کرنے کے درپئے تھا۔ ڈاکٹر علی شریعتی اس گروہ کے نظریہ پرداز تھے۔ وہ دینی مفاہیم کی بازگشت کے لئے نئی اور پرکشش تصویر پیش کرتے تھے۔اس سلسلہ میں وہ انقلاب، تقیہ، جہاد، امت، امامت، شہادت، انتظار وغیرہ جیسے دینی مفاہیم کو سیاسی اور اس زمانہ کے لئے کارآمد مفاہیم کی شکل میں پیش کرتے تھے۔ انہوں نے شیعہ قدیم مفاہیم کی سیاسی نوسازی کے ذریعہ اس کے سیاسی ہونے میں تعاون کیا، پھر بائیں بازو کے رجحان اور سوشلزم کے ذریعہ اسے راڈیکالیزم کے رخ پر موڑ دیا۔

ج: سیاسی فقہی اسلام: یہ امام خمینیؒ کے افکار پر مبنی اسلام ہے۔ان کی نظر میں ولایت فقیہ، روحانیت اور فقیہ شریعت کے اصلی مفسر ہیں۔اس نظریہ کے مطابق علم فقہ کا دینی قوانین کی شناخت میں اہم کردار ہے اور دین کے معتبر ماہرین فقہاء، سیاسی فقہی اسلام میں بلند مقام کے حامل ہیں اور صرف علماء شریعت کی تفسیر کرسکتے ہیں۔علماء کو حذف کردینے کے بعد اسلام کے اندر مغز نہیں رہ جائے گا اور وہ ایک انحرافی نقطہ نظر بن جائے گا۔[۳]

۱۔ اسلام سیاسی در ایران، ص ۱۹۵

۲۔ برزین، سعید، زندگی نامہ سیاسی مہندس مہدی بازرگان، ص ۶۹

۳۔ اسلام سیاسی در ایران، ۲۳۲

امام خمینیؒ کے کام کی اہمیت اس رخ سے بھی ہے کہ انہوں نے نہ صرف یہ کہ خاص طورپر پہلوی حکومت کی بلکہ دنیائے اسلام کے اندر رائج نظام کی مخالفت کی ہے۔ انہیں کی وجہ اسلامی رجحان ایک معمولی مخالفت اور سیاسی قیام سے ہٹ کر موجود نظام کے خلاف تحریک میں تبدیل ہوگیا۔[1]

فقاہتی اسلام

فقاہتی اسلام، سیاسی اسلام کی وہ تفسیر ہے جو امام خمینیؒ کی قیادت میں ایران کے اندر اسلامی قوانین پر مبنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوا۔ فقہ شیعہ کے نقطہ نظر سے صرف امام معصوم یا اس کا نمائندہ، حاکم اور قائد کے عنوان سے قابل قبول ہے اوراسے شرعی حیثیت حاصل ہے۔ نیابت خاصہ کے بعد علماء نیابت عامہ کے عنوان سے سامنے آئے۔ اس طرح عالم تشیع میں علما کو سیاسی بالادستی حاصل رہی ہے۔ شیعہ مذہب ہمیشہ سے کم وبیش سیاسی مذہب رہا ہے لیکن بیسویں صدی کے اوائل سے ایران میں اسلام اور زیادہ سیاسی ہوگیا اور سیاست میں حصہ لینے اور قانون کی شکل میں احکام شریعت کے نفاذ کا جذبہ پیداہوا۔ قومی اور بین الاقوامی سیاسی مسائل میں علماء کی دلچسپی میں مزید اضافہ اور انیسویں صدی سے سیاسی میدان میں ان کا سرگرمی سے حصہ لینا، ان کے قدیم رویہ میں تبدیلی کی علامت ہے۔ ان تبدیلیوں کی وجہ سے علماء کااثرو رسوخ بھی مضبوط ہوااور وہ منسجم ہوئے۔

قاچاری دور کے آخری زمانہ سے بعض جدید مباحث جیسے علماء کی طرف سے قانون کے اندر محدود حکومت کی بحث چھڑی۔ مثلاً آیۃاللہ نائینی نے قانون کے حدود میں حکومت (مشروطہ) کے اصول کو شیعہ عقائد کے اصولوں کے ساتھ ملانے کی کوشش کی۔ تنبیہ الملحدین میں آیت اللہ نائینی مشروطہ سلطنت کی تشکیل کے لئے علما کی جد و جہد کو مشروعیت عطا کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن جد و جہد کا جواز مقصد اور ہدف کے جواز سے وابستہ ہے۔ آیت اللہ نائینی کا نظریہ عقل و نقل پر مبنی ہے یعنی منطقی استدلال اور اسلامی روایات دونوں اس کی بنیاد ہیں[2]۔ ماڈرن نظریات اور اسلام کو قریب کرنے کی مختلف کوششیں شروع ہوئیں اور عملی طورپر بھی بہت سے بڑے علماء نے مشروطہ تحریک کی حمایت کی اور حکومت مشروطہ اور

۱۔ ہراس بنیادین اروپامداری و ظہور اسلام گرایی، ص ۱۰۴

۲۔ حائری، عبدالہادی، تشیع و مشروطیت در ایران و نقش ایرانیان مقیم عراق، ص ۲۱۶

مذہبی اصول میں میل ہوا۔آیت اللہ سید عبد اللہ بہبہانی کے نظریات اور شیعیت اور مشروطہ طلبی کی قربت کے نظریہ کی بناپر علماء کی سیاسی فکر میں تبدیلی پیداہوئی۔ قدرت مطلقہ کے ساخت کی مضبوطی، مغربی طریقہ پر نوسازی، علماء کی تضعیف اور آیت اللہ بروجردی کے انتقال کے بعد مرجع کی تعیین میں شاہ کی دخل اندازی جیسی وجوہات کی بناپر مقابلہ کی زمین ہموار ہوئی۔اس مرحلہ میں علماء نے نظریہ مشروطہ سے گذر کر رفتہ رفتہ آئین کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لیااور قانون شرع اور اسلامی نظام کی حمایت کی۔ایسے حالات میں امام خمینی نے سلطنت مشروطہ کی رد کرتے ہوئے، شیعوں کے امامت ، ولایت، حکومت اور نیابت عامہ کے اصلی نظریہ کی طرف رجوع کیااور ولایت فقیہ کا نظریہ پیش کیا۔انہوں نے باصلاحیت فقیہ کو حکومت کا حق دار ثابت کیا۔

انقلاب اور اسلامی حکومت کے مرحلہ میں پہونچ کر شیعی اسلام فقاہتی اسلام تک پہونچااور فقاہتی اسلام ایک اسلامی مملکت میں اسلامی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوگیااور دینی ڈیموکریسی کامیابی کے ساتھ رائج ہو گئی۔

فقاہتی اسلام میں دین صرف ایک عقیدہ نہیں ہے بلکہ اس کے بے پناہ پہلو ہیں اور وہ انسانی زندگی کے تمام حصوں پر محیط ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اسلام ایک ایسی جامع آئیڈیالوجی ہے جس میں انسان کی دنیا وآخرت دونوں موجود ہیں۔ زندگی کے ہر پہلوکے لئے اس میں واضح احکام اور دستور موجود ہیں[۱]۔ فقاہتی اسلام کے ماننے والوں کی نظر میں اسلام صرف عبادت کامذہب نہیں ہے بلکہ دین اجتماع اور سیاست ہے اور انسان کی انفرادی زندگی کے علاوہ اس کی نظر انسانی زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر بھی ہے۔

امام خمینیؒ کی نظر میں اسلام صرف عبادت کامذہب نہیں ہے، محض عبادتوں کی تعلیم وتعلم کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ اسلام سیاست ہے۔ دنیا کی دوسری حکومتیں بہت سے امور سے غافل ہیں لیکن اسلام کسی چیز سے غافل نہیں ہے۔انسان کے اندر موجود تمام پہلوؤں کی تربیت کاانتظام اسلام کے دامن میں موجود ہے[۲]۔ اسلام وہ مکتب فکر ہے جو مادی، معنوی، اجتماعی، انفرادی، اقتصادی وغیرہ امور میں دخیل ہے۔

۱۔ بہروزلک، غلام رضا، جہانی شدن واسلام سیاسی در ایران، ص ۳۹

۲۔امام خمینی، ولایت فقیہ، ج ۵ ،ص ۱۷

مثالی معاشرہ

عام مسلمانوں کی نظر میں اسلامی حکومت کا سب سے بڑا اور مثالی نمونہ مدینۃ النبیؐ میں ختمی مرتبت کی حکومت ہے[۱]۔ اسلام کا مثالی سیاسی معاشرہ وہ اخلاقی معاشرہ ہے جس میں خدا کے نزدیک سب برابر ہیں، برتری کا معیار تقویٰ ہے جسے خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اسی معاشرہ میں مسلمانوں کی خوشبختی اور دنیا وآخرت کی سعادت کی ضمانت ہے۔ ہمارے زمانہ میں جو مذاہب موجود ہیں، امام خمینیؒ کی نظر میں اسلام ان مذاہب کی طرح نہیں ہے۔ اسلام انسان کی ہر طرح سے تعمیر کرتا ہے۔ عقل، اخلاق اور تہذیب کے اعتبار سے اس کی تعمیر کرتا ہے، ظاہری آداب کے اعتبار سے اس کی تعمیر کرتا ہے اور اس کی زندگی کی تمام ضرورتیں پوری کرتا ہے[۲]۔

سیاسی اسلام کا جو مثالی معاشرہ ہے اس میں اسلام ایک ایسی مستغنی ثقافت کا حامل ہے جس میں دائیں اور بائیں بازو کی طرف جھکاؤ کے بغیر اور رنگ و نسل وزبان وعلاقہ کے فرق کے بغیر معاشرہ ترقی کی راہوں پر گامزن ہے اور انسان کی اعتقادی، اخلاقی اور عملی پہلوؤں کی طرف ہدایت کی جاتی ہے۔ اسلام گہوارہ سے گورتک علم حاصل کرنے کی ترغیب دلاتا ہے اور تمام جھوٹ، دھوکہ، فریب اور سازشوں کے بغیر ایک صحیح وسالم حکومت بنانے کی ہدایت کرتا ہے اور دوسرے ممالک جو ظلم وستم سے دور ایک مسالمت آمیز رابطہ کے لئے پابند عہد و پیمان ہیں، ان سے مضبوط اور برادرانہ رابطہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ اسلام بغیر کسی وابستگی کے ہر ایک کے فائدہ کی خاطر رفاہ عامہ کی غرض سے، بے کسوں اور کمزوروں کو اہمیت دیتے ہوئے ایک صحیح اور سالم اقتصاد پر یقین رکھتا ہے۔ کاشتکاری اور صنعت وتجارت میں اضافہ کے لئے کوشش کرتا ہے۔ فوجی شعبوں میں، جن لوگوں میں ملک کے دفاع کی صلاحیت ہے ان تمام افراد کو اضطراری صورت حال سے نپٹنے کے لئے فوجی ٹریننگ دیتا ہے۔ ایسے موقع کے لئے اختیاری طور پر دفاع کی کوششوں میں شامل ہونے کی چھوٹ رکھنے والوں پر بھی دفاع کو لازمی قرار دیتا ہے۔ سرحدوں کی حفاظت، شہر کے نظم ونسق کی درستگی، راستوں کے تحفظ اور نظم وضبط کے بچاؤ کی خاطر عام حالات میں دفاع کے لئے وہ مومن افراد کی تربیت

۱۔ فیرحی، داود، نظام سیاسی ودولت در اسلام، ص ۳۱
۲۔ امام خمینی، صحیفہ نور، ج ۳، ص ۳

کرتا ہے[۱] لہٰذا امام خمینیؒ کے نقطہ نظر کے مطابق انسانیت کے تحقق کے لئے تمام انسانی امور میں اسلام مرجعیت کا حامل ہے۔

اسلامی معاشرہ میں کسی پر ظلم نہیں ہوتا اور عدالت قائم ہوتی ہے۔ ماضی میں مدینہ کے اندر پیغمبرؐ کی حکومت اور آئندہ منجی موعود کی حکومت اس نمونہ کی بہترین مثال ہے۔ امام خمینیؒ کی نظر میں اسلامی حکومت کے قیام کا مقصد عدالت قائم کرنا ہے[۲]۔ آپ کی نظر میں اسلامی اور غیر اسلامی حکومت میں فرق یہ ہے کہ اسلامی حکومت میں اوپر سے نیچے تک کہیں بھی ظلم نہ ہونے پائے[۳]۔ ایسے معاشرہ میں فضیلت کا معیار نہ ثروت ہے اور نہ جاہ و مقام حتی علم و دانش بھی فضیلت کا معیار نہیں ہے۔ اگر کچھ معیار ہے تو وہ تقوائے الٰہی ہے۔ ایسے معاشرہ میں حاکم کوئی مذہبی اور اللہ والا ہوگا یعنی فرمان روائی کی بے پناہ عام صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اسے یہ بھی ثابت کرنا پڑے گا کہ خدا کی خاص تائید اور اس کا تقرب اسے حاصل ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ غیبت امامؑ کے زمانہ میں اس کے اندر ایسی معنوی صلاحیت ہو کہ وہ ان کا جانشین بننے کے قابل ہو۔ اس بنا پر دنیا کے دوسرے ادیان کے برخلاف اسلام میں دین و دنیا کا راستہ ایک ہی ہے، سب سے زیادہ دینی صلاحیت رکھنے والے افراد دنیا کے سب سے بڑے عہدے پر فائز ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر ایک اسلامی سیاسی معاشرہ تمام سیاسی اقتصادی کاموں کا مرجع اور مبنی ہوتا ہے۔ ایسے معاشرہ کی تشکیل کا مقصد انسانوں کے درمیان عدالت کا قیام ہے اور اس کے لئے تمام امور کو ان فرامین الٰہی پر منطبق کرنا پڑے گا جو وحی کے ذریعے ہم تک پہونچے ہیں۔

امام خمینیؒ کی نظر میں دوسری حکومتوں میں عوام کے نمائندے یا شہنشاہ قانون ساز ہوتا ہے لیکن اسلام میں مقنّنہ اور تشریع کے اختیارات خدا سے مخصوص ہیں، صرف اور صرف شارع مقدس قانون ساز ہے، کسی دوسرے کو قانون بنانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ حاکم شرع کے علاوہ کسی دوسرے کے ذریعہ قانون کا نفاذ بھی نہیں ہو سکتا۔ امام خمینی کی نظر میں اسلامی حکومت کے اندر مجلس (پارلیمنٹ) کا مخصوص کام احکام

۱۔ صحیفہ نور، ج ۹، ص ۹۲
۲۔ ایضاً، ص ۲۰۴
۳۔ ایضاً، ج ۱۱، ص ۱۳۶

اسلامی کی روشنی میں وزارتوں کے لئے لائحہ عمل (پروگرام) تیار کرنا ہے۔ وہ اس پروگرام کے ذریعہ پورے ملک میں عوامی خدمات کی کیفیت معین کرتی ہے۔[1]

منابع و مآخذ

❖قرآن کریم

❖ابراہامیان، یرواند، ایران بین دو انقلاب، مترجمین، احمد گل محمدی و محمد ابراہیم فتاحی، تہران، ۱۳۷۹

❖آر، کدی، نیکی، ریشہ ہای انقلاب ایران، عبدالرحیم گواہی، دفتر نشر فرہنگ اسلامی، تہران، ۱۳۷۵

❖برزین، سعید، زندگی نامہ سیاسی مہندس مہدی بازرگان، تہران، ۱۳۷۴

❖برتران بدیع، دو دولت: قدرت وجامعہ در غرب وسرزمین ہای اسلامی، مترجم احمد نقیب زادہ، مرکز بازشناسی آثار اسلام وایران (انتشارات باز)، تہران، ۱۳۸۰

❖بشیریہ، حسین، موانع توسعہ سیاسی در ایران، تہران، نشر نو، ۱۳۸۰

❖بہروزلک، غلام رضا، جہانی شدن واسلام سیاسی در ایران، پژوہشگاہ فرہنگ واندیشہ اسلامی، تہران، ۱۳۸۶

❖بہروزلک، غلام رضا، اسلام سیاسی واسلام گرایی معاصر، پگاہ حوزہ، شمارہ ۲۰۹، خرداد ۱۳۸۶

❖پارسا، حمید، حدیث پیمانہ: پژوہشی در انقلاب اسلامی، دفتر نشر وپخش معارف، قم، ۱۳۸۰

❖حائری، عبدالہادی، تشیع ومشروطیت در ایران ونقش ایرانیان مقیم عراق، تہران ۱۳۶۴

❖حسینی زادہ، محمد علی، اسلام سیاسی در ایران، دانشگاہ مفید، قم، ۱۳۸۶

❖امام خمینیؒ، صحیفۂ نور، انتشارات سازمان مدارک فرہنگ انقلاب اسلامی، ۱۳۶۹

❖امام خمینیؒ، ولایت فقیہ، عروج، تہران، ۱۳۷۷

❖رواِلیویہ، تجربۂ اسلام سیاسی، مرکز انتشارات بین المللی صدرا، تہران، ۱۳۷۸

❖سعید، بابی، ہراس بنیادین اروپامداری وظہور اسلام گرایی، مترجمان، غلام رضا جمشیدی ہا وموسی عنبری، دانشگاہ تہران، تہران، ۱۳۷۹

۱۔ ولایت فقیہ، ص ۳۵

❖السید رضوان ، اسلام سیاسی معاصر در کشاکش ہویت و تجدد، مترجم مجیدی مرادی ، مرکز بازشناسی اسلام و ایران، تہران، ۱۳۸۳

❖سیسک ، تیموتی ، اسلام ودموکراسی : دین، سیاست وقدرت در خاور میانہ، مترجمین، شعبان علی بہرامپور وحسن محدثی، نشرنی، تہران،۱۳۷۹

❖الشابی؛د۔سعید، ایران بین الثورات و تلوینات قوی الثورہ المضادة، لندن: القدس العربی ،۲۰۱۱

❖ گراھام فولر، اسلام نیرو بی برای تغییر، لوموند دیپلماتیک،۱۹۹۹

❖العشماوی، محمد سعید، نظام سیاسی ودولت دراسلام، سمت، تہران ،۱۹۹۶

❖فیرحی، داود، نظام سیاسی ودولت دراسلام، سمت، تہران ،۱۳۸۲

❖ محمود پناھی، سید محمد رضا، چالش ھای اسلام سیاسی وغرب، مرکز اسناد انقلاب اسلامی، تہران،۱۳۸۹

❖ مجموعہ قوانین مجد، قانون اساسی جمہوری اسلامی ایران بہ بکوشش عباس حسینی نیکر، تہران،۱۳۷۷

❖ مطہری، مرتضٰی، اسلام ومقتضیات زمان، جلد اول؛انتشارات صدرا، تہران، ۱۳۷۳

❖ میراحمدی، منصور، اسلام ودموکراسی مشورتی؛ نشرنی، تہران، ۱۳۸۴

قرآن میں صالح خواتین

مصنف: ڈاکٹر محمد مہدی مرادی خلج
مترجم: مولانا ڈاکٹر گلزار احمد خان

قرآن کریم کی ۶۳ آیتوں میں صالح خواتین کا تذکرہ ہوا ہے جن میں نو خواتین کا ذکر ملتا ہے اور زوجۂ فرعون کے علاوہ باقی خواتین انبیاء کے خاندان سے تھیں یعنی انبیا کی دادی، ماں، بہن اور بیٹی۔ حضرت موسی کے تعلق سے پانچ عورتوں کا تذکرہ ملتا ہے جن میں جناب موسی کی ماں اور بہن، فرعون کی زوجہ اور جناب موسی کی زوجہ اور ان کی بہن (دختران شعیب) شامل ہیں۔ دوسری چار عورتوں میں ابراہیم پیغمبر کی زوجہ (جناب اسحاق کی والدہ)، جناب زکریا کی زوجہ (جناب یحیٰ کی والدہ)، جناب عمران کی زوجہ (جناب مریم کی والدہ اور حضرت عیسی کی دادی) اور حضرت مریم (حضرت عیسی کی والدہ) شامل ہیں۔ ان میں صرف جناب مریم کا تذکرہ نام کے ساتھ ہوا ہے اور دوسری عورتوں کا تذکرہ ان کے نام کے بغیر ہوا ہے۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر خواتین کا تذکرہ ہوا ہے جن میں سے ایک تہائی آیتیں صالح خواتین سے متعلق ہیں۔ اس مقالہ میں پیغمبروں کی تربیت اور پرورش میں ان خواتین کے کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

قرآن کریم جس دور میں نازل ہوا، اس دور کے معاشرہ میں مردوں کی بالادستی تھی اور عورتیں پست اور ذلیل تصور کی جاتی تھیں، اسی وجہ سے لڑکی کی پیدائش کو بہت ہی معیوب سمجھا جاتا تھا۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِالْأُنثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ۔ ترجمہ: اور جب خود ان میں سے کسی کو لڑکی کی بشارت دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ خون کے گھونٹ پینے لگتا ہے۔[1]

۱۔ سورہ نحل، آیت ۵۸

وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمَٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ۔ ترجمہ:
اور جب ان میں سے کسی کو اسی لڑکی کی بشارت دی جاتی ہے جو مثال انہوں نے رحمان کے لئے بیان کی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور غصہّ کے گھونٹ پینے لگتا ہے۔[1]

قرآن نے ایسے تہذیبی ماحول میں اعتدال کو نظر میں رکھتے ہوئے دو طرح کی عورتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ایک زنان صالح اور دوسری زنان طالح۔ قرآن کریم کی ۱۹۶ آیتوں میں عورتوں کا تذکرہ ہوا ہے جن میں یہ موضوعات شامل ہیں: خواتین سے متعلق احکام، عورت کی خلقت، خواتین کے حقوق، بہشتی عورتیں، زنان اہل کتاب، زنان مستضعف، پیغمبر اسلام اور دوسرے انبیا کی ازواج، زن و مرد کا باہمی تقابل، مختلف امتوں میں لڑکی کی منزلت، تعدد زوجات، عورت اور مرد کا آپسی تعلق، ہمسر داری، عورتوں کا طلب معاش اور صالح اور غیر صالح خواتین کے کچھ نمونوں کا تذکرہ۔ ان آیات میں نساء، امراۃ، ام، مؤمنات، صالحات، انثی، بنات، زوجہ، اخت وغیرہ الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ صالح اور طالح عورتوں سے متعلق کل ۷۴ آیتیں ہیں جن میں سے ۱۱ آیتیں طالح عورتوں اور ۶۳ آیتیں صالح عورتوں کے لئے ہیں۔ ان دونوں قسم کی آیتوں میں نقطہ اشتراک یہ ہے کہ دونوں کا پیغمبروں سے تعلق ہے۔ جناب نوح اور لوط کی بیوی، عزیز مصر کی بیوی اور ابولہب کی بیوی کا تذکرہ زنان طالح کے ذیل میں ہوا ہے۔ زنان صالح سے متعلق آیتوں میں نو خواتین شامل ہیں: جناب ابراہیم کی زوجہ، جناب موسی کی والدہ اور بہن، فرعون کی زوجہ، جناب شعیب کی بیٹیاں، جناب عمران کی زوجہ (جناب مریم کی والدہ)، جناب مریم، جناب زکریا کی زوجہ (جناب یحییٰ کی والدہ اور جناب مریم کی خالہ)

صالح عورتوں سے مرتبط آیتیں پانچ پیغمبروں سے متعلق ہیں اور سب سے زیادہ حضرت موسی (جناب موسی کی ماں اور بہن، فرعون کی زوجہ اور جناب شعیب کی بیٹیوں) کے تعلق سے ہیں۔ ۳۶ آیتوں میں جناب مریم کا تذکرہ ہوا ہے اور زوجہ فرعون اور عمران کی زوجہ کا دو آیتوں میں ذکر ہوا ہے۔ جناب موسی کی والدہ کے سلسلہ میں نو آیتیں، شعیب کی بیٹیوں کے لئے آٹھ آیتیں، جناب ابراہیم کی زوجہ کے لئے پانچ آیتیں، جناب زکریا کی زوجہ کے لئے چار آیتیں اور جناب موسی کی بہن کے لئے تین آیتیں ہیں۔ اس

۱۔ سورہ زخرف، آیت ۱۷

نکتہ کی طرف توجہ ضروری ہے کہ بعض آیتوں میں ایک سے زیادہ خواتین کا تذکرہ ہوا ہے۔ مثال کے طور پر خواہر موسیٰ کا تذکرہ، جناب موسیٰ کی والدہ کے ضمن میں ہوا ہے۔ جناب مریم سے متعلق آیتوں میں ان کو محور بنایا گیا ہے اور انہیں کے ذریعہ ان کے بیٹے جناب عیسیٰ کا تذکرہ ہوا ہے جب کہ دوسری خواتین سے متعلق آیتوں میں ان کا تذکرہ مردوں کے تذکرے کے ذیل میں ہوا ہے۔ ہم یہاں تاریخی ترتیب کو مد نظر رکھتے ہوئے ان خواتین کا مختصر تعارف پیش کرتے ہیں:

جناب ابراہیم کی زوجہ

سورہ ہود کی آیت نمبر ۷۱-۷۳ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَامْرَأَتُهُ قَائِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنَاهَا بِإِسْحَاقَ وَمِن وَرَاءِ إِسْحَاقَ يَعْقُوبَ ﴿۷۱﴾ قَالَتْ يَا وَيْلَتَىٰ أَأَلِدُ وَأَنَا عَجُوزٌ وَهَٰذَا بَعْلِي شَيْخًا إِنَّ هَٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيبٌ ﴿۷۲﴾ قَالُوا أَتَعْجَبِينَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ رَحْمَتُ اللَّهِ وَبَرَكَاتُهُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ إِنَّهُ حَمِيدٌ مَّجِيدٌ- ترجمہ: ابراہیم کی زوجہ اسی جگہ کھڑی تھیں یہ سن کر ہنس پڑیں تو ہم نے انہیں اسحاق کی بشارت دے دی اور اسحاق کے بعد پھر یعقوب کی بشارت دی۔ تو انہوں نے کہا کہ یہ مصیبت اب میرے یہاں بچہ ہوگا جب کہ میں بھی بوڑھی ہوں اور میرے میاں بھی بوڑھے ہیں یہ تو بالکل عجیب سی بات ہے۔ فرشتوں نے کہا کہ کیا تمہیں حکم الٰہی میں تعجب ہو رہا ہے۔ اللہ کی رحمت اور برکت تم گھر والوں پر ہے۔ وہ قابلِ حمد اور صاحب مجد و بزرگی ہے۔

سورہ ذاریات کی آیت نمبر ۲۹ اور ۳۰ میں ارشاد ہوتا ہے:

فَأَقْبَلَتِ امْرَأَتُهُ فِي صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوزٌ عَقِيمٌ ﴿۲۹﴾ قَالُوا كَذَٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ إِنَّهُ هُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ - ترجمہ: یہ سن کر ان کی زوجہ شور مچاتی ہوئی آئیں اور انہوں نے منہ پیٹ لیا کہ میں بڑھیا بانجھ (یہ کیا بات ہے)۔ ان لوگوں نے کہا یہ ایسا ہی ہوگا یہ تمہارے پروردگار کا ارشاد ہے۔ وہ بڑی حکمت والا اور ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

ان آیتوں میں جناب ابراہیم کی زوجہ کو اسحاق کی پیدائش کی خوشخبری سنائی جا رہی ہے۔ ان آیتوں کے مطالعہ سے دو بات سمجھ میں آتی ہے، بانجھ ہونے کے باوجود جناب ابراہیم کی زوجہ کو بیٹے کی خوشخبری دینا اور دوسرے جناب ابراہیم کی زوجہ کا اس بات پر یقین و اعتماد۔ روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ جناب ابراہیم کی

زوجہ ان کی چچیری یا خالہ زاد بہن تھیں[۱] اور ان کا نام سارہ تھا[۲]۔ دونوں آیتوں میں پہلے مہمان کی شکل میں جناب ابراہیم پر فرشتوں کے نزول کا تذکرہ ہے۔ جناب ابراہیم نے اپنے مہمانوں کے لئے جنہیں وہ پہنچانتے نہیں تھے، بھیڑ ذبح کیا۔ فرشتوں نے کھانا کھانے سے انکار کیا جس سے جناب ابراہیم پر خوف طاری ہوا اور پھر فرشتوں نے اپنا تعارف کرایا اور اپنے مقصد سے انہیں آگاہ کیا اور بیٹے کی بشارت دی۔

جناب ابراہیم اور ان کی زوجہ کی ظاہری حالت اس بشارت کے متناسب نہ تھی کیونکہ جناب سارہ بوڑھی ہو چکی تھیں اور ان کے شوہر جناب ابراہیم بھی بوڑھے تھے (أَنَا عَجُوزٌ وَهَٰذَا بَعْلِي شَيْخًا) اور جناب سارہ اس خوشخبری کو سن کر حیران ہوئیں (إِنَّ هَٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيبٌ)۔ جناب سارہ نے اس خوشخبری کو سن کر بلند آواز سے یا ویلتی کہا اور اپنا منہ پیٹ لیا۔

جناب ابراہیم اور سارہ اس وقت کتنے برس کے تھے، اس بارے میں مورخین میں اختلاف نظر پایا جاتا ہے۔ ابوالفتوح رازی نے محمد بن اسحاق اور مجاہد سے نقل کیا ہے کہ سارہ ۹۲ یا ۹۳ سال کی تھیں اور جناب ابراہیم ۱۰۰ سال کے تھے۔[۳] تفسیر مجمع البیان نے سارہ کے لئے ۹۸ اور ۹۹ سال اور جناب ابراہیم کے لئے ۹۹، ۱۰۰ اور ۱۲۰ سال نقل کیا ہے۔ منہج الصادقین کی چوتھی جلد صفحہ نمبر ۴۳۸ پر سارہ کو ۹۰ اور ۹۹ سال کا اور جناب ابراہیم کو ۱۰۰، ۱۱۲ اور ۱۲۰ سال کا بتایا گیا ہے۔ علامہ طباطبائی نے اپنی تفسیر میں اس سلسلہ میں کچھ نہیں لکھا ہے۔

مادر موسی

جناب موسی کی والدہ کا تذکرہ مندرجہ ذیل آیتوں میں موجود ہے:

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً أُخْرَىٰ- إِذْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّكَ مَا يُوحَىٰ ﴿۳۸﴾ أَنِ اقْذِفِيهِ فِي التَّابُوتِ فَاقْذِفِيهِ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَأْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّي وَعَدُوٌّ لَّهُ ۚ وَأَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّي وَلِتُصْنَعَ عَلَىٰ عَيْنِي ﴿۳۹﴾ إِذْ تَمْشِي أُخْتُكَ فَتَقُولُ هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ مَن يَكْفُلُهُ ۖ فَرَجَعْنَاكَ

۱۔ کاشانی، موسی فتح اللہ، منہج الصادقین فی الزام المخالفین، ج ۴، ص ۴۳۹؛ طبرسی، ابو علی الفضل بن الحسن، مجمع البیان، ج ۱۲، ص ۹۱

۲۔ رازی، ابوالفتوح، روض الجنان و روح الجنان فی تفسیر القرآن، ج ۱۰، ص ۳۰۴؛ مجمع البیان، ج ۱۲، ص ۹۱؛ منہج الصادقین فی الزام المخالفین، ج ۴، ص ۴۳۸؛ طباطبائی، محمد حسین، المیزان، ج ۲۰، ص ۲۰۵؛ نجار، عبدالوہاب، قصص الانبیاء، ص ۱۱۰

۳۔ روض الجنان و روح الجنان فی تفسیر القرآن، ج ۱، ص ۳۰۵-۳۰۶

إِلَىٰ أُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ۚ وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنَاكَ مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنَّاكَ فُتُونًا ۚ فَلَبِثْتَ سِنِينَ فِي أَهْلِ مَدْيَنَ ثُمَّ جِئْتَ عَلَىٰ قَدَرٍ يَا مُوسَىٰ۔ ترجمہ: اور ہم نے تم پر ایک اور احسان کیا ہے۔ جب ہم نے تمہاری ماں کی طرف ایک خاص وحی کی کہ اپنے بچہ کو صندوق میں رکھ دو اور پھر صندوق کو دریا کے حوالے کر دو۔ موجیں اسے ساحل پر ڈال دیں گی اور ایک ایسا شخص اسے اٹھالے گا جو میرا بھی دشمن ہے اور موسیٰ کا بھی دشمن ہے اور ہم نے تم پر اپنی محبت کا عکس ڈال دیا تاکہ تمہیں ہماری نگرانی میں پالا جائے۔ اس وقت کو یاد کرو جب تمہاری بہن جارہی تھیں کہ فرعون سے کہیں کہ کیا میں کسی ایسے کا پتہ بتاؤں جو اس کی کفالت کرسکے اور اس طرح ہم نے تم کو تمہاری ماں کی طرف پلٹا دیا تاکہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں اور وہ رنجیدہ نہ ہوں اور تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا تو ہم نے تمہیں غم سے نجات دے دی اور تمہارا باقاعدہ امتحان لے لیا پھر تم اہل مدین میں کئی برس تک رہے اس کے بعد تم ایک منزل پر آ گئے اے موسیٰ۔[1]

❁

وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّ مُوسَىٰ أَنْ أَرْضِعِيهِ ۖ فَإِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَأَلْقِيهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِي وَلَا تَحْزَنِي ۖ إِنَّا رَادُّوهُ إِلَيْكِ وَجَاعِلُوهُ مِنَ الْمُرْسَلِينَ ۔ترجمہ: اور ہم نے مادر موسیٰ کی طرف وحی کی کہ اپنے بچّہ کو دودھ پلاؤ اور اس کے بعد جب اس کی زندگی کا خوف پیدا ہو تو اسے دریا میں ڈال دو اور بالکل ڈرو نہیں اور پریشان نہ ہو کہ ہم اسے تمہاری طرف پلٹا دینے والے اور اسے مرسلین میں سے قرار دینے والے ہیں۔[2]

وَأَصْبَحَ فُؤَادُ أُمِّ مُوسَىٰ فَارِغًا ۖ إِن كَادَتْ لَتُبْدِي بِهِ لَوْلَا أَن رَّبَطْنَا عَلَىٰ قَلْبِهَا لِتَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ۔ وَقَالَتْ لِأُخْتِهِ قُصِّيهِ فَبَصُرَتْ بِهِ عَن جُنُبٍ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿۱۱﴾ وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِن قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ أَهْلِ بَيْتٍ يَكْفُلُونَهُ لَكُمْ وَهُمْ لَهُ نَاصِحُونَ ﴿۱۲﴾ فَرَدَدْنَاهُ إِلَىٰ أُمِّهِ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ وَلِتَعْلَمَ أَنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ۔ترجمہ: اور موسیٰ کی ماں کا دل بالکل خالی ہو گیا کہ قریب تھا کہ وہ اس راز کو

۱۔ سورہ طہٰ، آیت نمبر ۳۷-۴۰

۲۔ سورہ قصص، آیت نمبر ۷

فاش کر دیتیں، اگر ہم ان کے دل کو مطمئن نہ بنا دیتے تاکہ وہ ایمان لانے والوں میں شامل ہو جائیں۔ اور انہوں نے ان کی بہن سے کہا کہ تم بھی ان کا پیچھا کرو تو انہوں نے دور سے موسٰی کو دیکھا جب کہ ان لوگوں کو اس کا احساس بھی نہیں تھا۔ اور ہم نے موسٰی پر دودھ پلانے والیوں کا دودھ پہلے ہی سے حرام کر دیا تو موسٰی کی بہن نے کہا کہ کیا میں تمہیں ایسے گھر والوں کا پتہ بتاؤں جو اس کی کفالت کر سکیں اور وہ اس کے خیر خواہ بھی ہوں۔ پھر ہم نے موسٰی کو ان کی ماں کی طرف پلٹا دیا تاکہ ان کی آنکھ ٹھنڈی ہو جائے اور وہ پریشان نہ رہیں اور انہیں معلوم ہو جائے کہ اللہ کا وعدہ بہر حال سچّا ہے اگرچہ لوگوں کی اکثریت اسے نہیں جانتی ہے۔[1]

ان آیتوں میں جناب موسی کی والدہ پر نزول وحی کا تذکرہ ہوا ہے۔ یہ وحی اس وحی سے مختلف ہے جو پیغمبروں سے مخصوص ہے[2]، اور غریزی وحی بھی نہیں ہے جس میں غیر انسان بھی شامل ہیں[3] بلکہ خفیہ اشارہ کے معنی میں ہے جس کا تذکرہ سورہ مریم کی گیارہویں آیت میں ہوا ہے[4] یا الہام کے معنی میں ہے جس کا تذکرہ اس سورہ میں ہوا ہے اور یہ الہام، عام الہام نہیں ہے کیونکہ جناب موسی کی پیدائش اور پرورش اس بات کی علامت ہے کہ اللہ تعالی یہ چاہتا ہے کہ مستکبرین پر مستضعفین کا غلبہ ہو جائے۔[5]

۱۔ سورہ قصص آیت ۱۰ سے ۱۳

۲۔ وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِّتُنذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيهِ ۚ فَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ۔ ترجمہ: اور ہم نے اسی طرح آپ کی طرف عربی زبان میں قرآن کی وحی بھیجی تاکہ آپ مکہ اور اس کے اطراف والوں کو ڈرائیں اور اس دن سے ڈرائیں جس دن سب کو جمع کیا جائے گا اور اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے اس دن ایک گروہ جنّت میں ہوگا اور ایک جہنم میں ہوگا۔ (سورہ شوری، آیت ۷)

۳۔ وَأَوْحَىٰ رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنِ اتَّخِذِي مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا وَمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُونَ۔ ترجمہ: اور تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کو اشارہ دیا کہ پہاڑوں اور درختوں اور گھروں کی بلندیوں میں اپنے گھر بنائے۔ (سورہ نحل، آیت ۶۸)

۴۔ فَخَرَجَ عَلَىٰ قَوْمِهِ مِنَ الْمِحْرَابِ فَأَوْحَىٰ إِلَيْهِمْ أَن سَبِّحُوا بُكْرَةً وَعَشِيًّا ۔ ترجمہ: اس کے بعد زکریا محرابِ عبادت سے قوم کی طرف نکلے اور انہیں اشارہ کیا کہ صبح و شام اپنے پروردگار کی تسبیح کرتے رہو ۔ (سورہ مریم، آیت ۱۱)

۵۔ وَنُرِيدُ أَن نَّمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ۔ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا مِنْهُم مَّا كَانُوا يَحْذَرُونَ۔ ترجمہ: اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ جن لوگوں کو زمین میں کمزور بنا دیا گیا ہے ان پر احسان کریں اور انہیں لوگوں کا پیشوا بنائیں اور زمین کا وارث قرار دیدیں۔ اور انہی کو روئے زمین کا اقتدار دیں اور فرعون وہامان اور ان کے لشکروں کو ان ہی کمزوروں کے ہاتھوں سے وہ منظر دکھلائیں جس سے یہ ڈر رہے ہیں۔ (سورہ قصص، آیت ۵-۶)

اس وحی الہامی کی بنیاد پر مادر موسی پر فرض تھا کہ جب تک ان کے بیٹے کو کوئی خطرہ نہیں ہے، اسے شیر پلائیں اور احساس خطر کے بعد اپنے فرزند کو صندوق میں رکھ کر دریائے نیل کے سپرد کردیں اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اسی الہام کی وجہ سے مادر موسی نے نہ صرف یہ کہ اپنی حاملگی کو مخفی رکھا بلکہ موسی کی پیدائش کے بعد بھی کسی کو اس بات کا پتہ نہیں چلا۔ ان آیات میں جناب موسی کے والد کا تذکرہ نہیں ہوا ہے جس سے مادر موسی کی منزلت اور زیادہ آشکار ہوتی ہے۔ توریت کے سفر خروج میں بعض دائیوں کے تذکرہ موجود ہیں جنہوں نے بنی اسرائیل کے لڑکوں کو دریائے نیل میں ڈالنے سے انکار کیا جن میں سے دو کے نام شفرہ اور فوعہ تھے۔[1]

جناب موسی کی والدہ نے اپنے بیٹے کو ایک ٹوکری میں رکھ کر دریائے نیل کے سپرد کردیا اور اپنی بیٹی سے کہا کہ دور سے اپنے بھائی کا دھیان رکھیں۔ توریت میں اس داستان کو دوسرے طریقہ سے بیان کیا گیا ہے۔ اس روایت کے مطابق جناب موسی کی والدہ لاوی کی بیٹی تھیں۔ جب موسی کی ولادت ہوئی تو انہوں نے تین مہینہ تک اپنے بیٹے کو چھپا کر رکھا لیکن اس سے زیادہ انہیں چھپا نہیں سکیں لہٰذا انہوں نے ایک ٹوکری بنائی اور اپنے بیٹے کو اس میں رکھ کر دریائے نیل کے حوالہ کردیا۔ جناب موسی کی بہن دور سے دیکھ رہی تھیں کہ ان کے ساتھ کیا پیش آتا ہے۔ فرعون کی بیٹی وہاں موجود تھی۔ اس کی دو کنیزیں اس کے پاس تھیں۔ اچانک اس کی نظر اس ٹوکری پر پڑی۔ اس نے ایک کنیز کو حکم دیا کہ اسے کنارے پر لائے۔ توریت میں جناب موسی کے بچانے میں زیادہ تر فرعون کی بیٹی کا نام لیا گیا ہے[2]۔

موسی کی پرورش کے سلسلہ میں ان کی والدہ کا آخری اقدام ان کی کفالت تھا جسے سورہ طہ میں یکفلہ اور سورہ قصص میں یکفلونہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مادر موسی فرعون کے محل میں دایہ کی حیثیت سے آتی ہیں اور اس طرح سے موسی کے ساتھ برتاؤ کرتی ہیں کہ کسی کو شک بھی نہیں ہوتا کہ یہ موسی کی ماں ہیں اور اس طرح سے موسی کی رضاعت کرتی ہیں کہ اللہ تعالی ان کے عمل کو اپنی طرف نسبت دیتا ہے لتصنع علی عینی۔ قرآنی آیتوں کے مطابق جناب موسی کی والدہ نے زمانہ حمل، دریائے نیل میں ڈالنے سے پہلے مخفیانہ

۱۔ باب ۱، آیت ۱۶

۲۔ ایضاً، باب دوم، آیات ۱-۱۰، باب ششم، آیات ۱۶-۲۰

طور پر رضاعت، ٹوکری بنانے اور دریائے نیل میں ڈالنے اور فرعون کے گھر میں ان کی پرورش کے سلسلہ میں نہایت رازداری اور درایت سے کام لیا تاکہ مستکبرین پر مستضعفین کے غلبہ کا الٰہی وعدہ پورا ہوسکے۔

خواہر موسیٰ

جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا گیا جناب موسیٰ کی والدہ سے متعلق آیتوں میں ہی، جناب موسیٰ کی بہن کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ مندرجہ ذیل آیتوں میں ان کا تذکرہ موجود ہے:

> إِذْ تَمْشِي أُخْتُكَ فَتَقُولُ هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ مَن يَكْفُلُهُ فَرَجَعْنَاكَ إِلَىٰ أُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ۔ ترجمہ: اس وقت کو یاد کرو جب تمہاری بہن جارہی تھیں کہ فرعون سے کہیں کہ کیا میں کسی ایسے کا پتہ بتاؤں جو اس کی کفالت کرسکے اور اس طرح ہم نے تم کو تمہاری ماں کی طرف پلٹا دیا تاکہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوجائیں اور وہ رنجیدہ نہ ہوں۔[1]

❁

> وَقَالَتْ لِأُخْتِهِ قُصِّيهِ ۖ فَبَصُرَتْ بِهِ عَن جُنُبٍ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ۝ وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِن قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ أَهْلِ بَيْتٍ يَكْفُلُونَهُ لَكُمْ وَهُمْ لَهُ نَاصِحُونَ۔
> ترجمہ: اور انہوں نے اپنی بہن سے کہا کہ تم بھی ان کا پیچھا کرو تو انہوں نے دور سے موسیٰ کو دیکھا جب کہ ان لوگوں کو اس کا احساس بھی نہیں تھا۔ اور ہم نے موسیٰ پر دودھ پلانے والیوں کا دودھ پہلے ہی سے حرام کردیا تو موسیٰ کی بہن نے کہا کہ کیا میں تمہیں ایسے گھر والوں کا پتہ بتاؤں جو اس کی کفالت کرسکیں اور وہ اس کے خیر خواہ بھی ہوں۔[2]

جناب موسیٰ کی والدہ نے ان کو دریائے نیل کے حوالہ کردیا اور ان کی بہن سے کہا کہ دور سے اپنے بھائی پر نظر رکھیں تاکہ معلوم ہوسکے کہ ان کا انجام کیا ہوا۔ جناب موسیٰ کی بہن نے دیکھا کہ موسیٰ کو فرعون کے محل میں لے جایا گیا ہے اور دایہ کی تلاش ہے تو انہوں نے دایہ کے طور پر اپنی ماں کو محل میں بھیجا تاکہ وہ اپنے بیٹے کی پرورش کریں اور کسی کو پتہ بھی نہ چلے۔ کی تقر عینھا و لاتحزن۔

۱۔ سورہ طہ، آیت ۴۰
۲۔ سورہ قصص، آیت ۱۱ و ۱۲

فرعون کی زوجہ

سورہ قصص کی آیت نمبر ۹ اور سورہ تحریم کی آیت نمبر ۱۱ میں فرعون کی زوجہ کا تذکرہ ملتا ہے:

وَقَالَتِ امْرَأَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّي وَلَكَ ۖ لَا تَقْتُلُوهُ عَسَىٰ أَن يَنفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ۔ ترجمہ: اور فرعون کی زوجہ نے کہا کہ یہ تو ہماری اور تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے لہٰذا اسے قتل نہ کرو کہ شاید یہ ہمیں فائدہ پہنچائے اور ہم اسے اپنا فرزند بنالیں اور وہ لوگ کچھ نہیں سمجھ رہے تھے۔[1]

❁

وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِّلَّذِينَ آمَنُوا امْرَأَتَ فِرْعَوْنَ إِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِي عِندَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِي مِن فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهِ وَنَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ۔ ترجمہ: اور خدا نے ایمان والوں کے لئے فرعون کی زوجہ کی مثال بیان کی ہے کہ اس نے دعا کی کہ پروردگار میرے لئے جنّت میں ایک گھر بنادے اور مجھے فرعون اور اس کے کاروبار سے نجات دلادے اور اس پوری ظالم قوم سے نجات عطا کردے۔[2]

ان آیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کہیں بھی زوجہ فرعون کا نام نہیں لیا گیا ہے بلکہ ہر جگہ امراۃ فرعون کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ مفسرین نے ابن عباس اور سعد بن جنادہ اور ابو موسی کے ذریعہ پیغمبر اسلامؐ سے منقول روایت سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے فرعون کی زوجہ کا نام آسیہ بتایا ہے۔[3] صاحب منہج الصادقین کے غیر مستند قول کے مطابق آسیہ قوم بنی اسرائیل سے اور جناب موسی کی پھوپھی تھیں۔[4]

سورہ قصص کی آیت نمبر ۹ میں موسی کو فرعون کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچانے میں آسیہ کے کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ انہوں نے موسی کو اپنی اور فرعون کی آنکھوں کی ٹھنڈک بتایا اور فرعون کو ان کو گود لینے کا مشورہ دیا تاکہ موسی قتل سے بچ سکیں۔ آسیہ کے ذریعہ موسی کو قتل ہونے سے بچانا حقیقت

۱۔ سورہ قصص، آیت ۹

۲۔ سورہ تحریم، آیت ۱۱

۳۔ مجمع البیان، ج ۱۸، ص ۱۶۴؛ ج ۲۵، ص ۱۵۵؛ منہج الصادقین فی الزام المخالفین، ج ۷، ص ۴۷؛ ج ۹، ص ۳۴۶؛ المیزان، ج ۳۱، ص ۲۵؛ مکارم شیرازی، ناصر، تفسیر نمونہ، ج ۲۴، ص ۳۰۲

۴۔ منہج الصادقین فی الزام المخالفین، ج ۷، ص ۴۷؛ ج ۹، ص ۳۴۶

میں اس مشن کی تکمیل تھی جس کے تحت مادر موسیٰ اور ان کی بہن نے ان کو بچانے کا ذمہ لیا تھا۔ جناب آسیہ فرعون کے محل میں ناز و نعمت میں رہتے ہوئے بھی اللہ تعالی سے دعا کرتی ہیں کہ انہیں اس نظام سے رہائی ملے اور جنت میں ان کو ایک مکان عطا ہو۔اسی روح کی بلندی اور اللہ تعالی پر یقین کی وجہ سے آپ فرعون کی ہمنشینی اور دنیاوی آلودگیوں سے محفوظ رہتی ہیں۔ روایتوں کے مطابق آپ کا شمار ان چار بہشتی خواتین میں ہوتا ہے جو ساری عورتوں سے افضل ہیں۔[1]

شعیب نبی کی بیٹیاں

سورہ قصص کی آیت نمبر ۲۳ سے ۲۹ میں جناب شعیب کی بیٹیوں کا تذکرہ ملتا ہے:

وَلَمَّا وَرَدَ مَاءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ أُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُونَ وَوَجَدَ مِن دُونِهِمُ امْرَأَتَيْنِ تَذُودَانِ ۖ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ۖ قَالَتَا لَا نَسْقِي حَتَّىٰ يُصْدِرَ الرِّعَاءُ ۖ وَأَبُونَا شَيْخٌ كَبِيرٌ ۔ فَسَقَىٰ لَهُمَا ثُمَّ تَوَلَّىٰ إِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ إِنِّي لِمَا أَنزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ۔ فَجَاءَتْهُ إِحْدَاهُمَا تَمْشِي عَلَى اسْتِحْيَاءٍ قَالَتْ إِنَّ أَبِي يَدْعُوكَ لِيَجْزِيَكَ أَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَا ۚ فَلَمَّا جَاءَهُ وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ قَالَ لَا تَخَفْ ۖ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ۔ قَالَتْ إِحْدَاهُمَا يَا أَبَتِ اسْتَأْجِرْهُ ۖ إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ۔ قَالَ إِنِّي أُرِيدُ أَنْ أُنكِحَكَ إِحْدَى ابْنَتَيَّ هَاتَيْنِ عَلَىٰ أَن تَأْجُرَنِي ثَمَانِيَ حِجَجٍ ۖ فَإِنْ أَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِندِكَ ۖ وَمَا أُرِيدُ أَنْ أَشُقَّ عَلَيْكَ ۚ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّالِحِينَ ﴿۲۷﴾ قَالَ ذَٰلِكَ بَيْنِي وَبَيْنَكَ ۖ أَيَّمَا الْأَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ ۖ وَاللَّهُ عَلَىٰ مَا نَقُولُ وَكِيلٌ ۔ فَلَمَّا قَضَىٰ مُوسَى الْأَجَلَ وَسَارَ بِأَهْلِهِ آنَسَ مِن جَانِبِ الطُّورِ نَارًا قَالَ لِأَهْلِهِ امْكُثُوا إِنِّي آنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّي آتِيكُم مِّنْهَا بِخَبَرٍ أَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُونَ۔ ترجمہ: اور جب مدین کے چشمہ پر وارد ہوئے تو لوگوں کی ایک جماعت کو دیکھا جو جانوروں کو پانی پلارہی تھی اور ان سے الگ دو عورتیں تھیں جو جانوروں کو روکے کھڑی تھیں۔ موسٰی نے پوچھا کہ تم لوگوں کا کیا مسئلہ ہے ان دونوں نے کہا کہ ہم اس وقت تک پانی نہیں پلاتے ہیں جب تک ساری قوم ہٹ نہ جائے اور ہمارے بابا ایک ضعیف العمر آدمی ہیں۔

۱۔المیزان، ج ۳۸، ص ۲۳۴؛ تفسیر نمونہ، ج ۲۴، ص ۳۰

موسٰی نے دونوں کے جانوروں کو پانی پلادیا اور پھر ایک سایہ میں آکر پناہ لے لی۔ عرض کی پروردگار یقینا میں اس خیر کا محتاج ہوں جو تو میری طرف بھیج دے۔ اتنے میں دونوں میں سے ایک لڑکی کمال شرم و حیاکے ساتھ چلتی ہوئی آئی اور کہاکہ میرے بابا آپ کو بلارہے ہیں کہ آپ کے پانی پلانے کی اجرت دے دیں پھر جو موسٰی ان کے پاس آئے اور اپنا قصّہ بیان کیا تو انہوں نے کہاکہ ڈرو نہیں اب تم ظالم قوم سے نجات پاگئے۔ ان دونوں میں سے ایک لڑکی نے کہاکہ باباآپ انہیں نوکر رکھ لیجئے کہ آپ جسے بھی نوکر رکھنا چاہیں ان میں سب سے بہتر وہ ہوگا جو صاحبِ قوت بھی ہو اور امانتدار بھی ہو۔ انہوں نے کہاکہ میں ان دونوں میں سے ایک بیٹی کا عقد آپ سے کرنا چاہتا ہوں بشرطیکہ آپ آٹھ سال تک میری خدمت کریں پھر اگر دس سال پورے کردیں تو یہ آپ کی طرف سے ہوگا اور میں آپ کو کوئی زحمت نہیں دینا چاہتا ہوں۔ انشاء اللہ آپ مجھے نیک بندوں میں سے پائیں گے۔ موسٰی نے کہاکہ یہ میرے اور آپ کے درمیان کا معاہدہ ہے میں جو مدّت بھی پوری کردوں میرے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی اور میں جو کچھ بھی کہہ رہاہوں اللہ اس کا گواہ ہے۔ پھر جب موسٰی مدّت کو پورا کرچکے اور اپنے اہل کو لے کر چلے تو طور کی طرف سے ایک آگ نظر آئی۔ انہوں نے اپنے اہل سے کہاکہ تم لوگ ٹھہرو میں نے ایک آگ دیکھی ہے شاید اس میں سے کوئی خبر لے آؤں یا کوئی چنگاری ہی لے آؤں کہ تم لوگ اس سے تاپنے کاکام لے سکو۔[1]

قرآن کریم میں جناب شعیب کی بیٹیوں کا نام نہیں ملتا اور ان کے والد کا نام بھی نہیں بتایا گیا ہے لیکن روائی منابع میں جو کہ تفسیر قرآن اور کتب قصص کا ماخذ ہیں، جناب شعیب کی بڑی بیٹی کا نام صفورا، صفیرا، صفرا، صفورہ اور چھوٹی بیٹی کا نام صفیرا، لیااور صفرا بتایا گیا ہے۔[2] بیشتر مفسرین نے ان کے والد کا نام شعیب بتایا ہے لیکن سعید بن جبیر نے وہب بن منبہ سے نقل کیا ہے وہ شعیب کی بھتیجی تھیں اور ان کے والد کا نام یثرون یا یثروب تھا کیونکہ اس زمانہ میں جناب شعیب کا انتقال ہوچکا تھا اور مقام ابراہیم اور زمزم کے درمیان سپرد

۱۔ سورہ قصص، آیت نمبر ۲۳ سے ۲۹

۲۔ مجمع البیان، ج ۱۸، ص ۱۸۶؛ منہج الصادقین فی الزام المخالفین، ج ۷، ص ۸۷ و ۸۸؛ تفسیر نمونہ، ج ۱۶، ص ۶۹؛ قصص الانبیاء، ص ۱۶۸

خاک ہو چکے تھے۔ وہب بن منبہ نے توریت کو سند کے طور پیش کیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ اپنی بیٹیوں کو حضرت موسی کے عقد میں دینے والے کا نام یثرون تھا۔ بعض لوگوں نے اس اختلاف کو سلجھانے کے لئے یہ دلیل دی ہے کہ لفظ شعیب عربی ہے اور لفظ یثرون سریانی ہے اور دونوں کا معنی ایک ہی ہے۔[1]

مکتب امامیہ اور اہل سنت کے بیشتر روائی مآخذ نے اس بات کو قبول نہیں کیا ہے ۔ علاوہ ازیں یہ درست ہے کہ قرآن میں شعیب کو ان لڑکیوں کے باپ کے عنوان سے پیش نہیں کیا گیا ہے لیکن دوسری آیتوں میں جناب موسی کے آب مدین پہنچنے کا ذکر ہے اور دوسری آیتوں میں شعیب کو مدین کا رہنے والا بتایا گیا ہے[2] جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان لڑکیوں کے باپ کا نام شعیب ہی رہا ہوگا۔ یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ جس روایت میں ان لڑکیوں کے باپ کا نام یثرون بتایا گیا ہے، اسی روایت کے مطابق شعیب مسجد الحرام اور مکہ میں مدفون ہیں جب کہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ شعیب جس علاقہ میں رہتے تھے اسے آج فلسطین کہتے ہیں۔

مذکورہ آیتوں کے مطالعہ سے شعیب کی بیٹیوں کے سلسلہ میں ہمیں چند باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ کسب معاش کے سلسلہ میں ان کی تگ و دو کیونکہ ان کا کوئی بھائی نہیں ہے اور ان کے والد بوڑھے ہو چکے ہیں (ابونا شیخ کبیر)۔ سماجی تعلقات میں حدود کی رعایت بھی ان کا خاصہ ہے۔ جب سارے چرواہے اپنے بھیڑوں کو پانی پلا چکتے تب وہ اپنے جانورں کو پانی پلاتی تھیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ جب جناب موسی نے ان کے جانورں کو پانی پلادیا اور ان کو یہ یقین ہو گیا کہ وہ امین ہیں، تب بھی انہوں نے بہت ہی حجب و حیا کے ساتھ موسی سے کلام کیا۔ اس کے علاوہ ماحول اور افراد کی شناخت میں ان کی قدرت تشخیص بھی قابل غور ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے اپنے والد سے کہا کہ موسی کو ان کی ایمانداری اور طاقت کی وجہ سے اپنے یہاں مزدوری پر رکھ لیں ۔ جناب شعیب نے اسی مشورہ کی بنیاد پر اپنی ایک بیٹی کی شادی اس شرط پر جناب موسی سے کردی کہ وہ آٹھ یا دس سال ان کے پاس کام کریں۔

۱۔ مجمع البیان، ج ۱۸، ص ۱۸۲؛ منہج الصادقین فی الزام المخالفین، ج ۷، ص ۸۷

۲۔ سورہ اعراف، آیت ۸۵؛ سورہ ہود، آیت ۸۴؛ سورہ عنکبوت، آیت ۳۶

عمران کی زوجہ (جناب مریم کی ماں) :

سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۳۵ اور ۳۶ میں عمران کی زوجہ کا تذکرہ ملتا ہے :

إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي ۖ إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۔ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنثَىٰ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنثَىٰ وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ۔ترجمہ : اس وقت کو یاد کرو جب عمران کی زوجہ نے کہا کہ پروردگار میں نے اپنے شکم کے بچے کو تیرے گھر کی خدمت کے لئے نذر کر دیا ہے اب تو قبول فرمالے کہ تو ہر ایک کی سننے والا اور نیتوں کا جاننے والا ہے۔ اس کے بعد جب ولادت ہوئی تو انہوں نے کہا پروردگار یہ تو لڑکی ہے حالانکہ اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ کیا ہے اور وہ جانتا ہے کہ لڑکا اس لڑکی جیسا نہیں ہو سکتا اور میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے اور میں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان رجیم سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔

امام صادقؑ سے منقول روایت کے مطابق عمران کی زوجہ کا نام حَنّہ تھا۔[1] تفاسیر کے مطابق حنہ سن رسیدہ ہو چکی تھیں لیکن نعمت اولاد سے محروم تھیں ۔آپ نے درگاہ خداوندی میں دعا کی اور یہ نذر مانی کہ اگر وہ صاحب اولاد ہوتی ہیں تو اپنے بچہ کو اللہ کے لئے وقف کر دیں گی۔ جب جناب مریم کی ولادت ہوئی تو آپ کی والدہ نے درگاہ خداوندی میں عرض کیا پالنے والے میں نے بیٹی کو جنم دیا ہے اور بیٹا بیٹی کی طرح نہیں ہے لیکن آپ عطائے خداوندی پر راضی و شاکر رہیں۔

جناب مریم

جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا صالح خواتین کے سلسلہ میں نازل ہونے والی زیادہ تر آیتیں جناب مریم سے متعلق ہیں۔ سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۳۵ اور ۳۶ میں بھی جناب مریم کا تذکرہ ہوا ہے جسے اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۳۷، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵ اور ۴۷ بھی جناب مریم سے متعلق ہے۔ سورہ نساء کی آیت نمبر ۱۵۹ اور ۱۷۱، سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۱۷، ۷۵، ۱۱۰ اور ۱۱۶، سورہ انبیا کی

۱۔ المیزان، ج ۵، ص ۳۲۷؛ مجمع البیان، ج ۴، ص ۴۵؛ تفسیر نمونہ، ج ۳، ص ۳۹۳۔۳۹۴

آیت نمبر ۹۱، سورہ مؤمنون کی آیت نمبر ۵۰ اور سورہ تحریم کی آیت نمبر ۱۲ میں اور سورہ مریم کی ۱۶ سے ۳۴ آیتوں تک جناب مریم کا تذکرہ ہے۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَأَنبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِندَهَا رِزْقًا قَالَ يَا مَرْيَمُ أَنَّىٰ لَكِ هَٰذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِندِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُ مَن يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ۔ ترجمہ: تو خدا نے اسے بہترین انداز سے قبول کرلیا اور اس کی بہترین نشو ونما کا انتظام فرمادیا اور زکریا نے اس کی کفالت کی کہ جب زکریا محراب عبادت میں داخل ہوتے تو مریم کے پاس رزق دیکھتے اور پوچھتے کہ یہ کہاں سے آیا اور مریم جواب دیتیں کہ یہ سب خدا کی طرف ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے رزق بے حساب عطا کردیتا ہے۔[1]

وَإِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَا مَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلَىٰ نِسَاءِ الْعَالَمِينَ۔ يَا مَرْيَمُ اقْنُتِي لِرَبِّكِ وَاسْجُدِي وَارْكَعِي مَعَ الرَّاكِعِينَ ﴿۴۳﴾ ذَٰلِكَ مِنْ أَنبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ ﴿۴۴﴾ إِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَا مَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ۔ ترجمہ: اور اس وقت کو یاد کرو جب ملائکہ نے مریم کو آواز دی کہ خدا نے تمہیں چن لیا ہے اور پاکیزہ بنادیا ہے اور عالمین کی عورتوں میں منتخب قرار دے دیا ہے۔ اے مریم تم اپنے پروردگار کی اطاعت کرو، سجدہ کرو، اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔ پیغمبر یہ غیب کی خبریں ہیں جن کی وحی ہم آپ کی طرف کررہے ہیں اور آپ تو ان کے پاس نہیں تھے جب وہ قرعہ ڈال رہے تھے کہ مریم کی کفالت کون کرے گا اور آپ ان کے پاس نہیں تھے جب وہ اس موضوع پر جھگڑا کررہے تھے۔ اور اس وقت کو یاد کرو جب ملائکہ نے کہا کہ اے مریم خدا تم کو اپنے کلمہ مسیح عیسیٰ ابن مریم کی بشارت دے رہا ہے جو دنیا اور آخرت میں صاحبِ وجاہت اور مقربین بارگاہ الٰہی میں سے ہے۔[2]

❁

۱۔ سورہ آل عمران، آیت نمبر ۳۷

۲۔ سورہ آل عمران، آیت نمبر ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵

قَالَتْ رَبِّ أَنَّىٰ يَكُونُ لِي وَلَدٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ قَالَ كَذَٰلِكِ اللَّهُ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُن فَيَكُونُ۔ ترجمہ: مریم نے کہا کہ میرے یہاں فرزند کس طرح ہوگا جب کہ مجھ کو کسی بشر نے چھوا بھی نہیں ہے۔ ارشاد ہوا کہ اسی طرح خدا جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے جب وہ کسی کام کا فیصلہ کرلیتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا اور وہ چیز ہو جاتی ہے۔[۱]

جناب مریم کے سلسلہ میں نازل ہونے والی ۳۶ آیتوں کے مطالعہ سے مندرجہ ذیل نکات سامنے آتے ہیں:

۱. **مقبول خداوند**: جناب مریم کی ماں ان کی پیدائش پر اظہار تاسف کرتی ہیں کیونکہ انہیں بیٹے کی خواہش تھی تاکہ وہ معبد کے مردانے کاموں میں حصہ لے سکے۔ اللہ تعالی جناب مریم کی والدہ کی خواہش کو قبول کرتا ہے اور جناب مریم کو بطور عابدہ قبول کرتا ہے: فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ۔[۲]

۲. **اللہ کی پروردہ**: جناب مریم کی والدہ نے اللہ تعالی سے درخواست کی کہ مریم کو شیطان کے شر سے محفوظ رکھے: وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ۔[۳] اللہ تعالی ان کی درخواست کو قبول کرتا ہے اور خود کو مریم کی پرورش کرنے والا بتاتا ہے: وَأَنبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا۔[۴]

۳. **اللہ تعالی کی خاص نعمتوں کی مالک**: سورہ مائدہ کی ۱۱۰ ویں آیت میں جناب مریم کو اللہ تعالی کی خاص نعمتوں کا مالک بتایا گیا ہے: اُذکُر نِعمَتِیَ التی عَلَیکَ و عَلی والِدَتِک۔ اور خاص کر بچپن میں ان کے حق میں اپنی رزق کا تذکرہ ہوا ہے: وَجَدَ عِندَهَا رِزْقًا۔[۵]

۴. **منتخب**: جناب مریم کو نہ صرف درگاہ خداوندی میں مقبولیت حاصل تھی بلکہ آپ منتخب خداوند تھیں: يَا مَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاكِ۔[۶]

۱۔ سورہ آل عمران، آیت نمبر ۴۷
۲۔ سورہ آل عمران، آیت ۳۷
۳۔ سورہ آل عمران، آیت ۳۶
۴۔ سورہ آل عمران، آیت ۳۷
۵۔ سورہ آل عمران: آیت ۳۷
۶۔ سورہ آل عمران، آیت ۴۲

۵. **منتخب زنان عالم**: جناب مریم نہ صرف مقبول درگاہ خداوندی تھیں بلکہ اللہ تعالی نے آپ کو دنیا کی عورتوں میں سے منتخب کیا تھا: وَاصْطَفَاكِ عَلَىٰ نِسَاءِ الْعَالَمِينَ۔[۱] شیعہ تفسیروں کے مطابق جناب مریم کا منتخب ہونا صرف اس دور کی خواتین تک محدود ہے۔

۶. **پاک دامن اور طاہر**: حقیقت میں یہ پاکی الٰہی پرورش کا نتیجہ ہے، جس کی وجہ سے جناب مریم ہر طرح کی ناپاکی سے دور ہیں: لَم اَکُ بَغِيّاً[۲]، وَلَقَد جِئتِ شَيئاً فَرياً[۳]، مَا كَانَت اُمُّكِ بَغِيّاً۔ اس طہارت کے بدلے میں اللہ تعالی جناب مریم کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا ہے۔

۷. **سچی اور راستگو**: وَاُمُّهُ صِدِّيقَه۔[۴]

۸. **کلام الٰہی کی تصدیق کرنے والی**: وَصَدَّقَت بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَكُتُبِه[۵]

۹. **خاضع اور مطیع امر الٰہی**: وَكَانَت مِنَ القَانِتِين[۶]

۱۰. **اللہ کی نشانی**: جَعَلنَاهَا وَابنَهَا آيَةً لِلعَالَمِين[۷]، وَجَعَلنَا ابنَ مَريَمَ وَاُمَّهُ آيَة[۸]

جناب زکریا کی زوجہ (جناب یحییٰ کی والدہ)

قرآن کی چار آیتوں میں جناب زکریا کی زوجہ یعنی جناب یحییٰ کی والدہ کا تذکرہ ملتا ہے:

قَالَ رَبِّ أَنَّىٰ يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَأَتِي عَاقِرٌ ۖ قَالَ كَذَٰلِكَ اللَّهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ ۔ترجمہ: انہوں نے عرض کی کہ میرے یہاں کس طرح اولاد ہوگی جب کہ مجھ پر بڑھاپا

۱۔ سورہ آل عمران، آیت ۴۲
۲۔ سورہ مریم، آیت ۲۰
۳۔ سورہ مریم، آیت ۲۷
۴۔ سورہ مائدہ، آیت ۷۵
۵۔ سورہ مریم، آیت ۱۲
۶۔ سورہ تحریم، آیت ۱۲
۷۔ سورہ انبیاء، آیت ۹۱
۸۔ سورہ مؤمنون، آیت ۵۰

آگیا ہے اور میری عورت بھی بانجھ ہے تو ارشاد ہوا کہ خدا اسی طرح جو چاہتا ہے کرتا ہے۔[۱]

وَإِنِّي خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِن وَرَائِي وَكَانَتِ امْرَأَتِي عَاقِرًا فَهَبْ لِي مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا ۔ترجمہ: اور مجھے اپنے بعد اپنے خاندان والوں سے خطرہ ہے اور میری بیوی بانجھ ہے تو اب مجھے ایک ایسا ولی اور وارث عطا فرمادے۔[۲]

❁

قَالَ رَبِّ أَنَّىٰ يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَكَانَتِ امْرَأَتِي عَاقِرًا وَقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ۔ترجمہ: زکریا نے عرض کی پروردگار میرے فرزند کس طرح ہوگا جب کہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بھی بڑھاپے کی آخری حد کو پہنچ گیا ہوں۔[۳]

فَاسْتَجَبْنَا لَهُ وَوَهَبْنَا لَهُ يَحْيَىٰ وَأَصْلَحْنَا لَهُ زَوْجَهُ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَيَدْعُونَنَا رَغَبًا وَرَهَبًا ۖ وَكَانُوا لَنَا خَاشِعِينَ۔ترجمہ: تو ہم نے ان کی دعا کو بھی قبول کرلیا اور انہیں یحییٰ جیسا فرزند عطا کردیا اور ان کی زوجہ کو صالحہ بنادیا کہ یہ تمام وہ تھے جو نیکیوں کی طرف سبقت کرنے والے تھے اور رغبت اور خوف کے ہر عالم میں ہم ہی کو پکارنے والے تھے اور ہماری بارگاہ میں گڑگڑا کر التجا کرنے والے بندے تھے۔[۴]

ان آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالی نے جناب زکریا کی دعا کو قبول کرلیا جب کہ ان کی زوجہ بانجھ تھیں اور انہیں یحییٰ کی شکل میں ایک وارث عطا کیا اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ زکریا کی زوجہ بھی صالح تھیں اور کار خیر میں پیش پیش رہتی تھیں اور اللہ کی بارگاہ میں خاضع و خاشع تھیں اور امید و بیم میں ذات الہ کو پکارتی تھیں۔

نتیجہ

زنان صالح سے متعلق ۶۳ آیتوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان عورتوں کے خاندانی ماحول ان کی تربیت اور شخصیت میں اہم کردار ادا کیا ہے اور نو صالح خواتین میں سے جن کا تذکرہ قرآن میں موجود

۱۔ سورہ آل عمران، آیت ۴۰
۲۔ سورہ مریم، آیت ۵
۳۔ سورہ مریم، آیت ۸
۴۔ سورہ انبیا، آیت ۹۰

ہے، صرف زوجہ فرعون غیر مناسب ماحول میں زندگی بسر کر رہی تھیں۔ فرعون کے محل میں آنے سے قبل جناب آسیہ کے حالات کیا تھے، اس کے بارے میں ہمیں کچھ پتہ نہیں ہے لیکن ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ زوجہ فرعون پاک ضمیر خاتون تھیں۔

مذکورہ آیتوں کے مطالعہ سے صالح خواتین کی مندرجہ ذیل خصوصیات سامنے آتی ہیں: اللہ تعالی کی ذات پر یقین اور اس کی بارگاہ میں خضوع و خشوع، توکل، سختیوں کا مقابلہ، عفاف و پاکدامنی، نامحرموں سے دوری، اہل تدبیر، رحمت الٰہی کی امیدوار، خوف و رجائے الٰہی سے متصف، حسن شہرت، اجتماعی مسائل میں سرگرم، کار خیر میں پیش قدم، امین و خیر خواہ مشاور، الٰہی نعمتوں پر شاکر، راست گوئی اور درست کرداری اور کلام الٰہی کی تصدیق کرنے والی۔

منابع و مآخذ:

قرآن کریم، ترجمہ بہاء الدین خرمشاہی، نیلوفر و جامی، تہران، ۱۳۷۵

- آمدی، عبد الواحد، غرر الحکم و درر الکلم، ترجمہ محمد علی انصاری، دار الکتاب، قم
- اسعدی، مرتضٰی، جہان اسلام، مرکز نشر دانشگاہی، تہران، ۱۳۶۶
- بلاغی، صدر الدین، قصص قرآن (ج ۱۸)، امیر کبیر، تہران، ۱۳۸۱
- جر، خلیل، فرہنگ لاروس (ج ۱ و ۲)، ترجمہ سید حمید طبیبیان، امیرکبیر، تہران، ۱۳۶۳
- جوادی آملی، عبد اللہ، زن در آئینہ جلال و جمال، اسراء، قم، ۱۳۸۱
- حکیمی، محمد رضا، محمد حکیمی و علی حکیمی، الحیاۃ (ج ۳ و ۴)، ترجمہ احمد آرام، دلیل ما، قم، ۱۳۸۴
- خلیلیان، سید خلیل، سیمای زن در قرآن (ج ۲)، شرکت سہامی انتشار، تہران، ۱۳۵۲
- رازی، ابو الفتوح، روض الجنان و روح الجنان فی تفسیر القرآن (ج ۴ و ۱۰)، تصحیح دکتر محمد جعفر یا حقی و دکتر محمد مہدی ناصح، بنیاد پژوہش ہای اسلامی، مشہد، ۱۳۷۲
- رسولی محلاتی، سید ہاشم، قصص قرآن یا تاریخ انبیاء (ج ۳)، علمیہ اسلامیہ، تہران، ۱۳۶۱
- سیاح، احمد، فرہنگ جامع عربی۔ فارسی (جلد ۴، ۳، ۲، ۱)، کتابفروشی اسلامی
- سیوطی، جلال الدین، الاتقان (ج ۱)، ترجمہ محمد جعفر اسلامی، بنیاد علوم اسلامی، ۱۳۶۲
- شعرانی، میرزا ابو الحسن، نثر طوبی (ج ۲)، کتابفروشی اسلامیہ، تہران، ۱۳۹۸ق
- طالقانی، محمود، پرتوی از قرآن (قسمت پنجم)، شرکت سہامی انتشار تہران؛ ۱۳۵۸

- طباطبائی، محمد حسین، المیزان (ج ۵ ، ۶، ۲۰، ۲۷، ۲۹، ۳۱، ۳۸) ترجمہ عبد الکریم نیری بروجردی، مؤسسہ مطبوعات دار العلم، قم، ۱۳۴۶
- طبرسی، ابو علی الفضل بن الحسن، مجمع البیان (۴، ۵، ۱۲، ۱۵، ۱۶، ۱۸، ۲۳، ۲۵،)، ترجمہ سید ابراہیم میر باقری، فراہانی، تہران، ۱۳۵۰
- طریحی، شیخ فخر الدین، مجمع البحرین (ج ۲)، کتاب فروشی مرتضوی، تہران، ۱۳۶۲
- عبد الباقی، محمد فواد، المعجم لمفہرس لالفاظ القرآن الکریم، داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۳۶۴ق
- قرائتی، محسن، تفسیر نور (ج ۳، ۵، ۷، ۹، مؤسسہ در راہ حق، قم، ۱۳۷۵
- قرشی، سید علی اکبر، قاموس قرآن (ج ۱، ۲، ۳، ۵، ۷ و ۸)، دار الکتب الاسلامیہ، تہران، ۱۳۶۱
- کاشانی، موسی فتح اللہ، منہج الصادق فی الزام المخالفین (جلد ۲ تا ۷ وجلد ۹)، با مقدمہ و پاورقی سید ابو الحسن مرتضوی و تصحیح علی اکبر غفاری، کتابفروشی علمیہ اسلامیہ، تہران
- لاپیدوس، ایرام، تاریخ جوامع اسلامی قرون نوزدہم وبیستم (ج ۲)، ترجمہ محسن مدیر شانہ چی، بنیاد پژوہش ھای اسلامی آستان قدس رضوی، مشہد، ۱۳۷۶
- مکارم شیرازی، ناصر، تفسیر نمونہ (۲، ۹، ۱۳، ۱۴، ۱۶، ۲۲، ۲۴) دار الکتب الاسلامیہ، تہران
- نجار، عبد الوہاب، قصص الانبیاء، قاہرہ مؤسسۃ الحلیلی وشرکاء، ۱۹۶۶م